

جاسوسی دنیا

64- شیطان کی محبوبہ

65- انوکھے رقاص

66- پراسرار موجد



پیشتر

ایک طویل عرصے کے بعد آپ ”شیطان کی محبوبہ“ کے روپ میں ایسی کہانی دیکھیں گے جس کا مزہ چٹارہ، لطف و ذائقہ انوکھا ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر بے اختیار ابن صفی کی ایسی کہانیاں یاد آ جاتی ہیں جن میں مونچھ مونڈنے والی، دوہرا قتل وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ شیطان کی محبوبہ اس لحاظ سے ابن صفی کے ان چند کارناموں سے ایک ہے جن میں ابن صفی کا مخصوص انداز ظرافت اور شگفتگی مکمل طور پر موجود ہے یا ”ابن صفیت“ کی جلوہ گری ہے۔

خون کی لکیر

اس کہانی کے انوکھے پن اور خوبصورتی کا اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حمید اس میں شگوفے چھوڑنے والا آلہ تفریح نہیں ہے بلکہ قریب قریب تین چوتھائی کیس اسکا رہن منت ہے اور فریدی ایک ہدایت کار کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حمید میدان عمل میں آئے گا تو قہقہوں کی بارش بھی ہوگی اور مسکراہٹوں کی پھلجھڑیاں بھی چھوٹیں گی۔

ادھر گذشتہ آٹھ مہینے سے مسلسل کہانیوں اور بھیانک مجرموں نے ایک ایسی فضا بنا دی تھی جو بہت سرد تھی ”شیطان کی محبوبہ“ برف کی طرح جمے ہوئے اس ماحول میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ اس کی مسز شوخ کا کردار اپنی رنگینی اور دلکشی کے علاوہ ایسے نفسیاتی جھکے دیتا ہے کہ ہر قدم پر آدمی چونک اٹھتا ہے اور انتہا میں پہنچ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مخصوص قسم کے کردار کی تخلیق میں جو ملکہ ابن صفی کو حاصل ہے اس کی گرد کو پانا بھی مشکل ہے۔

اس کہانی کو حمید کی کہانی یا حمید کا کارنامہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آخری صفحات میں اس طرح ابن صفی نے حمید کو اس بار پیش کیا ہے کہ ہم بے اختیار اس سے محبت کرنے؛ مجبور ہو جاتے ہیں۔ حمید کے کردار کا یہ رخ اُسے ہم سے اتنا قریب کر دیتا ہے، اُسے اتنا مضبوط، دلکش اور خوبصورت کردار کا مالک بنا دیتا ہے کہ واقعتاً یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کسی ناول کا کردار نہیں بلکہ گوشت و پوست کا جیتا جاگتا آدمی ہے۔ انہیں خصوصیات کی بناء پر شیطان کی محبوبہ ناقابل فراموش کارنامہ بن گئی ہے۔

نیا گرا کے ریکریشن ہال میں بیلے کی تیاریاں تھیں۔ ایک غیر ملکی پارٹی اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے والی تھی۔ اسٹیج سے ابھی پردہ نہیں ہٹا تھا۔ ہال میں قہقہے جگمگا رہے تھے، قہقہے اچھل رہے تھے اور زندگی تمام رعنائیوں سمیت جلوہ فگن تھی۔

زندگی جلوہ فگن تھی اور قاسم کی طبیعت اتنی گن تھی کہ وہ اس وقت قارون کی قبر پر بھی لات مار دیتا۔ وہ اب تک بیروں کو تقریباً پچاس روپے بطور بخشش دے چکا تھا، اور ریکریشن ہال ہی میں بیٹھے بیٹھے اتنا کھا چکا تھا کہ معمولی دل گردنے والے کا پیٹ ہی پھٹ جاتا۔

بات صرف اتنی تھی کہ قریب ہی بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے شاید اپنے ساتھی کو ازراہ مذاق پیڑ کہہ کر اس کی اس صفت کو اپنی پسندیدگی کا باعث قرار دیا تھا۔

حمید نے قاسم کو لاکھ سمجھایا کہ اس نے اپنے ساتھی کو بیوقوف بنایا ہوگا۔ دنیا کی کوئی عورت کسی پیڑ آدمی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن وہ قاسم ہی کیا جس کا معدہ ذہن کی اطاعت قبول کر لے۔ وہ بڑی شہود کے ساتھ اپنے پیڑ پن کا مظاہرہ کرتا رہا اور پھر آخر کار وہ لڑکی اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی۔

”اے..... دیکھ رہی ہے حمید بھائی۔“ وہ جھک کر آہستہ سے حمید کے کان میں بولا۔

”خدا کرے اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں۔“

”تمہاری خود پھوٹ جائیں۔“ قاسم اس انداز میں بگڑ گیا جیسے اس لڑکی سے پرانی

شناسائی ہو۔

”قاسم!“

”تیا ہے.....!“ قاسم غرایا۔

”خدا تمہیں اتنی عقل دے کہ تم..... کہ تم..... کہ تم..... مم.....!“

”تم خود مم.....!“ قاسم پھر جھلا گیا۔

مگر اس ”مم“ کی وجہ دراصل ایک دوسری عورت تھی جس پر اچانک حمید کی نظر پڑی اور وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔ پھر قاسم کی نظر بھی اُدھر ہی اٹھ گئی۔

”ارے باپ رے..... حمید بھائی..... ارے..... یہ تو..... یہ تو.....!“

”قاسم.....!“

”کیا ہے..... پیارے بھائی..... ای..... ای.....!“

”میرے کفن دفن کا انتظام کرو۔“

”ارے..... کیوں پریشان کرتے ہو۔“ قاسم اس طرح بوکھلا یا جیسے سچ سچ حمید کا دم نکلنے والا ہو۔

ویسے وہ عورت اتنی ہی پرکشش تھی کہ حمید نے قدیم شاعری کے عاشقوں کی طرح اپنے لئے گورو کفن کا تذکرہ مناسب سمجھا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ متناسب الاعضا تھی اور یکس اپیل رکھنے والے خدو خال کی مالک تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی شوخی تھی کہ وہ سکوت کے عالم میں بھی بولتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

اُس کے ساتھ ایک پروفیسر ٹائپ بوڑھا مرد تھا جس کے سر پر بمشکل تمام مٹھی بھر سفید بال رہے ہوں گے۔ ڈاڑھی بھی رکھتا تھا مگر انگریزی وضع کی۔ لباس بھی مغربی ہی تھا۔ عورت ہلکے نارنجی رنگ کے نائیلون کی ساری میں تھی۔

”قاسم.....!“ حمید نے کہا۔ ”ان کے قریب ہی دو تین سیٹیں خالی ہیں۔“

”بے شک..... خالی ہیں۔“ قاسم بولا۔

”چلو تو ادھر ہی نکل چلیں۔“ حمید نے کہا۔

”مگر..... یہ ادھر والی مجھے دیکھ رہی ہے۔“ قاسم بڑبڑایا۔

”اچھا تو تم یہیں بیٹھو.....!“

”یہ نہیں ہوساکتا۔“

”اچھا تو تم بھی چلو۔“

”یہ بھی نہیں ہوسکتا۔“

”تب تم جہنم میں جاؤ..... میں جا رہا ہوں۔“

”میں ٹانگ پکڑ کر کھینچ لوں گا۔“ قاسم نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم ہوش میں ہو یا نہیں۔“

”میں بالکل ہوش میں ہوں۔“ قاسم ہنسنے لگا۔ ”اچھا ٹانگ نہیں پڑے گا مگر اُس کے ابا

میاں کو آواز دوں گا کہ بچاؤ لونڈیا کو۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ آج شاید قاسم بھی موڈ میں تھا لیکن اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ وہ سچ سچ بوڑھے کو آواز دے کر یہی جملہ کہہ بھی سکتا تھا۔ قاسم ہی ٹھہرا۔

حمید تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر یک بیک بولا۔

”کیا سنا.....؟“

”وہ کیا کہہ رہی ہے۔“

”قون.....!“

”وہی جس کے لئے تم یہاں سے اٹھنا نہیں چاہتے۔“

”کیا کہہ رہی ہے۔“ قاسم نے اس کی طرف جھک کر پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”کہہ رہی ہے کہ یہ کم بخت موٹا منخوس معلوم ہوتا ہے۔“

”نہیں.....!“

”میں نے خود سنا ہے اپنے کانوں سے تم نے بھی سنا ہوگا۔ مگر تم اعتراف کیوں کرنے لگے۔“

”نہیں! قاسم میں نے نہیں سنا۔“

”اُس نے کہا تھا..... تم نے سنا تھا۔ تم جھوٹے ہو۔“

”میں نے نہیں سنا تھا۔ وہ خود ہوگی۔ سالی منوں۔ صورت تو دیکھو جیسے ٹی بی ہو رہا ہو۔
مرد کی تم مرو گی۔“

حمید نہایت اطمینان سے اٹھا اور قاسم نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اُس عورت کے پاس چار
کریاں خالی تھیں۔ حمید تو اُس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور قاسم اس کے بعد۔

عورت کے لباس سے ایوے کولون کی بھینی بھینی مہک اٹھ رہی تھی۔ قاسم نے نتھنے
پھلائے اور اس طرح دم کھینچا جیسے ایک ہی کوشش میں ساری خوشبو سمیٹ لے جانے کا ارادہ
رکھتا ہو۔

پھر اُس نے چمک کر پوچھا۔ ”یہ بیلے کیا ہوتا ہے حمید بھائی۔“

”بلبل کا بچہ..... خاموش رہو۔“

”آپ بیلے نہیں جانتے۔“ دفعتاً بوڑھے نے جھک کر پوچھا۔

”جی نہیں۔“ قاسم نے دانت نکال دیئے۔

”کھانکلی، سمجھتے ہیں۔“ بوڑھے نے پوچھا۔

”اوہا..... اچھا..... بیلے کی کلی..... گیا..... گیا۔“

عورت بے اختیار مسکرا پڑی۔ لیکن اس نے ان دونوں کی طرف نہیں دیکھا۔

”خیر ابھی دیکھ لیجئے گا کہ بیلے کیا چیز ہے۔“ بوڑھے نے مسکرا کر کہا اور دوسری طرف

متوجہ ہو گیا۔ حمید کو قاسم پر بہت شدت سے غصہ آیا تھا۔ مگر وہ خاموش ہی رہ گیا۔

کچھ دیر بعد پردہ سر کا اور پروگرام شروع ہو گیا۔

”ارے..... یہ تو گوگی ہیں۔“ قاسم بڑبڑایا۔ ”لاحول ولا قوۃ..... میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

کیا یہ گائیں گی نہیں۔“

”قاسم خاموش رہو۔“ حمید اُس کے چیر پر چیر رکھ کر بولا۔

”نہیں خاموش رہوں گا میں بور ہو رہا ہوں۔ اس بیلے ویلے کی ایسی کی تیسری۔ میں سمجھتا

تھا ناچ کے ساتھ گانا بھی ہوگا۔“

”قاسم اس طرح خود بھی بور ہوتا رہا اور حمید کو بھی کرتا رہا۔ خدا خدا کر کے قص ختم ہوا اور

بوڑھا قاسم کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ قاسم نے بھی دانت نکال دیئے۔ حمید نے نکلیوں سے

عورت کی طرف دیکھا وہ اب بھی اسٹیج ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

تماشا ٹی اٹھ اٹھ کر ڈائینگ ہال کی طرف جانے لگے۔ بوڑھا بھی اٹھا۔ وہ عورت بھی اٹھ

گئی مگر حمید بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں مقصد کیا تھا۔

”ارے تو کیا یہیں بیٹھے رہو گے۔“ قاسم جھلا گیا۔

”بکواس مت کرو۔“ حمید بڑا سامنے بنا کر بولا۔ ”تمہیں کس نے روکا ہے۔“

قاسم کچھ کہتے کہتے رک گیا کیونکہ وہ عورت اُن کی طرف واپس آ رہی تھی اور تنہا تھی۔

قاسم ہکھلانے لگا کیونکہ وہ انہیں ہی گھور رہی تھی۔

”شاید میرا پرس یہاں رہ گیا ہے۔“ اُس نے کہا اور جھک کر اُس کرسی کے نیچے دیکھنے لگی

جس پر کچھ دیر قبل خود بیٹھی ہوئی تھی۔

”پھر پتہ نہیں کہاں رہ گیا۔“ وہ سیدھی کھڑی ہو کر تشویش کن لہجے میں بولی۔

”کیا آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ یہاں بیٹھے وقت پرس آپ کے پاس ہی موجود تھا۔“

حمید نے پوچھا۔

”جی ہاں یاد ہے۔“ عورت نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اور آپ لوگ اب بھی

یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”واقعی ہم بڑے احمق ہیں!“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اگر ہم نے آپ کا پرس اڑایا تھا تو

ہمیں آپ سے پہلے ہی کھسک جانا چاہئے تھا۔“

”جی ہاں!“ عورت کا غصہ تیز ہی ہوتا رہا۔ ”آپ پہلے اس طرف بیٹھے ہوئے تھے پھر

ادھر آ گئے۔“

”آپ کا پرس اڑانے کے لئے۔“ حمید نے مسکرا کر سوالیہ انداز میں کہا۔

”جی ہاں! مجھے آپ پر شبہ ہے۔“

”اوہ..... نوٹو..... ڈارلنگ!“ دفعتاً بوڑھے نے کہا، جو عورت کے پیچھے ہی پیچھے آیا تھا۔ لیکن حمید نے اُس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ لفظ ڈارلنگ پر وہ چونکا..... تو وہ اسکی بیوی تھی۔ ”مجھے اُن پر شبہ ہے۔“ عورت نے کہا۔

”یقین تو نہیں ہے۔“ بوڑھا بولا۔ ”ختم کرو۔ یہ بیچارے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“ لفظ بیچارے پر حمید کو بڑا تاؤ آیا لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

عورت بڑبڑاتی ہوئی مڑ گئی۔ بوڑھے نے ان کی طرف دیکھ کر شاید معذرت طلب کی تھی۔ الفاظ وہ نہیں سن سکے۔ پھر بوڑھا بھی چلا گیا۔

”دیکھا سالی کو۔“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔ ”اور تمہارے منہ میں بھی وہی جم گیا تھا۔ تم نے کہا کیوں نہیں کہ میں کیپٹن حمید آف کھدی ڈپارٹمنٹ ہوں۔“

”اے تم مٹی کیوں پلید کر رہے ہو میرے محکمے کی۔“

”میں تم کو پلید کر دوں گا ورنہ چل کر اس سالے بوڑھے ہی کو مار دو جو ہمیں شریف آدمی کہہ رہا تھا۔“

”شریف ہونا بُری بات ہے۔“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔

”ہاں! میرے لئے شریف ہونا بُری بات ہے۔ میرا باپ شریف آدمی ہے۔ جس کی بیوی میری ماں تھی لیکن مجھے باپ کہنے والا کبھی پیدا نہ ہو سکے گا۔ خان بہادر عاصم کی ایسی کی تیس۔“ حمید کچھ نہ بولا۔ آج کل قاسم تقریباً ہر وقت ہی اپنے باپ کی شان میں قصید پڑھتا رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ حال ہی میں اس کے ایک ماموں زاد بھائی کی شادی ہوئی تھی اور یہ جوڑا آپس میں ایک دوسرے سے گہری محبت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ قاسم کے سینے پر سانپ لوٹنے رہے ہوں گے کیونکہ اُس کی ازدواجی زندگی سرے سے ناکام رہی تھی۔

حمید چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر وہ بھی ڈائینگ ہال کی طرف بڑھا۔ قاسم بڑبڑاتا ہوا

چل رہا تھا۔

”یہ اُن بھی شاید مذاق کرتے ہیں۔ اُس بڑھے مریل کی جو روایتی نگڑی اور میری بیوی چوہیا کی اولاد..... واہ..... واہ..... کیا انصاف ہے۔“

”سٹ اپ یو کالا کافر۔“ حمید رک کر مڑا۔ ”یہ تمہارے باپ کا انصاف ورنہ کسی عورت کی پیشانی پر اُس کے ہونے والے شوہر کا نام نہیں لکھا رہتا۔“

”تم میری بات نہ کاٹا کرو سمجھے۔“ قاسم کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہی عورت پھر آنکرائی۔ وہ ابھی ڈائینگ ہال میں پہنچے بھی نہیں تھے۔

”دیکھئے..... میں پھر کہتی ہوں کہ پرس واپس کر دیجئے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“ عورت نے کہا۔ ”آپ خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئی ہیں۔“ حمید مسکرایا۔

”اے تم مسکراتے کیوں ہو۔“ قاسم جھلا گیا۔ ”پھر کیا کروں۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”مجھے ان پر لاکھ برس غصہ نہیں آ سکتا۔

تم بھی مسکراؤ۔ قاسم نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ہونٹ پھیلے اور پھر سکڑ گئے۔ ”میں آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“

”شوق سے کر دیجئے۔“ حمید نے کہا۔ ”اے تم اپنا ڈائینگ کارڈ کیوں نہیں نکالتے۔“ قاسم پھر جھلا گیا۔

اور عورت ایک زہریلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”نہیں آپ اپنا ڈائینگ کارڈ اپنے پاس ہی رکھئے۔ دنیا کے سارے جیب کترے خود کو لارڈ کچر کا بھتیجا ظاہر کرتے ہیں۔“

”اے زبان سنجال کے! تم خود ہوگی جیب کتری۔“ قاسم جیب سے اپنا پرس نکالتا ہوا بولا۔ ”کتنے روپے تھے آپ کے پرس میں۔“

”دو ہزار.....!“

”قاسم نے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی کھینچی اور بیس نوٹ اس کی طرف بڑھادیئے۔“

”دو ہزار روپے میرے جوتے کی نوک پر رکھے رہتے ہیں۔“ عورت تھنے پھلا کر بولی۔
 ”پھر آپ کیا چاہتی ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”آپ بتائیے پرس کس قسم کا تھا تاکہ وہ بھی خرید دیا جائے۔“

”آپ لوگ عجیب آدمی ہیں۔“ ذہنا عورت روہانسی ہو کر بولی۔ ”میں اپنا پرس چاہتی ہوں۔“
 ”اگر ہمیں علم ہوتا تو اپنا وقت نہ برباد ہونے دیتے۔“ حمید نے کہا۔
 ”اُس پرس میں دو تین خطوط تھے۔“
 ”وہ لیٹر بکس ہی سہی..... لیکن ہمیں علم نہیں۔“
 ”میں برباد ہو جاؤں گی۔ تباہ ہو جاؤں گی۔ خدا کے لئے رحم کیجئے۔“
 ”ہاں..... پرس کی تلاش کے سلسلے میں ہم آپ کی مدد ضرور کر سکتے ہیں۔“ حمید نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
 عورت نے وزیٹنگ کارڈ دیکھا اور پھر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
 ”معاف کیجئے گا میری غلط فہمی کو۔“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔
 ”کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں اب فرمائیے۔ چلئے میں اس جیب تراشی کی رپورٹ درج کرواؤں۔“
 ”اوہ..... یہی تو میں نہیں کرنا چاہتی۔ ورنہ اب تک شاید آپ ہی کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر بیٹھتی۔ اوہ..... اچھا خاموش رہئے پروفیسر آرہے ہیں۔“
 بوڑھا تیزی سے اُن کی طرف لپکا آ رہا تھا۔

”اوہ..... ڈارلنگ تم نہیں باز آؤ گی۔“ وہ قریب پہنچ کر بولا۔ ”میں کہتا ہوں، ختم کرو اس قصبے کو۔ اگر یہ حرکت ان کی ہوتی تو یہ یہاں ٹھہرتے کیوں۔ تھوڑی عقل بھی استعمال کرو۔“
 ”اوہ..... ہاں ڈیر۔“ عورت جلدی سے بولی۔ ”میں دراصل ان سے معافی مانگنے آئی تھی۔ یہ معزز اور شریف آدمی ہیں۔“

”کیوں..... دیکھا..... میں نہ کہتا تھا۔“ بوڑھا بچکا نے انداز میں ہنسنے لگا۔

”کاش آپ حضرات میری دعوت قبول کر لیتے۔“ عورت نے ان دونوں کی طرف دیکھ

کر کہا۔ پھر بوڑھے سے بولی۔ ”میں نے کہا تھا اگر کوئی حرج نہ ہو تو کھانا ہمارے ہی ساتھ کھائیے۔“
 ”بالکل مناسب کہا تھا تم نے ڈارلنگ۔“ بوڑھا چمک کر بولا۔
 ”پھر آپ کیا کہتے ہیں۔“ عورت اُن کی طرف مڑی۔
 ”ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ حمید نے کہا۔
 ”اوہ..... شکریہ..... آئیے آئیے۔“ بوڑھا ڈائیننگ ہال کی طرف مڑتا ہوا بولا۔ اس کی رفتار تیز تھی۔ یہ تینوں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ وہ کافی آگے نکل گیا۔
 ”آپ کو اس ڈرامائی دعوت پر حیرت تو ہوئی ہوگی۔“ عورت نے آہستہ سے کہا۔
 ”ہونی ہی چاہئے۔“ حمید بولا۔
 پتہ نہیں قاسم پر کیا بیت رہی تھی۔ ایک نگہری سی عورت کا قرب اور دوسرے یہ دعوت۔ اس کے دل و معدے میں بیجان تو یقیناً برپا ہو گیا ہوگا۔
 ”میں کیا بتاؤں کہ کتنی پریشان ہوں۔“ عورت نے کہا۔
 لیکن حمید خاموشی سے چلتا رہا۔
 وہ ڈائیننگ ہال میں آئے۔ ان کی میز غالباً پہلے ہی سے ”مخصوص“ تھی۔ بوڑھا ان سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اُس نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔
 پھر کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔ ”اگر آپ حضرات اپنے تعارف کی زحمت گوارا کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”میں اقبال سلیم ہوں۔“ حمید نے کہا۔ ”تقریبی کتابوں کی تجارت ذریعہ معاش ہے اور یہ مسٹر قاسم ہیں۔ خان بہادر عاصم کے صاحبزادے۔“
 ”بڑی خوشی ہوئی۔“ بوڑھا ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”لوگ مجھے پروفیسر شوخ کہتے ہیں اور یہ مسز شوخ ہیں۔“

”آپ دونوں سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔“

”ہوئی نا..... میں پہلے ہی کہتا تھا۔“ بوڑھا پھر بچکا نے انداز میں ہنسا۔

”لیکن آپ پروفیسر کیوں ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”اوہ..... کسی زمانے میں فلسفے کا پروفیسر تھا۔“ بوڑھے نے ہنس کر کہا۔ ”فلسفہ تاریخ اور پولیٹیکل سائنس تینوں مضامین میں ڈاکٹریٹ کی تھی۔ آپ کے اس شہر میں کوئی اور بھی ایسا ہے جس نے تین مضامین میں ڈاکٹریٹ لی ہو۔“

”چار..... پروفیسر صاحب! ایک میں ہی ہوں۔ نیراسکا یونیورسٹی کو مجھے چار مضامین میں ڈاکٹریٹ دینی پڑی تھی تب کہیں جا کر اُس کا پیچھا چھوٹا۔“

”نہیں.....!“ ہس نے حیرت سے کہا۔ ”کن مضامین میں۔“

”ٹیلرنگ، بک مانیٹنگ، آکس کریم فریئرنگ اور پلاسٹک مولڈنگ۔“

”لا حول ولاقوہ....“ بوڑھا بے اسامہ بنا کر بولا۔ ”یہ بھی کوئی مضامین ہوئے۔“

”آپ کے مضامین پر میں دس بار لا حول ولاقوہ بھیج سکتا ہوں۔“

”نہیں بھیج سکتے۔“ قاسم بوڑھے کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔

”نہیں بھیج سکتے نا..... میں پہلے ہی کہتا تھا۔“ بوڑھا ہنسنے لگا۔

”مہلطفہ..... تاریخ..... لوٹو میکل پائینس!“ قاسم سر ہلا کر بولا۔ ”واہ واہ سبحان اللہ۔“

”پولیٹیکل سائنس.....!“ بوڑھے نے تصحیح کی۔

”جی ہاں..... جی ہاں۔ میں جلدی میں کہہ گیا تھا۔“

”اوہ..... کھانا ڈارلنگ.....!“ دفعتاً بوڑھے نے عورت سے کہا۔

”ہاں! میں نے ویٹر سے کہہ دیا ہے۔“

”مگر یہ شوخ کیسا نام ہے پروفیسر صاحب۔“ حمید خواہ خواہ چھیڑ چھاڑ جاری رکھنا چاہتا تھا۔

”نام نہیں تخلص ہے..... میں شاعر بھی ہوں۔“

حمید کی روح فنا ہو گئی کیونکہ شاعری تاریخ و فلسفہ اور سیاست سب پر حاوی ہو جاتی ہے اور

شاعر سر پر سوار ہو جاتا ہے۔

”مجھے شاعری سے بالکل دلچسپی نہیں ہے۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”ہونی بھی نہ چاہئے۔ بھلا پلاسٹک مولڈنگ اور شاعری میں کیا علاقہ۔“

حمید جواب میں کچھ کہنے کے لئے بچے جھاڑی رہا تھا کہ ایک ویٹر نے قریب آ کر بوڑھے سے کہا۔

”آپ کا فون ہے جناب۔“

”اوہ..... اچھا..... میں ابھی حاضر ہوا۔“ بوڑھا اٹھتا ہوا بولا۔

حمید اُسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی چال مضحکہ خیز تھی۔ حمید نے پائپ نکالا اور تمباکو بھرنے لگا۔

”اوہ..... اب کھانا آئی رہا ہوگا۔ آپ پائپ کیوں بھر رہے ہیں۔“ عورت نے کہا۔

”کھانے کے بعد کیلئے بھر رہا ہوں..... مگر شوخ صاحب زندہ دل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“

”آپ اُن کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کر رہے تھے کیا یہ مناسب تھا اور آپ نے انہیں اپنا صحیح نام بھی نہیں بتایا۔“

”کیسے بتانا جب کہ آپ خود ہی نہیں چاہتی تھیں۔“

”میں نہیں چاہتی تھی..... یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”اگر آپ چاہتی ہو تو خود ہی تعارف کرا دیتیں۔ آپ تو میرے نام سے واقف تھیں۔“

”جی نہیں..... میں نے آپ کا کارڈ دیکھا تھا۔ لیکن اب اس وقت مجھے آپ کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔“

”کیپٹن ساجد حمید فرام فیڈرل انٹیلی جنس بیورو۔“

”کیا یہ آپ کی پیشانی پر تحریر ہے۔“ عورت نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے آپ کا یہ کارڈ جعلی ہو۔“

”پھر آپ نے ہمیں کیوں مدعو کیا ہے۔“

”ختم کیجئے.....!“ عورت ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”پروفیسر آ رہے ہیں۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ بوڑھا بڑی تیزی سے میز کی طرف آیا۔ وہ کچھ پریشان سا تھا اور اس

کی سانس پھول رہی تھی۔

”اوہ..... ڈیر..... داؤد زینوں سے گر گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ نہیں نہیں آپ حضرات تشریف رکھئے۔ تم بھی بیٹھو ڈیر۔ میں دیکھ لوں گا۔“

”نہیں میں بھی چل رہی ہوں۔“ عورت اٹھتی ہوئی بولی۔

”نہیں! تم بیٹھو..... یہ بدتمیزی ہے کہ مدعو کر کے.....!“

”نہیں جناب کوئی بات نہیں۔“ حمید نے کہا۔

”نہیں آپ حضرات تشریف رکھئے۔“ بوڑھے نے کہا اور تیزی سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

”پروفیسر بہت سوشل آدمی ہیں۔“ عورت بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”ہمارا بھتیجا زینوں سے گر کر

زخمی ہو گیا ہے۔ پھر بھی انہوں نے اسے گوارا نہیں کیا کہ ان کے مہمان ان کے متعلق کوئی بُری

رائے قائم کریں۔“

”اور آپ اتنے اچھے آدمی کو دھوکا دینا پسند کرتی ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”یہی کہ دو جیب کتروں کو ان پر بار بار بنا رہی ہیں۔“

”اے..... ذرا سوچ سمجھ کر۔“ یک بیک قائم بولا۔ ”تم ہو گے جیب کترے میں تو نہیں ہوں۔“

”آپ غلط سمجھے..... آپ نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے محض اسی لئے کہا تھا کہ پروفیسر کو کسی نئی

الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں ایک بار پھر استدعا کروں گی مجھے صرف وہ خطوط دے دیجئے۔“

”وہ خطوط کیسے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”بس ایسے ہی کہ ان سے پروفیسر کو دکھ پہنچ سکتا ہے۔“

”میں سمجھ گیا۔ یعنی اگر وہ خطوط غلط ہاتھوں میں پہنچ جائیں تو آپ بلیک میل بھی لا

جاسکتی ہیں۔“

”یہی سمجھ لیجئے۔“ عورت نے کہا اور پھر تھوڑے توقف کے ساتھ بولی۔ ”اگر پس آ

کے پاس ہے تو آپ جو قیمت لگائیں میں ادا کرنے کو تیار ہوں اور اگر آپ واقعی محکمہ سرائی

جلد نمبر 20

شیطان کی محبوبہ

رسائی سے تعلق رکھتے ہیں تو خدا را میری مدد کیجئے ورنہ..... ورنہ..... دیکھئے میں نہیں چاہتی کہ پروفیسر کی زندگی برباد ہو۔ حالانکہ اگر میں آپ کو حقیقت بتا دوں تو آپ بھی میرا مسئلہ اڑانے پر تیار ہو جائیں گے۔“

”بتا دیجئے حقیقت بھی تاکہ میں سچ مچ آپ کو بلیک میل کر سکوں۔“

”خدا را سنجیدگی اختیار کیجئے۔“ عورت نے کہا اور اتنے میں دو ویٹروں نے مزر پر برتن

لگانے شروع کر دیئے۔ قاسم بار بار منہ چلاتا ہوا پہلو بدل رہا تھا۔

ویٹر کھانا رکھ کر چلے گئے اور سلسلہ گفتگو پھر شروع ہو گیا۔

”کوئی سالہ آپ کو بلیک میل نہیں کر سکتا۔“ قاسم بڑا ساناوالا حلق میں ٹھونستا ہوا بولا۔

”مجھے بتائیے میں ایک ایک کی گردن توڑ دوں گا۔“

وہ قاسم کی طرف شہے کی نظر سے دیکھنے لگی۔

”میں انتہائی کوشش کروں گا۔“ حمید بولا۔ ”آپ کا کیا نام ہے۔“

”شوخی.....!“ قاسم نے کہہ کر ایک بھدا سا قہقہہ لگایا۔

”آپ لوگ آخر اتنی بدتمیزی سے کیوں پیش آرہے ہیں۔“

”مم..... معاف..... کیجئے گا۔“ قاسم ہلکایا۔

”یہ میرے دوست تھوڑے سے کریک ہیں۔“ حمید بولا۔

”جی ہاں..... میں بالکل..... ال..... ال..... الو ہوں۔“ قاسم نے بڑی سعادت مندی

سے اعتراف کیا۔

”اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ مجھ سے ایک بڑی حماقت سرزد ہوئی ہے۔ پس

یقیناً آپ ہی لوگوں کے پاس ہے اور میں نے آپ سے ان خطوط کی اہمیت کا تذکرہ کر دیا ہے۔“

”اور ہم لوگ اب آپ کو بلیک میل کریں گے..... کیوں؟“

”اور کیا کہا جاسکتا ہے۔“ عورت نے کہا اور دفعتاً اس طرح اچھل پڑی کہ نہ صرف ہاتھ

سے نوالا چھوٹ گیا بلکہ ایک پلیٹ بھی الٹ گئی۔ اُس کا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا ہوا تھا اور

آنکھوں سے شدید ترین تکلیف ظاہر ہو رہی تھی۔ پھر وہ نیچے جھکی اور داہنا پیر اٹھا کر ایک پنڈلی پر رکھ لیا۔

پنڈلی پر سے ساری سرکائی اور ایک ہلکی سی چیخ اُس کے حلق سے نکل گئی۔ حمید بھی جھکا۔ پنڈلی میں ایک بڑی سی سوئی چھپی ہوئی تھی جس کی نوک دوسری طرف نکل گئی تھی اور پچھلا حشر اسی قدر گوشت سے باہر نکلا ہوا تھا کہ چٹکی سے پکڑا جاسکے۔

”میرے خدا..... میں مری۔“ وہ دونوں آنکھیں بھیجنے کر کرا رہی لیکن حمید دوسرے ہی لمے میں سوئی کو گوشت سے کھینچ چکا تھا۔ خون کی ایک پتلی سی لکیر سفید پنڈلی پر متحرک نظر آرہی تھی۔

منہ کا سانپ

قاسم اور حمید دونوں ہی اس واقعے پر بوکھلا گئے تھے۔ بوکھلاہٹ میں انہماک اس لئے بھی ہو گیا تھا کہ لوگ اپنی اپنی میزوں سے اٹھ اٹھ کر ان کی طرف آنے لگے تھے۔ حمید نے رومال سے خون خشک کیا اور دوسرا رومال پانی میں بھگو کر زخم پر باندھ دیا۔

”کوئی بات نہیں ہے۔“ حمید نے دوسروں سے کہا۔ ”آپ اپنی میزوں پر تشریف لے جائیں۔ معمولی سی چوٹ ہے۔“

لیکن چوٹ کے متعلق پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ وہ اتنی ہی دلکش عورت تھی کہ لوگ زبا سے زیادہ ہمدردی کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ بدقت تمام حمید انہیں میز کے پاس سے کھسکانے میں کامیاب ہو سکا۔

عورت کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔ اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ تکلیف برداشت کرنے کے لئے سخت ترین جدوجہد کر رہی ہے۔

”یہ کیسے ہوا۔“ حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں مگر کچھ نہیں بولی۔

”جی ہاں..... یہ کیسے ہوا۔“ قاسم نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔“ عورت خوفزدہ آواز میں بولی۔ ”آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں جانا چاہتی ہوں۔“

”آخر یہ سوئی۔“ حمید نے کہا۔

”آپ کو اس سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔“ عورت نے غصیلے لہجے میں کہا اور ویٹر کو اشارے سے بلا کر بل لانے کو کہا۔

”آپ جانیے۔“ حمید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”بل میں ادا کر دوں گا۔“

”میں فقیر نہیں ہوں۔“ عورت نے کہا۔

”ہم بھی بھک مگئے نہیں ہیں۔“ حمید نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”آپ دونوں میاں بیوی کر یک معلوم ہوتے ہیں۔“

”تمیز سے بات کیجئے۔“

”ہاں تمیز سے گفتگو کرو۔ تم خود ہو گے کر یک۔“ قاسم عورت کا ساتھ دینے لگا۔ اتنے میں ویٹر بل لایا اور عورت نے کچھ نوٹ بلاؤز کے گریبان سے نکال کر طشتری میں رکھ دیئے۔

”یہ روپے بھی آپ نے پرس میں کیوں نہیں رکھے تھے“ حمید نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”تم سے مطلب.....!“ قاسم اکھڑ گیا۔

”تم خاموش رہو۔“

”نہیں خاموش رہوں گا۔ تم ایک لیڈی کی تو ہیں کر رہے ہو۔“

عورت اٹھ گئی۔ حمید اُسے دروازے کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔

”وہ تو غئی حمید بھائی۔“ قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم میرے پیچھے نہیں آؤ گے سمجھے! ورنہ تمہارا انجام بہت بھیانک ہوگا۔“ حمید بھی اٹھتا

”ارے واہ.....!“ قاسم نے کہا اور اٹھنے کا ارادہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

حمید کپاؤنڈ میں پہنچ چکا تھا۔ اُس نے عورت کو گیرج کی طرف جاتے دیکھا اور وہ خود بھی آگے بڑھا۔ وہ اپنی واٹر کول انجن والی بے آواز موٹر سائیکل پر آیا تھا اور وہ بھی گیرج ہی میں تھی۔

حمید بھی بہت محتاط ہو گیا تھا کوشش یہی تھی کہ نظر اس پر نہ پڑنے پائے۔

عورت نے گیرج سے کار نکالی اور حمید اُس وقت تک اپنی موٹر سائیکل کے قریب کھڑا رہا جب تک کہ کار باہر نہیں نکل گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

اگر سوئی والا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو وہ اُن دونوں میاں بیوی کی جھکی سمجھ کر نظر انداز کر دیتا مگر وہ عورت اسی طرح اچھل پڑی تھی جیسے اچانک کوئی چیز آگئی ہو۔

پھر سوئی بھی کیسی جو ایک طرف سے گھس کر دوسری طرف نکلی گئی تھی۔ یقیناً وہ بڑی قوت سے پھینکی گئی ہوگی۔ مگر کیسے..... کیا انسانی ہاتھ اس قسم کا کوئی کورنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ حمید کو یہ ناممکن معلوم ہوئی اور وہ یہی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر وہ سوئی پھینکی ہی گئی تھی تو اس کے لئے کسی قسم کی مشین استعمال کی گئی ہوگی۔ لیکن عورت نے اس کے متعلق کچھ بتانے کی بجائے چھپانے کی کیوں کوشش کی تھی۔ وہ خوفزدہ بھی تھی۔

عورت کی کار سنسان سڑک پر دوڑتی رہی اور حمید تعاقب کرتا رہا۔ نیا گرہ شہر کی آبادی سے بہت دور ایک پر فضا مقام پر واقع تھا۔ اس لئے اس سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں رہتا تھا۔ حمید نے اپنی موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ بجھا رکھی تھی اور اس کا انجن تو بے آواز ہی تھا۔

وہ دونوں آگے پیچھے شہر میں داخل ہوئے اور تعاقب اب بھی جاری رہا۔ آخر تھوڑی دیر بعد وہ کار ایک عمارت کی کپاؤنڈ میں مڑ گئی اور حمید اپنی گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے پھر اپنی موٹر سائیکل موڑی اور اُسے ایک جگہ روک کر اتر پڑا۔

اب وہ اسی عمارت کی طرف پیدل واپس آ رہا تھا جس میں کار داخل ہوئی تھی۔ وہ پچانک کے قریب رکا۔ بائیں جانب کسی کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ حمید جھک کر دیکھنے لگا۔ اُس

تحریر تھا۔ ”پروفیسر..... اے..... آر..... شوخ۔“

حمید پیچھے ہٹ آیا۔ وہ تو اپنے ہی مکان میں داخل ہوئی تھی۔ حمید نے ایک بار پھر عمارت کا جائزہ لیا۔ عمارت بڑی شاندار تھی۔

وہ موٹر سائیکل کی طرف واپس آیا اور اب گھر جانے کے علاوہ اور کیا چارہ رہ گیا تھا۔ آج کل فریدی بھی شہر میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے اسے زیادہ تر گھر ہی پر رہنا پڑتا تھا۔ فریدی کی عدم موجودگی میں اس کے جانوروں کی دیکھ بھال حمید ہی کو کرنی پڑتی تھی اور یہ ایک ایسا کام تھا جس کے تصور ہی سے اُس کی روح فنا ہوتی تھی۔ صرف کتوں کا راشن تقسیم کرانے میں تقریباً دو گھنٹے صرف ہو جاتے اور وہ سوچتا تھا کہ آخر فریدی یہ سب کچھ کیسے کر لیتا ہے۔

گھر پہنچتے ہی اُس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی اور پروفیسر شوخ کے نمبر تلاش کرنے لگا جو جلد ہی مل گئے۔ اُس نے اُسے فون کر کے اس کے بھتیجے کی خیریت دریافت کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر ایسا نہیں کیا۔

کافی رات گئے تک وہ سوئی والی گتھی سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اُسے ناکامی ہی ہوئی اور پھر وہ سو گیا۔

دوسری صبح اُس نے پروفیسر شوخ کے نمبر ڈائریکٹ کئے۔

”ہیلو! میں پروفیسر شوخ ہوں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ہوا کرو۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”آپ کون صاحب ہیں!“

”محکمہ سرائے رسانی کا کیپٹن حمید۔“

”اوہ..... جناب..... فرمائیے..... جناب۔“

”میں بیگم شوخ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور..... ضرور..... براہ کرم ہولڈ اپ کیجئے۔ میں انہیں بھیجتا ہوں۔“

حمید منتظر رہا۔ تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ”ہیلو۔“

”آپ کا پیر کیسا ہے نیگم صاحبہ۔“ حمید نے پوچھا ”اور ساتھ ہی میں آپ کے بھتیجے کی بھی خیریت دریافت کرنا چاہوں گا۔“

”اوہ..... تو آپ ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”آپ مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ اس خط کو دل سے نکال دیجئے۔ میں خود ہی پروفیٹر کو سب کچھ بتا دوں گی۔“

”میں نے اس وقت آپ کو اس لئے فون کیا ہے کہ براہ کرم قانون کی مدد فرمائیے۔ درج ہو سکتا ہے کہ خود آپ کے خلاف مجھے کوئی قانونی کارروائی کرنی پڑے۔“

”کیا مطلب.....!“

”میں اس سوئی کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں جو پچھلی رات میں نے آپ کی پنڈلی سے نکالی تھی۔“

”وہ ایک سوئی تھی۔“ نیگم شوخ نے غصیلی آواز میں کہا۔

”وہ یقیناً ایک سوئی تھی۔ لیکن کس طرح پھینکی گئی تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں اور پھینکنے والا کون تھا.....؟“

”میں کیا جانوں۔“

”محترمہ ہوش کی دوا کیجئے۔ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے مکان پر باوردی آؤں بیجھوں۔ میرا خیال ہے کہ پروفیٹر شوخ اس پر ہرگز تیار نہ ہوں گے۔“

”کیا واقعی آپ کا تعلق حکمہ سراغ رسانی سے ہے۔“

”آپ کو اسی وقت یقین ہو سکتا ہے جب کچھ باوردی لوگ پوچھ گچھ کیلئے وہاں پہنچ جائیں۔“

”دیکھئے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”آپ خواہ مخواہ مجھے دھمکا رہے ہیں۔ جی ہاں

وہ سوئی میری پنڈلی میں چبھی ہوئی تھی آپ کا یہ خیال قطعی لغو ہے کہ کسی نے اُسے پھینکا تھا میں نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے چبھوئی تھی۔ اب فرمائیے کیا خیال ہے۔“

”آپ غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں۔“

”اچھی بات ہے تو اُسے ثابت کیجئے کہ اس کا ذمہ دار میرے علاوہ اور کوئی ہے۔“

”میں ثابت کر دوں گا۔“

”مجھے بھی آگاہ فرمائیے گا۔“ دوسری طرف سے آواز آئی اور سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

حمید کو بڑا غصہ آیا۔ اس عورت کے لیےجے سے اس کی جھلاہٹ پہلے ہی بڑھ گئی تھی۔ وہ ریسور رکھ کر ہٹنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”ہیلو.....!“

”آئیں..... غائیں..... غمید بھائی۔“ دوسری طرف سے آواز آئی اور حمید کا غصہ پہلے

سے بھی زیادہ تیز ہو گیا۔

”کیا ہے۔“

”آ کھری..... دیدار کر جاؤ..... میرا.....!“ قاسم کراہا۔

”کیا ہوا.....؟“

”تھوڑی دیر بعد..... نہیں..... نہیں..... مجھے بچالو..... حمید بھائی بچالو۔“

”اے بتانا کیوں نہیں۔“

”ہائے..... تم بھی کھفا..... ہو گئے۔“ قاسم نے ہنسی لی۔ وہ کچ کچ رو رہا تھا اور اس زور

شور کے ساتھ کہ حمید کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں لائین نہ خراب ہو جائے۔

”میں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور جلدی سے ریسور رکھ دیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں اس پر کیا افتاد پڑی ہے کیونکہ فون پر اُس سے اکثر حماقتیں

سرزد تو ہوتی رہی تھیں لیکن آج تک وہ اس طرح رویا نہیں تھا۔

حمید نے لباس تبدیل کیا اور قاسم کی کونٹھ کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں اُسے ایک ہنگامہ نظر آیا۔ نوکر بدحواسی میں ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے اور قاسم کی دہائیں کمپاؤنڈ سے بھی سنی جاسکتی تھیں۔

”ہائے..... حمید بھائی..... اب کیا ہوگا۔“ قاسم کراہا۔
”کچھ بکوعے بھی۔“

”پہ نہیں۔ دل میں درد ہے کہ جگر میں..... اُلا جانے..... گردے میں ہو..... پچھڑوں
میں ہو۔ حمید بھائی مجھے بچالو۔“

”میں کیسے بچا سکتا ہوں۔“ حمید نے بیزاری سے کہا۔
”یک بیک قاسم اچھل کر بیٹھ گیا۔ پیٹ پر رکھی ہوئی گرم پانی کی بوتلیں دھپ دھپ فرش
پر گریں۔“

”کاسے بچا سکتا ہوں۔“ وہ عورتوں کے سے جلے کٹے انداز میں ہاتھ نچا کر بولا۔
”اپنے ساتھ لئے پھرو گے..... جو کام چاہو گے..... لو گے..... مگر بچا نہیں سکتے.....
ابے لعنت ہے تم پر حمید بھائی۔“

”کیا میرے ساتھ لئے پھرنے کی وجہ سے تم کسی تکلیف میں مبتلا ہوئے ہو۔“
”میں کہتا ہوں تم نے مجھے کل رات کیوں مجبور کیا تھا۔ میں تو اس سالی کے پاس نہیں
بیٹھنا چاہتا تھا۔“

”ہاں.....!“ حمید نے آنکھیں نکال کر ایک طویل سانس لی۔ ”تو اسی سلسلے میں یہ درد
دل یا درد جگر کی کہانیاں ہیں۔ مگر تمہیں یہ مشورہ کس گدھے نے دیا تھا کہ درد دل یا درد جگر کے
سلسلے میں گرم پانی کی بوتلیں۔“

”ارے سنو تو سہی۔ دروازہ بند کر دو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ قاسم آہستہ سے بولا۔
”قاسم! کیا تمہاری شامت آئی ہے۔“

”آئی تھی۔“ قاسم بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ ”مگر تمہارے آتے ہی چلی گئی۔ دروازہ بند
کر دو۔ پیارے بھائی۔“

”حمید چند لمحے اُسے گھورتا رہا پھر دروازہ بند کر دیا۔“

”آؤ..... آؤ..... میرے قریب آؤ۔“ قاسم مضطربانہ انداز میں بولا۔

کمپاؤنڈ میں اسے کئی کاریں بھی کھڑی نظر آئیں۔ اس نے ایک ملازم کو کارڈ دیا مگر
بوکھلا کر بولا۔

”چلے حضور! اس وقت کارڈ کسے دوں گا۔“
”کیوں! کیا بات ہے۔“

”صاحب کے پیٹ میں درد ہے۔“
”لاحول ولا قوۃ۔“ حمید غصیلے لہجے میں بولا۔

”پانچ ڈاکٹر موجود ہیں سرکار۔ مگر صاحب یہی کہتے ہیں کہ ارے میرے ڈاکٹر کو بلاؤ۔“
”نیگم صاحبہ کہاں ہیں۔“

”اندر ہیں..... چلے حضور۔“
”کیا کروں گا چل کر۔“

”وہ آپ ہی کے لئے توجیح رہے ہیں۔“

اندر پہنچ کر حمید نے قاسم کو ایسے حال میں دیکھا کہ اگر ضبط نہ کرتا تو بے تحاشہ قہقہے لگا
ہوا نظر آتا۔ وہ ایک مسہری پر چت پڑا تھا اور پیٹ پر ربر کی تین بوتلیں تولیوں میں لپیٹی ہوا
رکھی تھیں۔ اس کی بیوی کے علاوہ وہاں شہر کے پانچ بڑے ڈاکٹر بھی موجود تھے۔

”حامید..... بھائی..... آ..... آئی.....!“ قاسم دونوں ہاتھ پھیلا کر چیخا۔

”اوہ آپ آ گئے۔“ قاسم کی بیوی اس کی طرف مڑ کر طنزیہ لہجے میں بولی اور ساتھ ڈ

قاسم دہانزا۔ ”جاؤ..... تم سب دفع ہو جاؤ۔ میرا ڈاکٹر آ گیا۔“

”کیوں بکواس کرتے ہو۔“ حمید قاسم کو گھورتا ہوا بولا۔ ”کیا بات ہے۔“

”میں کہتا ہوں..... حمید بھائی کے علاوہ اور سب لوگ اس کمرے سے چلے جائیں۔“

قاسم حمید کے سوال پر دھیان دیئے بغیر غرایا۔

قاسم کی بیوی چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر اس نے ڈاکٹروں کو اپنے ساتھ چلے

اشارہ کیا۔ وہ اٹھ گئے اور پھر کمرے میں صرف حمید ہی رہ گیا۔

”لیکن اگر وہ کوئی بے نکی بات ہوئی تو تمہاری یقینہ زندگی تلخ کر دوں گا۔“ حمید ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

”ارے یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ وہ حرامزادی مجھے رات سے مارے ڈال رہی ہے۔“

”کون حرامزادی۔“

”وہی حرامزادی جو ابھی یہاں سے اپنے پانچ باواؤں کے ساتھ گئی ہے۔“

”ہام..... اچھا.....!“

”پچھلی رات وہ بھی نیا گرا گئی تھی اور اس نے ہمیں دیکھا تھا۔ بیگم کھوس کے ساتھ۔“

”بیگم شوخ.....!“ حمید نے تصحیح کی۔

”اوندہ..... شوخ ہی سہی۔“ قاسم برا سا منہ بنا کر بولا۔ ”وہ حرامزادی بیگم شوخ کو بھی

جانتی ہے۔“

”اگر تم نے اُسے اب حرامزادی کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔“

”تیوں.....!“ قاسم کی آنکھیں نکل پڑیں۔

”اپنے باپ کو گالیاں دو..... اس کا کیا قصور ہے کیا اس نے تم سے شادی کی درخواست

کی تھی۔“

”ہائیں..... تو پھر کیا میں اپنے باپ کو حرامزادہ کہوں۔“

”یقیناً.....!“

”ذرا زبان سنبھال کر۔“

”سنبھل گئی..... ہاں تو تم ابھی کیا کہہ رہے تھے۔“

”حرامزادی کہہ رہا تھا۔“ قاسم گردن اکڑا کر بولا۔

”حرامزادی کیا کہہ رہی تھی۔“

”آہاں..... ارے الا قسم۔“ قاسم متحیرانہ انداز میں آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”وہ ایسی باتیں

کرتی ہے حمید بھائی کہ دم نکلنے لگتا ہے۔ رات بھر بوری کرتی رہی اور پھر مجبوراً مجھے پیٹ میں درد کرنا پڑا۔“

”کیوں؟ کیا وہ باتیں بیگم شوخ کے متعلق تھیں۔“

”ارے..... ہاں..... ہاں.....!“ قاسم سر ہلا کر بولا۔

”کیسی باتیں۔“

”یہی کہ بیگم شوخ ڈائن ہے۔ جادو گر نی ہے۔ اُس کے منہ سے سانپ نکل آتے ہیں اور

اسکے عاشق پاگل ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسے آدمی کو جانتی ہے جو پاگل ہو گیا ہے۔ اس کی

کے ماموں کے سالے کا بھتیجا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ہم دونوں پاگل ہو جائیں گے۔“

”تمہیں یقین ہے کہ تمہاری بیوی پچھلی رات نیا گرہ میں تھی۔“

”ہاں پیارے بھائی! اُس نے ایک ایک بات بتائی ہے۔“

”ٹھہرو! میں اس سے گفتگو کرتا ہوں۔“

”ہائیں! اے کیوں شامت آئی ہے حمید بھائی۔ وہ ایسی دل ہلا دینے والی باتیں کرتی

ہے کہ روح بھٹنا ہونے لگتی ہے..... فنا..... فنا ہونے لگتی ہے۔“

”میں اُس سے پوچھوں گا کہ وہ ایسی باتیں کیوں کرتی ہے۔ اگر سچ مجھ تمہارا ہارٹ فیل

ہو جائے تو کیا ہوگا۔“

”ہاں..... دیکھو تو حمید بھائی۔“ قاسم کی آواز مظلومیت کے اظہار میں گلوگیر ہو گئی۔

”اچھا تم ٹھہرو۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

”اچھا..... اچھا.....!“ قاسم نے جسم سکڑ کر جمائی لی اور آہستہ آہستہ منہ چلانے لگا۔

حمید دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آیا اور راہداری ہی میں قاسم کی بیوی سے ملاقات

ہو گئی جو بہت ہی غصے کے عالم میں تیزی سے ادھر ہی آ رہی تھی۔

حمید نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن انداز سے ایسا معلوم

ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی چیخنے لگے گی۔

”نہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”اگر وہ پھر بے قابو ہو گیا تو تمہیں سارے شہر کے ڈاکٹر اکٹھے کرنے پڑیں گے۔ میں نے بہت مشکل سے اُسے سیدھا کیا ہے۔“
وہ کچھ نہ بولی۔ حمید کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہی۔

آؤ..... حمید نے اُسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور بچوں کے بل قاسم کے کمرے کی سمت چلے لگا۔ غیر ارادی طور پر وہ بھی اس کی تقلید کرنے لگی۔ وہ بھی اتنی ہی احتیاط سے چل رہی تھی کہ آواز پیدا نہ ہونے پائے۔

کمرے کے سامنے رک کر حمید نے دروازے کے شیشوں کے اندر جھانکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے لئے قاسم کی بیوی کو بچوں کے بل کھڑا ہونا پڑا لیکن اس کے باوجود بھی وہ شیشوں تک پہنچ سکی۔ آخر اُسے قفل کے سوراخ سے جھانکنا پڑا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ متحیرانہ انداز میں حمید کی طرف مڑی۔
حمید مسکرا رہا تھا۔ پھر دفعتاً اُس نے دھکا دے کر دروازہ کھولا اور اندر گھستی چلی گئی۔ قاسم اچھل پڑا۔ اُس نے بچے کے نیچے سے کوئی چیز نکال کر منہ میں رکھی تھی اور اب وہ ایک مضحکہ خیز پوزیشن میں تھا۔ ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھیں، ہاتھ پٹی پر تھے منہ پھولا ہوا ہونٹ بچے ہوئے اور صرف آنکھیں گردش کر رہی تھیں۔ کبھی وہ حمید کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی اپنی بیوی کی طرف۔
دفعتاً وہ آگے بڑھی اور سر ہانے سے تکیہ اٹھا لیا جس کے نیچے ٹوٹے ہوئے بسکٹوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔

”یہ درد ہو رہا تھا تمہارے پیٹ میں۔“ وہ آنکھیں نکال کر بولی۔
”خاں..... ہپ.....!“ بسکٹ کے ٹکڑے اُس کے منہ سے اچھل کر دور جا گرے۔
قاسم جھلا گیا تھا۔ ”اب میں زہر کھاؤں گا.....!“ وہ دہاڑا۔
”میری طرف سے اینٹ اور پتھر بھی کھاؤ۔“ اس کی بیوی چیخی۔
”ارے تم!“ قاسم حمید کو گھونٹہ دکھا کر بولا۔ ”تم بڑے گداڑ..... غدار ہو۔“
”ابے میں نے کیا کیا ہے۔ تم پیٹ کے درد سے پڑ پڑ رہے تھے۔ میں نے اسے“

دل ثابت کر دیا۔ تمہاری تڑپیں ختم ہو گئی۔“ حمید نے کہا اور پھر قاسم کی بیوی کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ ”درد دل کے لئے بسکٹ مضر نہیں ہیں۔“

”آپ خاموش رہنے براہ کرم۔“ قاسم کی بیوی جلتے لئے لہجے میں بولی۔
”ابے ہاں..... تم کیوں ہمارے بیچ میں ٹائیں ٹائیں کرتے ہو۔“
”اچھا تو کہہ دوں..... ابھی جو کہہ رہے تھے۔“

”کہہ دو..... کہہ دو..... کیا تم میرے بڑے دوست ہو۔ پچھلی رات تم نے مجھے اُس جادوگر کی گرنی کے چکر میں پھنسا دیا۔ پاگل ہو کر مرو گے..... دیکھنا۔“

”بکواس مت کرو۔ وہ ایک مجرمہ ہے اور میں خاص طور پر اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔“
”آپ نگرانی کر رہے ہیں۔“ قاسم کی بیوی نے پوچھا۔
”یقیناً کر رہا ہوں..... لیکن یہ بات اپنی ہی حد تک رکھنا۔“

”ارے واہ.....!“ قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔ ”میں ابھی اسے فون کرتا ہوں کہ یہ کیپٹن حمید باری نگرانی کر رہا ہے۔“

”کر کے دیکھو..... ناقابل ضمانت وارنٹ نکلاؤں گا اور میں اپنی بہن کو ساتھ لے جا رہا۔ وہ تم جیسے نالائق آدمی کے ساتھ ہرگز نہیں رہ سکتی۔“
”قونسی بہن۔“

”کیپٹن حمید تمہارا سالہا ہے نا لہذا یہ کیپٹن حمید کی بہن ہوئی۔ چلو تم میرے ساتھ۔“
”ارے جاؤ جاؤ۔“ قاسم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”بڑے آئے بہن والے سالے۔“
”تم بدتمیزی کیوں کر رہے ہو۔“ قاسم کی بیوی نے اُسے لاکرا۔
”ہاں..... تو تم جاؤ گی بھائی کے ساتھ..... ذرا جا کر تو دیکھو۔“
”چلے حمید بھائی۔“

”لاشیں گریں گی یہاں اگر تم نے گھر سے باہر قدم نکالا۔“
”اچھی بات ہے۔ ہم یہاں بیٹھیں گے۔“ حمید نے کہا اور قاسم کی بیوی کو بھی بیٹھنے کا

کچھ دیر تک خاموشی رہی اور قاسم دونوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ پھر حمید نے اس کی بیوی سے کہا۔ ”تو آ پا جان.....!“

”ابے چوپ۔“ قاسم حلق کے بل دباڑا۔ ”صرف آ پا کہو..... جان نہیں۔“
قاسم کی بیوی بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

”اچھا آ پا..... مجھے اُس عورت کے متعلق بتاؤ۔ تم اُسے کب سے اور کیسے جانتی ہو۔“
”میرے ایک ماموں زاد بھائی سے پچھلے ہفتے وہ کہیں ملی تھی۔ وہ اُس پر سمجھ گئے۔ اُن سے ملے رہے..... اور پھر ایک رات اُن کا بیان ہے کہ اس عورت کو کھانسی آئی اور اس کے ذرا سے ایک ننھا سا سانپ گر کر فرش پر ریگنے لگا۔“

”ارے باپ رے۔“ قاسم سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔
”تمہیں یقین ہے کہ اُن حضرت کا بیان صحیح ہے۔“ حمید نے پوچھا۔
”مجھے یقین ہے..... ناصر بھائی جھوٹ نہیں بول سکتے۔“

”ان کا پتہ بتاؤ..... میں اُن سے ملوں گا۔“
”مجھے افسوس ہے کہ اب وہ آپ کے کسی سوال کا صحیح جواب نہ دے سکیں گے۔“
”کیوں؟“

”اس واقعہ کے دو دن بعد اُن کا دماغ الٹ گیا۔“
”ہوں.....!“ حمید کسی سوچ میں پڑ گیا۔

”ابے تم بھی پاگل ہو جاؤ گے۔“ قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”میں سمجھی تھی شاید آپ دونوں اُس کے چکر میں ہیں۔“ قاسم کی بیوی نے کہا۔

”صرف میں اس کے چکر میں تھا۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”اور ایک بار پھر تم دونوں سے

کہتا ہوں کہ ان باتوں کو اپنی ہی حد تک رکھنا۔“

پھر وہ وہاں سے چل دیا۔

بے سرو پا تجربہ

بیگم شوخ کی شخصیت کافی دلچسپ ہوتی جا رہی تھی۔ حمید قاسم کے گھر سے روانہ ہو کر ایک طرف چل پڑا مگر پھر خیال آیا کہ اسے قاسم کی بیوی سے اس ناصر کا پتہ معلوم کر لینا چاہئے تھا۔
راہ میں ایک جگہ کار روک کر وہ اتر پڑا اور پبلک ٹیلی فون بوتھ سے قاسم کے نمبر ڈائل کئے۔ کال اس کی بیوی نے ریسپونڈ کی لیکن حمید نے صرف پتہ ہی معلوم کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔
اب وہ احمد لاج کی طرف جا رہا تھا۔ قاسم کی بیوی کا ماموں زاد بھائی وہیں رہتا تھا۔ یہ لوگ بھی شہر کے متول ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

عمارت کے قریب پہنچ کر حمید نے کار روکی اور اپنا کارڈ اندر بھیجوا دیا۔

ڈرائیونگ روم میں اسے تقریباً پانچ منٹ تک تنہا بیٹھنا پڑا پھر ایک معمر آدمی نے اُسے انتظار کی زحمت سے نجات دلائی۔

”فرمائیے جناب!“ بوڑھے نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے مسٹر ناصر سے ملنا ہے۔“

”آپ..... ناصر۔“ بوڑھا کچھ نزوس سا نظر آنے لگا۔ ”جی ہاں..... وہ میرا لڑکا ہے..... مگر محکمہ سرانج رسانی.....!“

”جی ہاں ایک سلسلے میں ان سے گفت و شنید کرنی ہے۔“

”کس سلسلے میں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں نہ بتا سکوں گا۔“

”تب مجھے بھی افسوس ہے جناب۔“ باڑھا گلوگیر آواز میں بولا۔ ”آپ اُس سے گفتگو نہ کر سکیں گے۔“

”قانون کی مدد کرنا ہر شہری کا فرض ہے۔“

”بشرطیکہ شہری صحیح الدماغ ہو۔“ بوڑھے نے کہا۔

”کیوں؟ میں نہیں سمجھا۔“ حمید نے حیرت ظاہر کی۔

”ناصر ہوش میں نہیں ہے۔“

”مگر ایک ہفتہ پہلے تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“

”جی ہاں..... آج سے پانچ دن پہلے ایک ایک اس کا دماغ الٹ گیا اور اب وہ میٹل ہسپتال میں ہے۔“

”آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں اُسے آپ کے خلاف عدالت میں بھی.....!“

”جی ہاں..... قطعی۔“ بوڑھا بات کاٹ کر بولا۔ ”لیکن آخر ناصر کے سلسلے میں عدالت

تذکرہ کیوں۔“

”وہ ایک ایسی عورت کیساتھ دیکھے جاتے رہے ہیں جسے قانون اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔“

بوڑھے نے ایک طویل سانس لی اور کرسی کی پشت سے لگ گیا۔

”کیوں! کیا آپ بھی اس عورت کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔“ حمید اُسے گھورنے لگا۔

”ناصر کے پاگل پن کی وجہ ایک عورت ہی ہے۔“

”کون!“

”کوئی پروفیسر شوخ ہے..... اُس کی بیوی۔“

”لیکن ناصر صاحب کو یہ حادثہ کیسے پیش آیا۔“

”میں نہیں جانتا۔“ بوڑھا بُرا سامنہ بنا کر بولا۔ ”اس کے چچا زاد بھائی کو بھیجتا ہوں وہ بتائے گا۔“

بوڑھا ڈرائنگ روم سے چلا گیا اور حمید بُرا سامنہ بنائے بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ایک خوش پوش نوجوان اندر آیا۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ رہی۔

”صورت ہی سے کھنڈرا اور غیر سنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔“

”کیا آپ ہی مجھے ناصر کے متعلق بتائیں گے۔“

”جی ہاں! لیکن اس سے پہلے میں آپ کے بکرے کی خیریت پوچھوں گا۔“ نوجوان

کر بولا۔ ”کیونکہ میرا بکرا بھی ایسی ایشن کا ممبر ہے۔“

”لیکن میں اس وقت بکروں کے لئے خیر سگالی کے مشن پر نہیں آیا ہوں۔“ حمید نے

غصیلے لہجے میں کہا اور نوجوان ایک بیک سنجیدہ ہو گیا۔

”آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”ناصر نے آپ کو بیگم شوخ کے متعلق کیا بتایا تھا۔“

”یہی کہ وہ ایک قاتلہ عالم ہے۔ قدم قدم پر فتنے جگاتی ہے۔“

”صاحبزادے مجھے شاعری سے دلچسپی نہیں ہے۔“

”یہی بتایا تھا ناصر بھائی نے یقین کیجئے۔“

”ان کا دماغ کس طرح الٹ گیا۔“

”انہوں نے ایک واقعہ بتایا تو تھا مگر مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ پھر جب دو دن بعد وہ پاگل

ہو گئے تو یقین کرنا ہی پڑا۔“

”واقعہ بتاؤ دوست۔“ حمید اُسے چکار کر بولا۔

”ایک رات وہ دونوں نیا گرا کے ایک فیملی کیمپ میں تھے۔ بھائی ناصر نے تھوڑی سی پی

رکھی تھی، لہذا موج میں تھے۔ انہوں نے اُس سے محبت کرنی چاہی لیکن اس پر کھانسیوں کا دورہ

پڑ گیا اور اسی دوران میں اس کے منہ سے ایک سانپ کا بچہ نکل کر میز پر رینگنے لگا۔ بھائی ناصر کا

بیان ہے کہ انہوں نے اسے فوراً ہی مار ڈالا لیکن وہ خود بُری طرح خائف ہو گئے تھے۔ عورت

غٹھال ہو گئی تھی۔ جب بھائی ناصر نے اُس سے اس کے متعلق پوچھا تو وہ ہونے لگی۔ اس نے

کچھ بھی نہیں بتایا مگر برابر یہی کہتی رہی کہ مجھ سے دور بھاگو۔ میرا خیال دل سے نکال دو۔ میں

ایک بد نصیب عورت ہوں..... جاؤ۔“

”پھر.....!“

”پھر یہ کہ بھائی ناصر کی محبت تو پہلے ہی ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ انہوں نے گھر کی راہ لی۔ دو

دن تک بور ہوتے رہے پھر پاگل ہو گئے۔ منہ سے نکلنے والے سانپ نے اُن کے ذہن پر

بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔“

”تم نے دیکھا ہے اس عورت کو۔“

”دیکھنے کی خواہش ضرور رکھتا ہوں۔“

”سنفل ہاسپٹل میں پاگل ہو جانے کی وجہ درج کرائی گئی ہے۔“

”بات کا منظر بننے کے خیال سے اصلیت چھپائی گئی ہے۔“ نوجوان نے کہا۔

”لہذا اب یہ بات بھی چھپائی ہی پڑے گی کہ محکمہ سراغ رسانی اس عورت میں دلچسپی

رہا ہے۔“

”محکمہ سراغ رسانی یا صرف آپ..... معاف کیجئے گا۔ میں ذرا بے تکلف ہو رہا ہوں بھی پاگل ہو چکا ہوتا۔“

”خیر..... شکریہ۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”اسکا تذکرہ آپ لوگ کسی سے نہیں کریں گے۔“

اب اس کی کارپرو فیسر شوخ کی قیام گاہ کی طرف جاری تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اُن

دونوں سے کس طرح پیش آئے۔ بیگم شوخ معہ بنتی جاری تھی۔ جیسے ہی اس کی کار عمارت کی

کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی سامنے والی کھڑکی سے ایک سر باہر نکلا۔ یہ پرو فیسر شوخ کے علاوہ اور

کوئی نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کھڑکی سے جست لگائی اور باہر چلا آیا۔

”دیکھئے..... دیکھئے۔“ وہ ہاتھ ہلا کر چیخا۔ ”بائیں جانب موڑ کر پارک کیجئے ورنہ لان تباہ

ہو جائے گا۔“

حمید نے اس کی ہدایت کے مطابق کار بائیں جانب روٹ پر موڑ کر انجن بند کر دیا۔

پرو فیسر شوخ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

حمید کار سے اتر کر اسکی طرف بڑھا۔ پرو فیسر اس طرح پلکیں جھپکا کہ اُسے پہچاننے

کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن پھر مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

”کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں آپ کے بھتیجے کی خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔“

”میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔“ بھتیجے کی نامک ٹوٹ گئی ہے اس وقت سو رہا ہے۔ مورفیا

کے انکشن کے بغیر وہ سو نہیں سکتا۔ کیا آپ اس کے دوستوں میں سے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ

اس سے پہلے بھی مختلف قسم کی حرکتیں کرتے رہے ہیں..... مگر!“

”مگر کیا؟“

”مگر آپ اُسی عورت کے سلسلے میں ان سے ملنے آئے ہیں۔“

”ہاں! اور اس کے متعلق آپ جتنی زیادہ معلومات فراہم کر سکیں بہتر ہے۔“

اس سے زیادہ اور کچھ نہ بتا سکوں گا۔“

”اس عورت کا پتہ بتایا تھا ناصر صاحب نے۔“

”نہیں کپتان صاحب۔“ نوجوان نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”ورنہ اب تک میں

”محکمہ سراغ رسانی یا صرف آپ..... معاف کیجئے گا۔ میں ذرا بے تکلف ہو رہا ہوں بھی پاگل ہو چکا ہوتا۔“

”خیر..... شکریہ۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”اسکا تذکرہ آپ لوگ کسی سے نہیں کریں گے۔“

اب اس کی کارپرو فیسر شوخ کی قیام گاہ کی طرف جاری تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اُن

دونوں سے کس طرح پیش آئے۔ بیگم شوخ معہ بنتی جاری تھی۔ جیسے ہی اس کی کار عمارت کی

کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی سامنے والی کھڑکی سے ایک سر باہر نکلا۔ یہ پرو فیسر شوخ کے علاوہ اور

کوئی نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کھڑکی سے جست لگائی اور باہر چلا آیا۔

”دیکھئے..... دیکھئے۔“ وہ ہاتھ ہلا کر چیخا۔ ”بائیں جانب موڑ کر پارک کیجئے ورنہ لان تباہ

ہو جائے گا۔“

حمید نے اس کی ہدایت کے مطابق کار بائیں جانب روٹ پر موڑ کر انجن بند کر دیا۔

پرو فیسر شوخ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

حمید کار سے اتر کر اسکی طرف بڑھا۔ پرو فیسر اس طرح پلکیں جھپکا کہ اُسے پہچاننے

کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن پھر مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

”کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں آپ کے بھتیجے کی خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔“

”میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔“ بھتیجے کی نامک ٹوٹ گئی ہے اس وقت سو رہا ہے۔ مورفیا

کے انکشن کے بغیر وہ سو نہیں سکتا۔ کیا آپ اس کے دوستوں میں سے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ

میں پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھ چکا ہوں۔“

لنگن خرید سکتی۔“

”آپ چار خرید سکتی ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے..... مگر پروفیسر.....!“

حمید نے اُس سے جملہ پورا کرنے کی استدعا نہیں کی۔ وہ اُسے ایک شاندار اسٹڈی میں

لائی۔ کچھ دیر تک دونوں ہی خاموشی سے بیٹھے ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر حمید بولا۔

”میں ایک شخص کے متعلق معلومات فراہم کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی.....!“ وہ چونک پڑی۔

”ناصر.....!“ حمید اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”کون ناصر.....!“

”وہی..... ناصر..... جسے نیا گره میں منہ سے نکلنے والے سانپ کی پوجا کرنی پڑی تھی۔“

”اوہ.....!“ دفعتاً اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلکیاں نظر آئیں لیکن پھر شاندار اس نے

اپنے اعصاب پر قابو پایا اور اُس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیا آپ کوئی دلچسپ داستان سنائیں گے۔“

”اگر آپ اُسے دلچسپ سمجھ سکیں۔“

”شروع ہو جائیے۔“

حمید آنکھیں بند کر کے مسکرایا۔ اُس نے یک بیک اپنا پورا پلان بدل دیا تھا۔

”صنوبر کے سائے تلے۔“ وہ آنکھیں کھولے بغیر بولا۔ ”مگر نہیں..... میں غلط کہہ رہا

ہوں۔ وہ تو نیا گره کاریکریشن ہال تھا..... جہاں پہلے پھل..... ہا.....!“

حمید آنکھیں کھول کر مرٹنے والے انداز میں مسکرایا۔ پھر بولا۔ ”مگر آپ اس وقت

اشاروں ہی اشاروں میں میری خوشامدیوں کیوں کر رہی تھیں۔“

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کہیں آپ اُس سوئی کا تذکرہ

پروفیسر سے نہ کر دیں۔“

”بچھلی رات نیا گره میں۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”ہم دونوں پنگ پاگ کھیل رہے تھے۔“

”تب تو آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے..... وہ کوئی اور ہوگا۔“

”کیا آپ پروفیسر شوخ نہیں ہیں۔“

”میرے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“

”کیا بچھلی رات ہم ایک سیٹ نہیں کھیلے تھے۔“

”خدا جانے مجھے تو یاد نہیں۔“ پروفیسر نے جھنجھلا کر کہا۔

اتنے میں اچانک حمید کی نظر سامنے اٹھ گئی۔ مز شوخ برآمدے میں کھڑی اُسے اشار

کر رہی تھی۔ پروفیسر کی پشت برآمدے کی طرف تھی۔

مز شوخ کبھی حمید کو بلاتی کبھی ہاتھ جوڑتی۔ پھر برآمدے سے اتر کر ان کی طرف تیز

سے بڑھی۔

”اوہ..... ہلو..... کیپٹن۔“ اس نے پر اشتیاق لہجے میں حمید کو مخاطب کیا۔

”ارے..... ہاں..... آپ کیپٹن جمد ہیں۔ بچھلی رات ہم نے نیا گره میں ساتھ کا

کھایا تھا۔“

”اوہ..... لاجول ولا قوۃ۔“ پروفیسر نے برا سامنے بنا کر کہا۔ ”یہ حضرت فرما رہے تھے

میں ان کے ساتھ بچھلی رات وہاں پنگ پاگ کھلتا رہا۔“

”بہت دلچسپ آدی ہیں ڈیر۔“

پروفیسر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتا ہوا گلاب کی پتی..... اس طرف چلا گیا۔

اس طرح ایک پیلے اٹھا کر مٹی کی تھیں اٹھنے لگا جیسے حمید کی آمد سے قبل وہ یہی کام کرتا رہا تھا۔

”آئیے..... اندر چلے۔“ مز شوخ حمید کا ہاتھ پکڑ کر عمارت کی طرف کھینچتی ہوئی بولی۔

حمید خاموشی سے چلتا رہا۔

”آپ کی گاڑی بڑی شاندار ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”کاش میں بھی ایک ایئر کنڈیشن

”دیکھئے نہ تو میں آپ کو اس کے متعلق کچھ بتا سکتی ہوں..... اور نہ.....!“
 ”ناصر پاگل ہو گیا ہے اور مغل ہاسٹل میں ہے۔ اُس کے اعزہ عنقریب آپ لوگوں پر

”میں اُسے انواہ ثابت کر سکتی ہوں۔“ اُس نے کہا اور پھر اس طرح زرد پڑ گئی جیسے اچھڑا ہوا دوڑیں گے۔ وہ بھی اونچے ہی طبع کے لوگ ہیں۔“

”یہ بات بُری ہوگی۔“ بیگم شوخ نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”بات ختم بھی ہو سکتی ہے۔“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”مگر.....!“
 ”مگر کیا.....؟“

”اس کے متعلق سب کچھ میرے علم میں آنا چاہئے۔“

”مزر شوخ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔“ لیکن زبان میرا ساتھ نہ دے تو!“
 اُس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آرہے تھے اور چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
 ”زبان ضرور ساتھ دے گی۔“

”میرے خدا میں کیا کروں۔“ بیگم شوخ نے کچھ ایسے انداز میں کہا جیسے ابھی اپنے
 کپڑے چیر پھاڑ کر دیوانہ وار باہر نکل جائے گی۔

ٹھیک اُسی وقت ایک آدھی اسٹڈی میں داخل ہوا جس کے دونوں ہاتھوں میں کسی جانور
 کی بڑی بڑی ہڈیاں تھیں۔ اسکے بعد ہی پروفیسر بھی اندر آیا۔ اسکے ہاتھوں میں اب بھی بیلچہ تھا۔

”بیگم.....!“ اُس نے پُرسرت لہجے میں کہا۔ ”یہ ذرا..... دیکھو..... یہ ہڈیاں.....
 ابھی ابھی گلابوں کی ایک کیاری سے برآمد ہوئی ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ کم از کم پانچ سو سال
 پرانی ضرور ہیں۔“

”ہوں گی.....!“ بڑی لاپرواہی سے کہا گیا۔

”انہیں میں اپنی خواب گاہ میں لٹکاؤں گا۔“

”میرا موڈ اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس کی بیوی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”کیا خیال ہے آپ کا۔“ پروفیسر حمید سے مخاطب ہو گیا۔

”کیا ان ہڈیوں کے ساتھ کوئی تحریر نہیں برآمد ہوئی۔“ حمید نے پوچھا۔

”چلے میں نے نہیں کیا۔“ حمید بولا۔ ”لیکن اُس سانپ کی داستان بڑی بُری طرح بچل
 رہی ہے۔ اگر پروفیسر کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچی تو کیا ہوگا۔“

”میں اُسے انواہ ثابت کر سکتی ہوں۔“ اُس نے کہا اور پھر اس طرح زرد پڑ گئی جیسے اچھڑا ہوا دوڑیں گے۔ وہ بھی اونچے ہی طبع کے لوگ ہیں۔“
 جملہ نادانگی میں زبان سے نکل گیا ہو۔

”خیر اسے آپ انواہ ثابت کر سکتی ہیں۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔ ”لیکن وہ سارا
 زندگی بھر میرے دل میں پیوست رہے گی۔“

”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔“
 ”میں صرف کیوترا اڑاتا ہوں بشرطیکہ وہ گروہ باز ہوں۔“

”پھر آپ کس لئے تعریف لائے ہیں۔“
 ”آپ کے بھتیجے داؤد کی خیریت دریافت کرنے کے لئے۔“

”ہڈی ہڈی جوڑ دی گئی ہے اور وہ اس وقت مورفیا کے زیر اثر ہے۔ مگر آپ ناصر
 متعلق کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“

”آپ جانتی ہیں اُسے۔“
 ”ہاں میں اُسے جانتی ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ اُسے ایک خیر انگیز واقعہ سے“

”ہونا پڑا تھا۔“
 ”تو یہ حقیقت ہے کہ سانپ آپ کے منہ سے نکلا تھا۔“

”حقیقت ہے۔“
 ”خدا کی پناہ..... محاورہ غلط ہو گیا۔“

”کیسا محاورہ!“
 ”آستین میں سانپ پالنا سنا تھا..... مگر پیٹ میں۔“

”بس خاموش رہئے۔ میرے ہی گھر میں بیٹھ کر آپ میرا مسخہ نہیں اڑا سکتے۔“
 ”میں مسخہ نہیں اڑا رہا ہوں بلکہ خود بھی آپ کا یہ کمال دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں تو..... تحریر کیوں؟“

”ایسی چیزوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی تحریر بھی نکلا کرتی ہے۔ مثلاً میرے دادا جان ایک امرود کے کھیت میں.....!“

”امرود کے کھیت.....!“ پروفیسر نے حیرت سے دہرایا۔

”جی ہاں..... ہماری طرف امرود کے کھیت ہی ہوتے ہیں۔“

”یہ آپ کی طرف کدھر ہوتی ہے۔“ پروفیسر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”اُدھر ہی جدھر پروفیسروں کا سورج غروب ہوتا ہے۔ آج کل میں نباتات پر رہ رہ کر رہا ہوں اور عنقریب مجھے پانچویں ڈاکٹریٹ مل جائے گی اور آپ یہ ہڈیاں کیا لئے پھر رہے ہیں۔ آپ یہ تک تو بتا نہیں سکتے کہ یہ شجرۃ الجن کی ہڈیاں ہیں یا شاہ بلوط کی۔“

”ہائیں..... ہائیں.....!“ پروفیسر آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا اور اس کی بیوی اسٹڈی چلی گئی۔

”جہالت کی باتیں نہ کرو۔“ پروفیسر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا

”آپ کب عقلندی کی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر آپ مجھے زیادہ بور کریں گے تو میرے منہ سے سانپ نکل پڑے گا۔“

”یار تمہارے دماغ میں فتور معلوم ہوتا ہے۔“ پروفیسر آنکھیں نکال کر بولا۔

”دنیا کے سارے بڑے آدمیوں کے متعلق عام آدمی یہی خیال رکھتے ہیں۔“

”میں عام آدمی ہوں۔“ پروفیسر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”آم کیا میں آپ کو امرود بھی نہیں سمجھتا۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

”بیٹھو..... بیٹھو۔“ پروفیسر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں تمہارے دماغ کے کیڑے جھاڑوں؟“

”گلاب کے پودوں کے کیڑے آپ کو زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

اسٹڈی سے نکل آیا۔

پروفیسر کی بیوی پہلے ہی جا چکی تھی لہذا یہاں بیٹھنا دماغ کے کیڑے ہی جھڑوانے

مترادف ہوتا مگر اتنی گفتگو کے بعد یہ عورت اور زیادہ معمہ بن گئی تھی۔

حمید لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا لیکن اُسے چونکنا پڑا کیونکہ پروفیسر کی حسین ترین بیوی پچھلی نشست پر نیم دراز تھی۔ اُس نے نیم باز آنکھوں سے حمید کی طرف دیکھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

حمید اندر بیٹھ کر انجن اشارت کر چکا تھا۔

کار پھاٹک سے سڑک پر نکل آئی لیکن وہ اسی طرح پچھلی سیٹ پر پڑی رہی۔ حمید بھی کچھ نہیں بولا۔ البتہ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

دفتر بیگم شوخ نے کہا۔ ”مجھے کسی ایسی جگہ لے چلے جہاں چھت نہ ہو۔ دیواریں نہ ہوں۔ درخت نہ ہوں۔ جھاڑیاں نہ ہوں۔ کسی چٹیل میدان میں لے چلے۔ میں بھی آج

استحان کرنا چاہتی ہوں۔ تنگ آگئی ہوں اپنی زندگی سے۔“

”میں کچھ سمجھ نہیں محترمہ۔“

”آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے جو کچھ میں کہہ رہی ہوں کیجئے۔“

”چٹیل میدان میں لے چلوں۔“

”ہاں..... جہاں ہم میلوں تک دیکھ سکیں۔ اپنے گرد و پیش آسانی سے نظر دوڑا سکیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے ایک طویل سانس لی۔

”آپ نے اس وقت پھر پروفیسر کی توہین کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”وہ بالکل ذفر ہے۔“ حمید نے کہا۔

”دیکھیے آپ میری بھی توہین کر رہے ہیں۔ وہ میرے شوہر ہیں۔“

”اگر وہ میرے شوہر ہوتے تو میں انہیں زہر دے کر بقیہ زندگی بجات بیوگی گزار دیتا۔“

”نہیں آپ ایسا نہیں کہہ سکتے۔ خدا کے لئے خاموش رہئے۔“

”تو وہ آپ ہی کا انتخاب ہے۔“

”سو فیصدی۔“

”کیا میں اس انتخاب کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“

”اگر کوئی عورت پوچھتی تو بتا دیتی۔“

”مجھے بھی مرد نہ سمجھئے۔“

”اگر آپ ہیں تو ضرور سمجھ جائیں گے۔“

”ہٹائیے یہ ایک فضول بحث ہے۔“ حمید نے کہا۔ وہ اپنی کار جھریالی کے میدان کی

طرف لے جا رہا تھا۔

”پچھلی رات آپ کے ساتھ وہ دیوڑا کون تھا۔“ بیگم شوخ نے پوچھا۔

”آپ ہی کے گرفتاروں میں سے ایک۔“

”آپ نہ جانے کیسے آ دی ہیں۔“ وہ بگڑ گئی۔ ”شریف اور بازاری عورتوں میں فرق نہیں

کر سکتے۔ کیا گفتگو کا یہی طریقہ ہے۔“

”معاف کیجئے گا۔ آپ سمجھیں نہیں۔ وہ بھی ناصر کے عزیزوں میں سے ہے۔ آج جب

اُسے سانپ والا واقعہ معلوم ہوا تو اُسکے دیوتا کوچ کر گئے اب وہ پیٹ کے درد میں مبتلا ہے۔“

”لیکن آپ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔“

”ہم لوگ اگر ایسی باتوں سے متاثر ہونے لگیں تو پورا شہر ایک دن میں فنا ہو جائے۔“

”اوہ..... یہ میدان..... یہ میدان..... بالکل ٹھیک ہے۔“ دفعتاً وہ پرمسرت لہجے میں

بولی۔ کار جھریالی کے میدان میں داخل ہو رہی تھی۔

”بس اب روک دیجئے۔“ بیگم شوخ نے کہا۔

حمید نے کار روک دی اور بیگم شوخ اس سے پہلے ہی نیچے اتر گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ

کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

حمید اُسے متحیرانہ انداز میں گھورتا ہوا نیچے اتر آیا۔

”میں شیطان کی محبوبہ ہوں۔“ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

”میں جب بھی اُس کا راز ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو مجھ پر کوئی نہ کوئی مصیبت

ٹوٹ پڑتی ہے۔ پچھلی رات والی سوئی ایسی ایک مصیبت تھی۔ اگر کوئی مجھ سے عشق جتانے کی

کوشش کرے۔ تو وہ اس بُری طرح ڈرایا جاتا ہے کہ پاگل ہو جاتا ہے۔“

پھر وہ آنکھیں کھول کر ہنسنے لگی لیکن ساتھ ہی خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتی بھی

جاری تھی۔

”لیکن اس وقت مجھ پر کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی اور تم مجھ سے اظہار محبت کر کے دیکھ لو۔“

حمید سناٹے میں آ گیا۔ وہ تو صرف چھوڑ چھاڑ کا رسیا تھا۔

”مم..... میں..... نہیں سمجھا۔“ وہ ہانپنے لگا۔

”بس صرف اتنا کہہ دو کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“

”اس سے فائدہ۔“

”تجربے کے طور پر..... ورنہ میں ایک شریف عورت ہوں اور ایسی باتوں کو مزا جاتا بھی

نہیں برداشت کر سکتی..... کہہ دو..... صرف کہنے کی خاطر۔“

”مجھے تم سے محبت ہے۔“ حمید خود کو چند محسوس کرنے لگا۔

بیگم شوخ نے پھر چاروں طرف دیکھا اور بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

”اور اگر میں اسی طرح رونا شروع کر دوں تو۔“ حمید نے جھینپ کر کہا۔

”میں لوریاں گا کہ تمہیں سلا دوں گی۔ آؤ اب واپس چلیں کام ہو گیا۔“

حمید آنکھیں پھاڑے اُسے گھورتا رہا۔

پراسرار ذرات

”میں سب کچھ بتا دوں گی۔ اب مجھے اس سے خوف نہیں معلوم ہوتا۔ وہ کوئی آ دی ہی

ہے۔ انتہائی چالاک اور پراسرار آ دی۔“ مسز شوخ نے کہا۔

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”میرا نام حمید ہے محترمہ۔“
 ”اب پھر آپ اعلان جنگ کرنے والے ہیں۔“ عورت مسکرائی۔ ”میں آپ کو مطمئن کر دوں گی۔“

اُس نے آگے بڑھ کر گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔
 ”کیا مجھے اب اپنی گاڑی میں میٹر لگانا پڑے گا۔“ حمید نے اندر بیٹھ کر مشین اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کرایہ ادا کر دوں۔“ وہ بڑے دلاویز انداز میں مسکرائی۔
 حمید کچھ نہیں بولا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عورت کو کیا سمجھے۔ لیکن اس باتوں کو مجذوب کی بڑ سمجھنے پر بھی تیار نہیں تھا۔

گاڑی کچے راستوں کے جال سے نکل کر پختہ سڑک پر آ گئی تھی۔ مسز شوخ نے کہا۔ ”اُم! اپنی بکواس جاری رکھی تو آپ مجھے نوچنے کھوٹنے کی کوشش نہیں کریں گی۔ اس لئے مجھے بکنے میرے منہ سے سانپ کا بچہ نکلا تھا تو کیا یہ کوئی جرم ہے۔“
 ”قطعی نہیں۔۔۔ اگر آپ کے منہ سے ہاتھی کا بچہ نکلے تب بھی قانون کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔“
 ”اگر میں نے خود ہی اپنی پنڈلی میں ایک سوئی چھو رکھی تھی تو آپ مجھ پر کون سی فردوز عائد کریں گے۔“

”پاگل پن اور آپ جانتی ہیں کہ قانون نے پاگلوں کیلئے جیل میں کوئی جگہ نہیں رکھی۔“
 ”بس تو پھر میں یہ ضروری نہیں سمجھتی کہ آپ کو حالات سے آگاہ کیا جائے۔ یہ میرے معاملات ہیں۔“

”میں آپ کو مجبور نہیں کرتا کہ مجھے آگاہ کیجئے۔ ناصر کے اعزہ آپ سے سمجھ لیں گے۔“
 ان کا خیال ہے کہ آپ نے اُسے کچھ کھلا دیا ہے۔“

”کیا کھلا دیا ہے۔“
 ”کوئی ایسی زہریلی چیز جس سے دماغ ماؤف ہو جائے۔“
 ”اس کے لئے انہیں طبی ثبوت پیش کرنا پڑے گا۔“

”ہٹائیے۔۔۔۔۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی۔“
 ”پھر کیوں دوڑے آئے۔“
 ”غلطی ہوئی تھی۔ آپ صرف ہسپتال کی مریض ہو سکتی ہیں اور اس کی لئے جواز بھی موجود ہے۔ بڑھوں کی جوان بیویاں اکثر اس مرض میں مبتلا پائی گئی ہیں۔“
 ”بکواس ہے۔۔۔۔۔! وہ غصیلے لہجے میں بولی۔
 ”میں آپ کی باتوں کا بُرا نہیں مان سکتا کیونکہ آپ اس وقت بھی دورے ہی کی حالت میں ہیں۔“

”آپ اپنی زبان بند رکھیں تو بہتر ہے۔“
 ”نہیں میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتا کیونکہ دورہ شدید نہیں ہے یعنی اگر میں نے اپنی بکواس جاری رکھی تو آپ مجھے نوچنے کھوٹنے کی کوشش نہیں کریں گی۔ اس لئے مجھے بکنے دیجئے۔ اب کہاں چلوں۔۔۔۔۔ نیا گرا۔۔۔۔۔ یا کہیں اور۔“

”میں گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے نا خوشگوار لہجے میں کہا۔
 ”یہ ناممکن ہے۔ آپ نے میرا وقت برباد کیا ہے۔“
 ”پھر آپ کیا کریں گے۔“

”کچھ دیر میں بھی آپ کا وقت برباد کرونگا۔ اگر کہئے تو پروفیسر کا مستقبل بھی برباد کر دوں۔“
 ”آپ سے میں عاجز آ گئی ہوں لیکن کیا آپ دوسرے جملے کی وضاحت کریں گے۔“
 ”یہی کہ آپ کے چہرے پر تیزاب ڈال دوں۔“ حمید نے ہونٹ سکڑ کر کہا اور وہ سہم کر ایک طرف سٹ گئی۔

حمید پھر بولا۔ ”آپ بے حد حسین ہیں اور میں دنیا کی ہر حسین عورت کا چہرہ بگاڑ دیتا چاہتا ہوں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔
 ”ایک بار ایک بد صورت عورت نے مجھے اس کی استدعا کی تھی۔“

”نہیں ہے۔“

”آپ نے اس سوئی کے متعلق کیا خیال ظاہر کیا تھا۔“

”یہی کہ وہ کسی مشین کے ذریعہ پھینکی گئی ہوگی۔“

”اس کے متعلق اب میرا بھی یہی نظریہ ہے۔ ممکن ہے ہم لوگوں کا مل بیٹھنا اُسے گراں

”گذرا ہو۔“

”مگر منہ سے نکلنے والے سانپ۔“ حمید نے سوال کیا۔

”میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ میرے حلق سے ہی نکلا تھا۔ ہو سکتا ہے کہیں دوسری

طرف سے آیا ہو۔ ناصر گستاخ و بیباک ہو چلا تھا۔ ٹھیک اسی وقت سانپ والا واقعہ پیش آیا۔

کون جانے شیطان کو اُس کی بیباکی گراں گزری ہو۔ مگر.....!“ عورت خاموش ہو گئی۔

”آپ جملہ پورا کرنا بھول گئی ہیں شاید۔“ حمید نے اُسے ٹوکا۔

”میں سو جتی ہوں اگر کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہے تو پھر کیا دن رات میرے پیچھے

ی لگا رہتا ہے۔ اُسے دنیا کا اور کوئی کام نہیں ہے۔“

”عشق بجائے خود ایک بہت بڑا کام ہے۔ کیا آپ نے وہ شعر نہیں سنا۔“

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد

ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

”آپ پھر مضحکہ اڑانے لگے۔“ عورت جھلا گئی۔

”میں تو چارہ سازی کر رہا تھا۔ عاشقوں کے چار ساز بھی تو ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں

اگر نہ ہوں تو عاشقوں کے سامنے گھاس کون ڈالے۔“

”میں گھر جاؤں گی۔“

”تہائی سے ہمیشہ دور بھاگتے رہنا آ۔ کہ بھی اُس شکار سے عشق نہ ہو۔“

”مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسا کہ میں نے اُسے شالہ کے کھانا دینے کے وقت محسوس کیا تھا۔“

تا خوشگوار لہجے میں کہا اور محمد زحیدہ کو ایک اشارہ کی طرف دیکھا۔

”جب عاشقوں کی باتیں سن کر وہ بے وقت و فکر ہو گیا۔

”آپ بے شرم ہیں۔“ عورت کی آواز غصہ سے کانپ رہی تھی۔

”باشرم عاشق تو کوئی مولوی ہی ہو سکتا ہے۔“

”میں آپ کے خلاف کیس دائر کروں گی۔ آپ اتنے دنوں تک مجھے خواہ مخواہ پریشان کرتے رہے۔“

”عاشقوں کو پھانسی نہیں ہوا کرتی۔“

”آپ بدتمیز ہیں۔ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔“

”آپ کچھ بھی کہئے۔ میرا سایہ آپ کی قبر تک جائے گا۔“

”میں چیخنا شروع کر دوں گی۔“

”یہاں دور دور تک آدمیوں کا پتہ نہیں ہے۔ ویسے اگر آپ ان درختوں کو محظوظ ہاتھ بھی اٹھے جن میں ریوا اور تھے اور ان کے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔“

چاہتی ہوں تو مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں ہو سکتا۔“

”کار روک دو۔“ عورت نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

حمید نے کار روک دی۔

”تم میرا کچھ نہیں کر سکتے۔“ عورت اُسے گھورتی ہوئی بولی۔

”میں کب کہتا ہوں کہ کر سکتا ہوں۔“

”پھر یہ سب کیا ہے۔“

”اس کا جواب وہی آدمی دے سکے گا جو اس وقت پاگل خانے میں ہے۔“

”ناصر.....!“

”ہاں وہی.....!“

”تمہیں پاگل خانے میں ہونا چاہئے تھا۔“ عورت نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”مجھے کیوں ہونا چاہئے جبکہ میں ابھی تک نہ تو گستاخ ہوا ہوں اور نہ بیباک۔“

”تم اتنے دنوں تک مجھے خواہ مخواہ ڈراتے اور سہاتے رہے۔ تمہارے لکھے ہوئے

میں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“

”ہوش میں آئے محترمہ۔ آپ ایک سرکاری آفیسر سے گفتگو کر رہی ہیں۔“

عورت کی آنکھوں میں پھر الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔

”تو وہ آدمی آپ نہیں ہیں جو مجھے پریشان کرتا رہا ہے۔“

”پتہ نہیں کس آدمی کی طرف اشارہ ہے آپ کا۔ ویسے پچھلی رات سے شاید میں بھی

آپ کو پریشان کر رہا ہوں۔“

جہاں کارر کی تھی اُس کے دونوں طرف نشیب تھا اور پھر دور تک جوار کے گھنے کھیتوں

کے سلسلے شروع ہو گئے تھے۔

اچانک دونوں اطراف کی ڈھلانوں سے کچھ آدمیوں نے سر اٹھارے۔ ساتھ ہی اُن کے

حمید اپنا سر سہلانے لگا کیونکہ وہ بالکل نہبتا تھا۔

وہ لوگ سڑک پر پہنچ کر کار کو زرنے میں لے چکے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی عورت کا

شانہ جھنجھوڑ کر غصیلے لہجے میں بولا۔ ”سلیمہ تم نہیں باز آؤ گی۔“

”مم..... میں..... نن.....!“ سلیمہ ہکلا کر رہ گئی۔

”ہاں تم نہیں جانتیں کہ میں کون ہوں۔ لیکن کیا تم اس تنبیہ کو مذاق سمجھتی تھیں۔“

سلیمہ خاموش رہی۔ اُس آدمی نے پھر کہا۔ ”میں تمہیں کسی دوسرے کیساتھ نہیں دیکھ سکتا۔“

”پروفیسر کے متعلق کیا خیال ہے۔“ حمید بول پڑا۔

”تم خاموش بیٹھے رہو۔“ وہ آدمی گرج کر بولا۔ ”میں بہت زیادہ خون بہانے کا عادی

نہیں ہوں ورنہ یہاں تمہاری لاش تڑپتی نظر آتی..... سلیمہ میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔“

”میں نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں۔“ سلیمہ ہانپتی ہوئی بولی۔

”میں کوئی بھی ہوں لیکن تمہیں اپنا پابند دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”مگ..... مگ..... مگر.....!“

”کسی سرکاری سراغ رساں سے تمہارا گٹھ جوڑ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر تم اسے کسی

قابل سمجھتی ہو تو میں تمہیں اس کی موجودگی میں کھینچ لے جاؤں گا۔“

غارت کرے گا۔“

”اچھا اب تم اپنی زبان بند کرو۔“ حمید کو غصہ آ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس کا ارادہ ظاہر کر دے گا۔“

”اتار لو اس عورت کو۔“ اس آدمی نے گرج کر کہا اور سلیمہ بڑی بے بسی سے ”نہیں“

کرنے لگی لیکن ان لوگوں نے اسے کھینچ کر اتار ہی لیا۔ وہ مری طرح کانپ رہی تھی اور اس کے سر پیچھے ہٹا کر اس کے ریاور پر ہاتھ ڈال دیا۔ پھر دو تین جھٹکوں کے بعد حمید نے اس کا پر جب اپنے پاس بچاؤ کے لئے کچھ بھی نہ ہو دیری دکھانا حماقت ہی ہے۔ ہاں اگر حکمت! ریاور جھین لیا اور وہ آدمی اس سے ہاتھ چھینا کر بھاگا جتنی دیر میں وہ کار سے اترتا وہ آدمی کوئی نئی راہ دکھا دے تو دوسری بات ہے۔ وہ نہتا تھا اور ان کی تعداد آٹھ تھی اور آٹھ خلیب میں چھلانگ لگا چکا تھا۔

ریاوروں کی نالیں اس کے لئے اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتی تھیں لیکن خود حمید اپنا جسم چھپاتی کر۔ حمید بھی ادھر ہی لپکا لیکن پھر وہ جوار کے کھیتوں کو برا بھلا کہنے لگا جن میں کھڑی ہوئی کالدادہ نہیں تھا اس لئے وہ نہایت خاموشی سے بیٹھا رہا۔

اگر وہ کار کے باہر ہوتا تو شاید خاموشی اسے گراں گزرنے لگتی اور وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر گزرتا مگر اس صورت میں تو کار سے اترتے اترتے وہ دوسری دنیا کا سفر کر سکتا تھا۔

سلیمہ کو زمین پر گرا کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے۔ منہ میں کیڑا ٹھونسا گیا اور وہ ایسے خوفزدہ پرندے کی طرح بے بس باہتی رہی جو باز کے چنگل میں جا پھنسا ہو۔ حمید کی کپٹی سے ابھی تک ریاور کی نال لگی ہوئی تھی۔ دو آدمیوں نے سلیمہ کو اٹھایا۔

بائیں جانب والے خلیب میں اتر گئے۔

ان کے بعد ہی دوسروں نے بھی ادھر ہی چھلانگیں لگائیں لیکن وہ آدمی بدستور وہیں رہا جس نے حمید کی کپٹی سے ریاور کی نال لگا رکھی تھی۔

”اب کیا ارادہ ہے۔“ حمید نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں بس اتنی دیر اور کہ وہ لوگ ایک خاص مقام تک پہنچ جائیں۔“

”یہ عورت واقعی بہت حسین ہے۔“ حمید نے کہا۔

وہ آدمی کچھ نہ بولا۔ حمید کہتا رہا۔ ”اگر تم لوگوں نے اسے کوئی تکلیف پہنچائی تو خدا تمہیں

کیونکہ حمید کے خیال کے مطابق کسی نے ان کا تعاقب بھی نہیں کیا تھا۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں گھر تک پہنچ گیا جیسے ہی کپاؤنڈ میں کارپینچی اُسے چکر سے آنے لگا کیونکہ برآمدے میں اُسے فریدی دکھائی دیا جو ایک نوکر سے کچھ کہہ رہا تھا۔
وہ تین دن بعد گھر واپس آیا تھا۔ حمید کارگیراج کی طرف لیتا چلا گیا۔ واپسی پر بھی
نے فریدی کو برآمدے ہی میں موجود پایا۔

”کیوں؟ کیا قصہ ہے؟“ فریدی اُسے نیچے سے اوپر تک دیکھتا ہوا بولا۔ ”تمہار
چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔“

”کچھ نہیں.....!“ حمید زبردستی ہنسا۔ ”آپ کہاں تھے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ اندر جانے کے لئے مڑ گیا تھا۔ حمید سوچنے لگا کہ فریدی کو
واقعہ کی اطلاع دے یا نہ دے۔ کافی سوچ بچار کے بعد اُس نے طے کیا کہ اُسے خاموش
رہنا چاہئے۔ ممکن ہے سلیہ اب تک گھر بھی پہنچ چکی ہو۔ اگر مقصد اس کا انواء ہوتا تو آج تک
ضروری تھا۔ یہ کام اس سے پہلے ہی ہو چکا ہوتا۔ ممکن ہے مجرموں نے اُسے وقتی طور
چڑھانے اور اشغال دلانے کے لئے ایسا کیا ہو۔

وہ اندر آیا۔ یہاں نوکروں سے معلوم ہوا کہ فریدی اوپر لیبارٹری میں ہے۔

حمید اوپر چلا گیا۔ تین دن بعد فریدی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے اُسے
اسکوپ پر جھکے ہوئے دیکھا۔ حمید کی آہٹ پر وہ چونک پڑا۔ پھر اُس نے حمید کو اشارے
اپنے قریب بلایا۔

”دیکھو.....!“ اُس نے مائیکرو اسکوپ کے لینس کی طرف اشارہ کیا۔ حمید نے ششے
آنکھ لگا دی۔ سلائڈ پر بے شمار چمکدار ذرات نظر آرہے تھے۔

”کیا دیکھا.....!“

”پریاں ناچ رہی ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ڈالڈا کے ڈبے ہیں۔ اررر..... نہیں
میرے خدا..... ان ذرات سے تو شعاعیں سی پھوٹ رہی ہیں۔ نیلی اور بنفشی۔ یہ کیا بلا؟
حمید نے ششے سے آنکھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہارے لئے ایک مصیبت ثابت ہونے والی ہے۔“ فریدی مسکرایا۔
”یعنی.....!“

”ایک شاعر کیس.....!“ فریدی کا جواب تھا۔

کھیتوں میں

کیس کا نام سن کر حمید کی جان نکل گئی اور وہ کراہ کر فرش پر بیٹھ گیا۔

”یہ ذرات.....!“ فریدی کہتا رہا۔ ”تار جام کی لوہے کی ایک کان سے برآمد ہوئے
ہیں جو لوہے کے ذرات ہرگز نہیں ہو سکتے۔“

”ارے تو یہ کیس ہو گیا۔“ حمید نے رونی آواز میں کہا۔

”کیونکہ کان کن کمپنی اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہی ہے حالانکہ اس کی اطلاع
حکومت کو ہونی چاہئے..... اور یہ کان کن کمپنی غیر ملکی ہے۔“

”یہ ذرات آپ کو کب اور کہاں ملے؟“

”یہ میرے پاس تقریباً پندرہ دن سے ہیں اور آج میں ان سے دو طرح کی شعاعیں
خارج کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔“

”آپ.....!“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”ہاں! کیوں؟ یہ اتنی بڑی تجربہ گاہ آخر کس لئے ہے۔“

”ان ذرات میں پہلے کیا خصوصیت تھی جس نے آپ کو دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔“

”ہر ذرے کے گرد فاسفی رنگ کے دائرے سے معلوم ہوتے تھے۔“

”کاش وہ دائرے میرے لئے پھانی کا پھندا بن جاتے مگر یہ آپ کے ہاتھ کیسے لگے۔“

”کمپنی کے ایک محب وطن دیسی ڈائریکٹر نے مجھے اطلاع دی تھی۔ پھر میں نے اپنے طور

فریدی پھر ذرات کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد حمید نے کہا۔
 ”آپ تار جام ہی میں تھے۔“

”ہاں..... اور کل پھر جاؤں گا۔ مگر تنہا نہیں تم بھی میرے ساتھ ہو گے۔“
 ”تار جام بڑی خشک جگہ ہے۔“

”نہیں اب وہاں کے ہوٹلوں میں بھی لڑکیاں نظر آنے لگی ہیں۔“ فریدی نے خشک لہجے
 میں کہا۔

”شکر ہے کہ ان پر آپ کی نظر تو پڑی۔“

”بس اب دفع ہو جاؤ۔ ورنہ یہ لیبارٹری اندر سہا بن کر رہ جائے گی۔“

”آپ کا مقدر ہی بخیر ہے۔ کوئی کیا کرے؟“ حمید نے کہا اور لیبارٹری سے چلا آیا۔

پھر بقیہ وقت سکون سے گزرا۔ نہ فریدی نے اُسے طلب کیا اور نہ حمید کو یہی معلوم ہو سکا

کہ وہ گھر کے کس حصے میں کیا کر رہا ہے۔

رات بھی چین سے گزری۔ یعنی طلب کر کے کسی مسئلے پر بحث نہیں کی گئی۔ ہر ایسے موقع

پر جب فریدی کے ہاتھ میں کوئی کیس ہوتا تھا حمید خود ہی اس سے کترانے لگتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ

آج کل وہ ذہنی جناسک سے ذرا دور بھاگنے لگا تھا۔ البتہ ان کاموں کے لئے ہر وقت تیار رہتا

تھا جن میں صرف جسمانی انرجی صرف ہوتی ہو۔

”دوسری صبح وہ دیر سے اٹھا تھا۔ فریدی ناشتہ کر چکا تھا۔ حمید ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ ایک نوکر

نے آکر اطلاع دی کہ فریدی نے اُسے ڈرائیونگ روم میں طلب کیا ہے۔ اس نے جلدی جلدی

ناشتہ ختم کیا۔

لیکن ڈرائیونگ روم میں قدم رکھتے ہی اس کا دم نکل گیا کیونکہ سامنے ہی پروفیسر شوخ

براجمان تھا اور بہت غصے میں معلوم ہوتا تھا۔

”جی ہاں..... یہی حضرت ہیں۔“ وہ حمید کو دیکھتے ہی اچھل کر دہاڑا۔ پھر حمید کو لاکار۔

”سیلہ کہاں ہے؟“

پر یہ ذرات حاصل کر لئے چونکہ اس ڈائریکٹر کو علم الارض سے دلچسپی ہے۔ اس لئے اس کی
 اس طرف مبذول ہو گئی۔ دوسرے دیسی ڈائریکٹروں کو اس کا علم نہیں ہے۔“

”خدا اس دیسی ڈائریکٹر کی دس شادیاں کر دے تاکہ اُسے علم البقر کے علاوہ کسی اور
 سے دلچسپی نہ رہ جائے۔“

فریدی ہنسنے لگا اور حمید بولا۔ ”تو یہ ذرات مصیبت کیوں بنیں گے۔ کان کنی رکوائی بھی
 جاسکتی ہے۔“

”آسانی سے نہیں۔“ فریدی سر ہلا کر بولا۔ ”پہلے تحقیقات ہوگی اگر یہ ثابت ہو گیا تو

کارروائی کی جاسکے گی ورنہ نہیں۔ لیکن اتنی دیر میں وہ لوگ حاصل کئے ہوئے ذخیرے کو

بیچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”تو ذخیرے ہی پر کیوں نہ قبضہ کر لیا جائے۔“

”یہ تو مصیبت ہے کہ وہ جگہ ابھی تاریکی میں ہے جہاں اُن لوگوں نے اسکا ذخیرہ کیا ہے۔ کہ وہ گھر کے کس حصے میں کیا کر رہا ہے۔“

”کیا پتہ ذخیرہ یہاں سے منتقل بھی کیا جا چکا ہو۔“

”نہیں..... ابھی کوئی تدبیر ان کی سمجھ میں نہیں آسکی۔“

”ذخیرے کا علم آپ کو کیسے ہوا۔“

”یہ بھی اسی دیسی ڈائریکٹر کی اطلاع ہے۔ اُس نے غیر ملکی ڈائریکٹروں کو اس مسئلے

گفتگو کرتے سنا تھا۔“

”غالباً چھپ کر سنا ہوگا۔“

”یقیناً.....!“

”دوسروں کی باتیں چھپ کر سنا اور پھر اُسے ادھر ادھر کہتے پھرنا بہت بڑا گناہ ہے۔“

”کبھی معاف نہیں ہوتا۔“

”اور ہم پرانے گناہ گار ہیں۔“ فریدی مسکرایا۔

”میں تائب ہو جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ حمید نے بُرا سامنہ بنا کر کہا۔

”میں کیا جانوں۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ حمید نے خود پر قابو پانے کی کوشش کر ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔

”آپ اُسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کے بعد سے وہ گھر واپس نہیں آئی۔“
”میں نہیں لے گیا تھا بلکہ وہ خود گئی تھیں۔“
”وہ کہاں ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے جیس اسٹریٹ میں اتار دینا۔“
”پھر.....؟“

”پھر کیا..... میں نے انہیں جیس اسٹریٹ میں اتار دیا۔“

”آپ میرے یہاں آئے ہی کیوں تھے۔“ پروفیسر چنگھاڑا۔

”انہوں نے مجھ سے استدعا کی تھی کہ میں اُنکا کھویا ہوا پرس تلاش کرنے میں مدد دوں۔“
”یہ قطعی بکواس ہے۔ سلیہ نے یہ کبھی نہ کہا ہو گا جب کہ میں اُسے خاموش رہنے کا دے چکا تھا۔“

”لیکن وہ خاموش نہیں رہیں۔“ حمید نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

”میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ اگر وہ شام تک واپس نہ آئی تو میں آپ کے خلاف کارروائی کر دوں گا۔“

”آپ میرے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“ حمید کو بھی غصہ آ گیا۔

”آپ ایک آوارہ آدمی ہیں۔ میں آپ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتا۔“

”اب آپ اپنی زبان بند رکھیں گے۔“

”دھاندلی نہیں چلے گی۔“ پروفیسر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”قانون سب کے لئے یکساں

خواہ وہ کوئی پولیس آفیسر ہو، خواہ کوئی عام شہری۔“

”ٹھیک ہے پروفیسر۔“ یک بیک فریدی نے کہا۔ ”لیکن کیا وہ اکثر راتوں کو آپ

علم میں لائے بغیر گھر سے باہر رہتی ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ پروفیسر اس کی طرف مڑا۔

”ابھی نو میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا۔ کہنے نہ کہنے کا دار و مدار میرے اس سوال پر ہے۔“

”ہاں..... اٹر وہ رات کو باہر ہی رہ جاتی ہے۔“

”آپ کو اطلاع دیئے بغیر ہی۔“

”نہیں..... وہ مجھے فون پر اطلاع دیا کرتی ہے یا کہہ کر جاتی ہے۔“

”کل دونوں ہی باتیں نہیں ہوتیں۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”ہاں کل نہ تو وہ مجھے بتا کر گئی اور نہ ہی فون پر اطلاع دی۔“

”پھر بھی آپ نے رات کسی تشویش کے بغیر گذاری۔“

”میں رات بھر سو نہیں سکا۔ جہاں جہاں اس کے ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ فون

کے لیکن کہیں سے کوئی اطلاع نہ مل سکی۔“

”لیکن آپ نے کیپٹن حمید کو فون نہیں کیا۔“

”یہ تو مجھے آج صبح معلوم ہوا کہ وہ ان حضرت کے ساتھ گئی تھی۔ ایک ایسے نوکر نے

انہیں جاتے دیکھا تھا جو صرف دن کے لئے ہے۔ رات اپنے گھر پر بسر کرتا ہے۔“

”آپ اُس وقت کہاں تھے۔ جب یہ دونوں گئے تھے۔“

”میں اندر تھا۔“

فریدی چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”اچھی بات ہے پروفیسر اگر مزید دو گھنٹے

تک مزید ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملے تو مجھے فون کیجئے گا۔“

”ضرور کروں گا۔“ پروفیسر حمید کو گھورتا ہوا تلخ لہجے میں بولا۔ ”اب میں سب سے پہلے

اُس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کراؤں گا۔“

”میں ابھی اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“ فریدی بولا۔

”کیا میں آپ کے مشورے کا پابند ہوں۔“ پروفیسر نے جھلا کر کہا۔

”جاؤ درج کرادو رپورٹ۔“ حمید ہاتھ ہلا کر غرایا۔ ”بس اب چلے ہی جاؤ ورنہ اٹھا کر

کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔“

”دھمکی..... اچھا اچھا دیکھ لوں گا۔“ پروفیسر اٹھتا ہوا بولا۔

فریدی نے حمید کو ڈانٹا اور پروفیسر سے کہا۔ ”پروفیسر! مجھے افسوس ہے کہ آپ اس سڑک میں میرے اسٹنٹ کا نام لے رہے ہیں۔ لہذا میں کوشش کروں گا۔“

”وہ تو کرنی ہی پڑے گی۔“ پروفیسر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا۔

حمید اُسے پھانک سے گذرتے دیکھتا رہا۔

پھر وہ فریدی کی طرف مڑا جو اُسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

”یہ بھی ایک کیس ہی ہے کرنل صاحب۔“ حمید دل کڑا کر کے بولا۔ ”میں نے اس جینس اسٹریٹ میں نہیں اتارا تھا بلکہ جھریالی کے میدان میں لے گیا تھا اور پھر جوار کے کلب سے اُسے نکل گئے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ حمید کو متواتر گھورے جارہا تھا۔ لہذا حمید نے اسی میں عافیت

کہ جلد از جلد اُسے حالات سے آگاہ کر دے۔

فریدی بہت توجہ اور دلچسپی سے سن رہا تھا اور اب اُس کے چہرے پر غصے کے آثار اسٹریٹ میں اسی کے کہنے پر اتار دیا تھا۔

نہیں تھے۔

”تم نے مجھے کل ہی کیوں نہیں بتایا تھا۔“ اس نے تشویش کن لہجے میں کہا۔

”میں سمجھا تھا کہ وہ گھر پہنچ گئی ہوگی۔ اُن لوگوں نے مجھے تاؤ دلانے کیلئے ایسا کیا ہے۔“

”بڑی دلچسپ کہانی ہے بشرطیکہ تم نے غلط بیانی سے کام نہ لیا ہو۔“

”اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے۔“ حمید بولا۔ ”کیا پہلے کبھی میں نے آپ

جھوٹ بولنے کی کوشش کی ہے۔ تفریحی معاملات کی بات الگ ہے۔“

”اچھا تو اٹھو۔ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں وہ واقعہ پیش آیا تھا۔“

کچھ دیر بعد فریدی کی لنکن کپاؤنڈ سے نکل رہی تھی۔ حمید نے کہا۔ ”یہ پروفیسر ابھی

میری سمجھ میں نہیں آسکا۔“

”شوہروں سے زیادہ بیویوں کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔“ فریدی بولا۔

”تب تو پھر یہ معاملہ آپ سے نہیں سنھیلے گا۔“

”کیوں؟“

”ممکن ہے آپ شوہروں کے متعلق کچھ جانتے ہوں..... لیکن بیویوں!

”میں دونوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

”حالانکہ یہ صرف شوہر اور بیوی کا کیس معلوم ہوتا ہے۔“

”ممکن ہے۔“ فریدی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

کارشہری آبادی کو پیچھے چھوڑنے لگی۔ وہ جھریالی کی طرف جارہے تھے اور حمید کا ذہن

سیدہ میں الجھا ہوا تھا۔ وہ اسرار عورت..... شیطان کی محبوبہ..... اس کے مقابلے میں وہ آدمی

اُسے بے وقت معلوم ہو رہے تھے جو اُسے اٹھا کر لے گئے تھے۔“

کچھ دیر بعد فریدی نے کہا۔ ”وہ رپورٹ درج کر دینے کی دھمکی دے کر گیا ہے۔“

”دھمکیوں سے میں نہیں ڈرتا۔ میرا بیان پہلے ہی سے تیار ہے۔ میں نے اُسے جیمس

فریدی بہت توجہ اور دلچسپی سے سن رہا تھا اور اب اُس کے چہرے پر غصے کے آثار اسٹریٹ میں اسی کے کہنے پر اتار دیا تھا۔

نہیں تھے۔

جاؤ گے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”وہ کہے کہ اس انواء میں تمہارا ہی ہاتھ تھا۔“

”اگر وہ یہ کہہ دے تو مجھے دنیا کی ساری حسین عورتوں کو گولی مار دینی پڑے گی۔ نہیں وہ

ایک مظلوم عورت ہے۔ ایک بوڑھے کی نوجوان بیوی اور بیرونی عشاق کی زبردستیوں کا شکار۔“

”تم اس پیشے سے علیحدگی اختیار کر کے کوئی اور ہندہ دیکھو تو بہتر ہے۔“

”کیوں..... بس یہیں..... یہیں روک دیجئے۔“ حمید چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”ہم

کچھ آگے بڑھ آئے ہیں۔“

”یادداشت دھو کا تو نہیں دے رہی ہے۔“

”نہیں..... ہم تقریباً دو سو گز آگے آگے ہیں۔“

کاررک جکی تھی۔ وہ دونوں اتر گئے۔

”ہاں یہ جگہ ایسے کاموں کے لئے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔“ فریدی نے چار

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر وہ اس جگہ آئے جہاں حمید کو تلخ تجربے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ حمید نے وہ سمت

جدھر وہ لوگ سیرہ کو لے کر گئے تھے۔

فریدی نشیب میں اتر گیا لیکن حمید اوپر سڑک ہی پر کھڑا رہا۔ فریدی چاروں طرف

ہوا آہستہ آہستہ کھیتوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہوا تیز تھی اور جوار کے کھیتوں کی کھر کھراہٹ سے فضا گونجی، حمید نے فریدی کوڑ

سے کوئی چیز اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔ شاید وہ کپڑے کا ٹکڑا تھا۔

فریدی نے جوار کے پودوں کے درمیان سے کھینچ کر نکالا تھا۔

حمید جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ فریدی نے بھی اُسے اپنے پاس نہیں بلایا۔ اچانک جب

بائیں جانب والے نشیب میں کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی اور وہ ادھر جھپٹا لیکن دوسرے

میں اگر وہ خود کو سڑک پر گراندہ دیتا تو کھوپڑی صاف ہو گئی تھی۔ دوسری طرف کے نشیب

آدمی تھے اور اُن میں سے ایک نے فائر کر دیا تھا۔ حمید نے بھی ریوالور نکال کر ایک ہوائی

کیا کیونکہ وہ لوگ ابھی نشیب ہی میں تھے۔ فریدی شاید پہلے ہی فائر پر دوڑ پڑا تھا۔ وہ بھی

ہی کی طرح سڑک پر گر کر دوسرے کنارے کی طرف ریٹگنے لگا۔

”ہوشیاری سے۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”وہ لوگ یقینی طور پر کھیتوں میں جا گھسے ہوں گے۔“

درخت کے تنے کی آڑ لینے کی کوشش کرو۔ یہی مناسب ہے۔“

”اگر ادھر سے بھی ہوا تو۔“ حمید نے دوسری طرف اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ فریدی بولا۔ ”تم ادھر جاؤ..... میں ادھر دیکھتا ہوں۔“

سڑک کے کناروں پر دو رو یہ بڑے بڑے تناور درخت تھے۔ دونوں درختوں کے تنوں کی

اوٹ میں ہو گئے لیکن وہ اب بھی سینے کے بل زمین ہی پر پڑے ہوئے تھے اور یہاں سے وہ

کھیتوں کو بخوبی نظر میں رکھ سکتے تھے۔ ساتھ ہی وہ سڑک کی بھی نگرانی کر رہے تھے۔

فریدی نے کھیتوں کی طرف دو فائر کے..... سے بھی جواب میں فائر ہوئے جدھر حمید

تھا ادھر سکون ہی رہا۔

تقریباً پندرہ منٹ تک دونوں طرف سے فائر ہوتے رہے۔ پھر سناٹا چھا گیا۔

”ارے یہ دعوت ختم ہوئی یا نہیں..... یہ رابا۔“ سڑک چھاتی سے چٹنی جا رہی ہے۔“

”گازی کی طرف جاؤ۔“ فریدی نے کہا۔

”اسی طرح لیٹے لیٹے“

”ہاں.....!“

”ارے باپ رہ۔“

حمید کسی نہ کسی طرح گازی تک پہنچا اور اُسے اشارت کر کے وہاں لے آیا جہاں فریدی

درخت کے تنے کی اوٹ میں پڑا ہوا تھا۔

وہ بھی کار میں آ بیٹھا اور کار چل پڑی۔

”اب.....!“ حمید نے سوالیہ انداز میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

”تو یہ عورت خطرناک آدمیوں کے ہاتھ میں پڑی ہے۔“ فریدی بولا۔

”اور شاید وہ کھیتوں ہی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”عورت.....!“ فریدی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”ہائیں..... ہائیں..... یہ کیا..... آپ کو مونیہ ہو جائے گا۔“

”میں تمہیں سنکڑوں بار سمجھا چکا ہوں کہ عورت کا چکر بڑا ہے۔“

”واقعی بڑا ہے اگر اسی عورت نے مجھے جنم نہ دیا ہوتا تو جلتی ہوئی سڑکوں پر سینے کے بل

نہ پڑا رہتا مگر آپ نے اس فائرنگ کے متعلق اظہار خیال نہیں کیا۔“

”وہ پاگل پن کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اس عورت سے زیادہ تم! تمہاری موت کا بہانہ بن جائے۔“

”لجی لے رہے ہیں۔“

”مجھ میں کیوں؟“

”پتہ نہیں..... ورنہ اس طرح فائرنگ کر کے بھاگ جانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔“

”مگر ان کے خلاف آپ کیا کریں گے۔“

”تم شاید یہ چاہتے تھے کہ میں کھیتوں میں جا گھستا۔“

”میرا دل تو یہی چاہتا تھا۔“

”ایسے افعال کا دوسرا نام خودکشی ہے۔“

”تم سنگدل ہو۔“ بوڑھے پروفیسر نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

اتنے میں اُس کا بھتیجا داؤد آ گیا جو پیہوں والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ایک پیر پر

پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ حمید نے اُسے آج پہلی ہی بار دیکھا تھا۔

داؤد اچھے ہاتھ پاؤں کا ایک لمبا ترنگا جوان تھا۔ دل کا مضبوط بھی معلوم ہوتا تھا کیونکہ

اُسکے چہرے پر حمید کو اضمحلال نہیں نظر آیا تھا۔ حالانکہ اُسکی ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اُسے

تو بستر سے ہلنا بھی نہ چاہئے تھا مگر وہ پیہوں والی کرسی پر بیٹھا عمارت میں گھومتا پھر رہا تھا۔

”آپ کی تعریف انکل۔“ اُس نے حمید کی طرف دیکھ کر پروفیسر سے کہا۔

”حکمہ سراغ رسانی کے کیپٹن حمید۔“

”اوہ تو آپ ہی ہیں۔“ داؤد حمید کو نیچے سے اوپر تک گھور رہا تھا۔

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ داؤد کو ٹوٹنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کیوں جناب! آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔“ اُس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

”جب تک خدا چاہے گا۔“

”یا آپ چاہیں گے۔“

”آپ مجھ پر اس قسم کا کوئی الزام نہیں رکھ سکتے مسٹر داؤد۔ کوئی بات زبان سے نکالنے

سے پہلے اس پر غور کر لیا کیجئے۔“

”داؤد بیکار باتیں نہ کرو۔“ پروفیسر اس کی طرف مڑ کر بولا۔

”بس کیا بتاؤں کہ چلتے پھرنے سے معذور ہوں ورنہ ایک ایک سے سمجھ لیتا۔“ داؤد نے

غصیلے لہجے میں کہا۔

”کیا اشارہ میری طرف ہے۔“ حمید کو بھی غصہ آ گیا۔ ”اچھی بات ہے۔ میں آپ کے

صحت یاب ہو جانے کا انتظار کروں گا۔“

”داؤد..... خدا کے لئے۔“ پروفیسر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”جاؤ تم آرام کرو۔“

پروفیسر کا شبہ

تین دن سے سلیمہ کی تلاش اعلیٰ پیمانے پر جاری تھی لیکن اس کا سراغ ابھی تک نہیں

تھا۔ پروفیسر نے باقاعدہ طور پر اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی تھی جس میں کیپٹن ب

نام واضح طور پر لیا گیا تھا۔ فریدی نے ان کھیتوں کو چھنوا ڈالا لیکن حملہ آوروں کا پتہ نہیں

سکا۔ یہ حمید کے علاوہ اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کھیتوں میں کسے تلاش کیا گیا تھا کیونکہ حمید

تک اپنے پچھلے ہی بیان پر قائم تھا کہ اس نے سلیمہ کو جیس اسٹریٹ میں اتار دیا تھا۔

فریدی کی دوڑ دونوں طرف جاری تھی اگر صبح تار جام میں ہوتی تو شام شہر میں۔ حمید

دن بھر سرگرداں رہتا کیونکہ اب پروفیسر شوخ نے اُس پر گرجنے برسنے کی بجائے روا

گزرنا شروع کر دیا تھا۔ حمید کی دانست میں وہ سلیمہ سے بے حد محبت کرتا تھا۔

”میں اُس کے بغیر مرنے والا ہوں گا۔“ وہ حمید سے کہہ رہا تھا۔

”تو آخرا ب کتنے دن زندہ رہو گے۔ یونہی عمر کافی ہوئی۔ ہو سکتا ہے سلیمہ کی گمشدگی

داؤد نے کرسی موڑی اور پہیوں کو پھراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

”تم کچھ خیال نہ کرنا کیپٹین۔“ پروفیسر نے حمید سے کہا۔ ”یہ لڑکا بہت اکھڑ ہے۔“

”میں اکھڑ ترین ہوں۔“

”کیپٹین پلیز.....!“

”کیوں.....؟“

”میں اُسے ڈرینگ ہو جانے کے بعد ہی دیکھ سکا تھا اور پھر میری عدم موجودگی میں

پلاسٹر بھی چڑھا دیا گیا۔“

”جب وہ گرا ہوگا تو کوئی نہ کوئی عمارت میں ضرور موجود رہا ہوگا۔“

حمید چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”آخر تم کسی کے خلاف شبہ کیوں ظاہر نہیں کرتے۔“

”میں بغیر سراغ ملنا مشکل ہے۔ مجھے دو چار ایسے نام لکھوا دو جن پر تمہیں شبہ ہو۔“

”میں شبہ کس پر ظاہر کروں جبکہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ جیس اسٹریٹ کیوں گئی تھی۔“

”کیا وہاں کوئی شناسا نہیں رہتا۔“ حمید نے کہا۔

”میرا کوئی شناسا نہیں رہتا۔“ پروفیسر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے اس کا

ہو لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔“

اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آؤ..... آؤ..... میرے ساتھ۔“ پروفیسر اس کا ہاتھ پکڑ کر مضطربانہ انداز میں بولا۔

اُسے ایک طرف لے جا رہا تھا۔ پھر انہوں نے بالائی منزل کے لئے زینے طے کئے اور اوپر

کر پروفیسر اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ دروازہ بند کر دینے کے بعد وہ حمید کی طرف مڑا۔

”شبہ ظاہر کر دوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”یقیناً..... اس کے بغیر کام نہیں بنے گا۔“

”مجھے داؤد پر شبہ ہے۔“ پروفیسر نے بہت آہستہ سے کہا۔

”کمال ہے۔ کل تک آپ کو مجھ پر بھی شبہ تھا۔“

”شبہ کی وجہ ہے کیپٹین..... داؤد بے ایمان اور غاصب ہے۔ میں نظریں پھیلتا ہوں

وہ سلیہ کو ان نظروں سے نہیں دیکھتا تھا جن سے چچی کو دیکھنا چاہئے۔“

”ہو سکتا ہے..... ممکن ہے.....!“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”لیکن وہ تو چل پھر نہیں سکتا۔“

”مجھے اس پر بھی شبہ ہے۔“

”پروفیسر نے

”خوب..... اس کی کہانی کیا ہے۔“

حمید کی طرف مڑ کر کہا۔ ”صورت ہی سے اوباش معلوم ہوتا ہے۔“

پروفیسر نے جو کچھ بھی کہا تھا حمید نے دہرایا۔ فریدی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر

”اچھا میں اسے چیک کروں گا۔“ حمید نے کہا۔

اور پھر وہ وہاں سے چلا آیا۔ وہ پروفیسر کے شعبے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ

”یہ چیز بھی دلچسپ ہے۔“

”آپ یہاں کیوں نظر آرہے ہیں۔“

اس نے بھی داؤد کو دیکھا تھا اور اس کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں قائم کی تھی۔

”تمہارا فخر تھا۔“ فریدی مسکرایا۔ ”مجھے فرشتوں سے اطلاع ملی تھی کہ تم اس وقت ادھر

اُس کی موٹر سائیکل پارک اسٹریٹ میں داخل ہوئی اور پھر ڈاکٹر زیدی کے مطب

سائنس رک گئی۔ اندر ڈاکٹر کی میز پر جو شخص نظر آیا اُسے حمید شہر کی اچھی تفریح گاہوں میں آؤ گے۔“

”سراغ رسانی سے عشق حقیقی تک۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”عشق مجازی اپنے حصے میں آیا ہے۔

باردیکھ چکا تھا اور وہ اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس کا نام اُسے آج ہی معلوم ہوا۔ پہلے وہ

درمیں آپ کو مجبور نہیں کروں گا کہ آپ یہاں اپنی موجودگی کی وجہ بتائیے۔“

کرتا تھا کہ وہ شہر کا کوئی اوباش رئیس ہے۔

”لو بھی میں جا رہا ہوں لیکن زیدی سے کسی قسم کی گفت و شنید مت کرنا۔ اس پر صرف نظر

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے کس طرح چیک کرے کہ اچانک اس کی نظر دوسری طرف کے

ریستوران کی کھڑکی کی جانب اٹھ گئی اور اُس نے وہاں جو کچھ بھی دیکھا اس کیلئے کافی سنسنی خیز لہو۔ سائے کی طرح اس کا تعاقب کرو۔ اس کے خلاف نہ ہو۔“ فریدی نے کہا اور اٹھ کر

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فریدی کی آنکھوں میں بھی حیرت ہی دیکھی۔ اُس نے موٹر سائیکل سے نکل گیا۔ حمید بیٹھا پلکیں جھپکاتا رہ گیا۔

اُسے وہاں تقریباً ڈھائی بجے تک بیٹھنا پڑا..... اور جب ڈاکٹر زیدی اپنی کار میں بیٹھ چکا

فٹ پاتھ سے لگا کر کھڑی کردی اور ریستوران میں گھستا چلا گیا۔ فریدی میز پر تباہی تھا۔

وہ بھی ریستوران سے نکلا۔

”کیوں.....؟“ فریدی نے سوال کیا۔ حمید بیٹھ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اسکی کار کا تعاقب کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہا تھا کہ بُرے پھنسنے۔

”آپ خفا کیوں ہو رہے ہیں۔ کیا میں کوئی لڑکی ہوں۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

سے صرف تعاقب کرتے رہنے سے اختلاج ہونے لگتا تھا اور اس وقت تو اختلاج کے علاوہ

”اُس سے بھی بدتر۔“ فریدی نے بُرا سامنہ بنایا۔

زیدی کے رویہ سے پیدا ہو جانے والی الجھن بھی تھی۔ آخر وہ ڈاکٹر زیدی تک کیسے پہنچا جب

”میں ڈاکٹر زیدی کو ایک معاملے میں چیک کرنا چاہتا ہوں۔“ حمید نے کہا۔

اس نے نہ تو داؤد کو دیکھا تھا اور نہ پروفیسر ہی سے ملا تھا۔ اسکی دانست میں وہ دونوں صرف

”کس معاملے میں۔“ فریدی آگے جھک آیا۔

بل ہی بار ملے تھے۔ اسی دن جب پروفیسر اس پر سلیب کے اغواء کا شبہ ظاہر کرنے کیلئے آیا تھا۔

”اُس نے داؤد کے ٹوٹے ہوئے پیر پر پلاسٹر چڑھایا تھا۔“

کارشہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی اور حمید جھک مارتا رہا۔ اُسے توقع تھی کہ ڈاکٹر زیدی

”پھر.....!“

طب سے اٹھ کر اپنی قیام گاہ پر جائے گا اور اسے اس تعاقب سے جلد ہی نجات مل جائے گی۔

”مجھے شبہ ہے کہ داؤد کا پیر سرے سے ٹوٹا ہی نہیں تھا۔“

لرہا نہ ہوا۔ وہ اس کے بجائے ہائی سرکل ٹائٹ کلب میں جا گھسا۔

”آخر کس بناء پر۔“

ڈائینگ ہال میں برائے نام آدمی تھے۔ ڈاکٹر زیدی نے لُچ طلب کیا۔

”خود پروفیسر نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے۔“

اب تو حمید کو بیٹھنا ہی تھا لہذا اسے بھی لنگھی طلب کرنا پڑا۔ بلکہ وہ تو سوچ رہا تھا کہ رات کا کھانا بھی یہیں نہ کھانا پڑے۔

ہال کا ماحول اس وقت انتہائی درجہ خشک تھا کیونکہ کہیں بھی کوئی ایسا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ حمید نے ایک طویل سانس لی۔ اس نے ڈاکٹر زیدی کی آواز صاف پہچانی تھی۔ رہے جسے دیکھ کر حمید دن بھر کی ذہنی تھکن دور کر سکتا۔

وہ خاموشی سے نوالے حلق سے اتارتا رہا۔ ڈاکٹر زیدی بھی کچھ تھکا تھا سا نظر سے شبہات بھی یقین میں تبدیل ہو گئے۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ ڈاکٹر زیدی ہوشیار ہو گیا تھا۔ لہذا اب اس اسٹیج پر اس سے دور ہی رہنا بہتر تھا۔

تھا۔ ایک آدھ بار اس نے حمید کی طرف دیکھا بھی، مگر بالکل اسی انداز میں جیسے ہال دوسرے لوگ ایک دوسرے کو بے تعلقی سے دیکھ لیتے تھے۔

لنگ ختم کر چکنے کے بعد ڈاکٹر زیدی لاؤنج میں چلا گیا۔ لیکن حمید نے اٹھنا منار سمجھا۔ وہ چونکہ اسے دیکھ چکا تھا اس لئے احتیاط لازمی تھی۔ اگر اس انواء میں حقیقتاً اسی کا تھا تو حمید کو سر پر مسلط دیکھ کر اسے شبہ بھی ہو سکتا تھا۔

وہ اٹھ کر فیجر کے کمرے میں آیا لیکن وہ بھی موجود نہیں تھا۔ اس کمرے کی دوسری میں ایک دوسرا کمرہ تھا جہاں فیجر آرام کیا کرتا تھا۔ حمید نے اس کا پردہ سرکایا لیکن وہ بھی تھا۔ خالی مسہری دیکھ کر حمید انگڑائیاں لینے لگا۔ وہ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو توں سمیت بھی اس مسہری پر سوتا ہوا پایا گیا تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

وہ اطمینان سے جا لیٹا۔ سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو صرف تھکن دور کرنا چاہتا تھا۔ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر فیجر آ گیا تو کچھ دیر اسے بھی بور کرے گا۔

دفعۃً اُسے فیجر کے آفس میں قدموں کی چاپ سنائی دی لیکن وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ ایسی آواز آئی جیسے فون پر نمبر ڈائل کئے جا رہے ہوں۔

پھر کوئی آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”ہیلو..... کون..... اچھا..... ہاں دیکھو.....“

حمید نے ایک طویل سانس لی۔ اس نے ڈاکٹر زیدی کی آواز صاف پہچانی تھی۔ رہے جسے دیکھ کر حمید دن بھر کی ذہنی تھکن دور کر سکتا۔

وہ خاموشی سے نوالے حلق سے اتارتا رہا۔ ڈاکٹر زیدی بھی کچھ تھکا تھا سا نظر سے شبہات بھی یقین میں تبدیل ہو گئے۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ ڈاکٹر زیدی ہوشیار ہو گیا تھا۔ لہذا اب اس اسٹیج پر اس سے دور ہی رہنا بہتر تھا۔

تھا۔ ایک آدھ بار اس نے حمید کی طرف دیکھا بھی، مگر بالکل اسی انداز میں جیسے ہال دوسرے لوگ ایک دوسرے کو بے تعلقی سے دیکھ لیتے تھے۔

لنگ ختم کر چکنے کے بعد ڈاکٹر زیدی لاؤنج میں چلا گیا۔ لیکن حمید نے اٹھنا منار سمجھا۔ وہ چونکہ اسے دیکھ چکا تھا اس لئے احتیاط لازمی تھی۔ اگر اس انواء میں حقیقتاً اسی کا تھا تو حمید کو سر پر مسلط دیکھ کر اسے شبہ بھی ہو سکتا تھا۔

وہ اٹھ کر فیجر کے کمرے میں آیا لیکن وہ بھی موجود نہیں تھا۔ اس کمرے کی دوسری میں ایک دوسرا کمرہ تھا جہاں فیجر آرام کیا کرتا تھا۔ حمید نے اس کا پردہ سرکایا لیکن وہ بھی تھا۔ خالی مسہری دیکھ کر حمید انگڑائیاں لینے لگا۔ وہ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو توں سمیت بھی اس مسہری پر سوتا ہوا پایا گیا تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

وہ اطمینان سے جا لیٹا۔ سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو صرف تھکن دور کرنا چاہتا تھا۔ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر فیجر آ گیا تو کچھ دیر اسے بھی بور کرے گا۔

دفعۃً اُسے فیجر کے آفس میں قدموں کی چاپ سنائی دی لیکن وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ ایسی آواز آئی جیسے فون پر نمبر ڈائل کئے جا رہے ہوں۔

پھر کوئی آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”ہیلو..... کون..... اچھا..... ہاں دیکھو.....“

ڈاکٹر زیدی ہی کو لے لیجئے۔“

”اوہ.....!“ حمید سنبھل کر بیٹھ گیا لیکن منیجر نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ دہرا لگے ہوئے ایک تصویری فریم کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سر ہلا کر کہا۔ ”وہ حضرت آدمیوں کو اپنے ساتھ لاتے ہیں جن کی صحبت کوئی شریف آدمی پسند نہیں کر سکتا۔“

”وہ کیسے آدمی ہوتے ہیں۔“

”چھٹے ہوئے بد معاش لنگے..... جنہیں آپ منہ لگانا بھی پسند نہیں کر سکتے۔“

”کیا تم انہیں پہچانتے ہو۔“

”کیوں نہیں..... ان میں سے ایک سمگلر ہے کئی بار بحری پولیس کی گولیوں سے زخمی عورت کا جو طیلہ بتایا تھا وہ نیگم شوخ کے علاوہ اور کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت چکا ہے۔ مگر چونکہ بڑے آدمیوں کی سرپرستی اُسے حاصل ہے۔ اسلئے ہمیشہ آزاد ہو جاتا ہے۔ میں وہ شہر کی طرف کیا دھیان دیتا۔“

”کون ہے..... نام بتاؤ۔“

”پہلے لوگ اُسے راجو راجو پکارتے تھے مگر اب چند برسوں سے افریڈ راج کہلانے لگا ہے۔“

”اوہ..... اچھا..... وہ جو برٹرام روڈ پر رہتا ہے۔“

”جی ہاں..... وہی..... وہی.....!“

”تمہیں غم حاصل ہے کہ تم ڈاکٹر زیدی کو کلب کی رکنیت سے خارج کر دو۔“

”مگر ٹھکانہ کہاں ہوگا میرا۔ میں غنڈوں سے بہت ڈرتا ہوں..... غنڈوں سے نہیں۔“

”بے عزتی سے۔“

”کس کی مجال ہے کہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔“ حمید بولا۔

”آپ کی ذات سے یہی توقع ہے آپ سے زیادہ میرا کون ہمدرد ہوگا۔“

”مگر ٹھہرو..... چند دن اور ٹھہر جاؤ۔ اپنی زبان بالکل بند رکھو۔ میں ایک ضروری“

”فرصت پا کر ان لوگوں سے پٹ لوں گا جب تک میں مشغول ہوں طرح دیتے رہو۔“

”بہت بہتر جناب..... آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔ مجھے یقین ہے اگر“

”معلوم ہو جائے کہ مجھے کن بڑے آدمیوں کی حمایت حاصل ہے تو وہ ادھر کا رخ ہی نہیں کریں گے۔“

”سیا ڈاکٹر زیدی اس وقت بھی موجود ہے۔“

”کچھ دیر پہلے تھا۔ اب نہیں ہے۔“ منیجر نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”مگر اس کے ساتھ لڑکیاں بھی ہوتی ہوں گی۔“

”ہوتی ہیں۔ وہ بھی اس معاملے میں آپ ہی کی طرح خوش قسمت ہے پکتان صاحب۔“

ایک بار میں نے اس کے ساتھ ایک اتنی حسین عورت دیکھی تھی کہ اُف شاید میں اُسے مرتے دم تک نہ بھلا سکوں۔ اس کے اوپری ہونٹ کے گوشے پر وہ قیامت تھا..... بقول شاعر.....!“

حمید کو اچھی طرح یاد نہیں کہ منیجر نے کون سا شعر پڑھا تھا کیونکہ اس نے اس حسین

عورت کا جو طیلہ بتایا تھا وہ نیگم شوخ کے علاوہ اور کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت چکا ہے۔ مگر چونکہ بڑے آدمیوں کی سرپرستی اُسے حاصل ہے۔ اسلئے ہمیشہ آزاد ہو جاتا ہے۔ میں وہ شہر کی طرف کیا دھیان دیتا۔“

”کون ہے..... نام بتاؤ۔“

سرخ رومال

حمید نے فون پر فریدی کو ان حالات کی اطلاع دینی چاہی لیکن وہ گھر پر نہیں ملا۔ بڑی

مشکلوں سے اس کا سراغ مل سکا۔ وہ اس وقت برٹرام روڈ کی پولیس چوکی پر موجود تھا۔

سارے حالات سننے کے بعد بولا۔ ”شکریہ حمید۔ تم نے بڑا کام کیا۔ یہ راجو یا آدمی لسٹ

پر آ رہا ہے۔ تم آج کل بہت شاندار جا رہے ہو۔ عورتوں کے لئے تم نے ہمیشہ شاندار کارنامے

انجام دیئے ہیں۔ اچھا اب تم گھر واپس جاؤ۔ شام تک وہیں ملاقات ہوگی۔“

مگر شام تک فریدی گھر نہیں آیا۔ حمید نری طرح الجھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ باہر جائے

یا فریدی کا انتظار ہی کرتا رہے۔ اس نے اسی انداز میں اُسے گھر جانکی ہدایات کی تھی جیسے اپنی

آمد پر اُسکی موجودگی ضرور سمجھتا ہو۔ حمید بیٹھا جھک مارتا رہا۔ اسی دوران میں قاسم کی کال آئی۔

”کیا بات ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”بات نہیں بات کا باپ ہے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”تم سالے اس کے مار دوں گا۔“
 بنے ہو۔ وہ مجھ پر غراتی ہے۔“

”مجھے اس پر بھی خوشی ہوگی کیونکہ تمہارے مرنے سے میری بہن بیوہ ہو جائے گی اور پھر

”چپلیں لگائے گی تمہارے..... ابھی کیا ہے۔“

کسی اچھے آدمی سے اس کی شادی بھی ہو سکے گی۔“

”ناگنیں چیر کر پھینک دوں گا۔“

”چپ راہو۔“ قاسم کی دھاڑنے آخر کار فون کی لائن خراب کر دی۔

”اور میں تمہیں جیل میں سزا دوں گا۔“

مگر غنیمت یہی تھا کہ فریدی کی کٹھنی میں تین فون تھے اور ہر ایک کی لائن الگ تھی۔ نمبر بھی

”اے جا جا..... ڈیل میں ٹھہراؤں گے۔“ غالباً دوسری طرف سے قاسم اُسے مزاحیف تھے۔ تھوڑی دیر بعد لیبارٹری والے فون کی گھنٹی کی آواز آئی اور حمید دوڑتا ہوا اوپر آیا۔

کال فریدی کی تھی۔

رہا تھا۔

”کیا ہے..... خواب گاہ والے فون کی لائن خراب ہے کیا۔“ اُس نے پوچھا۔

”تم چاہتے کیا ہو۔“

”شاید لائن ہی خراب ہے۔“

”تمہاری موت!“

”ایک ملاح کے میک اپ میں تمہیں سونا گھاٹ پہنچنا ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔ میں تم سے پہلے نہیں مردوں گا ورنہ تمہاری لاش کون گھسیٹے گا۔“

”لیکن پھر آپ میری ملاحیوں پر اعتراض نہ کیجئے گا۔“

”گھسیٹ کر دیکھو..... کیا تماشا دکھاتا ہوں۔“

”سنجیدگی اختیار کرو۔“ فریدی نے درشت لہجے میں کہا۔

”تم آج رات کو مر جاؤ گے۔“

”کر لی..... لیکن مقصد کیا ہے۔“

”اے ہٹ.....!“ قاسم نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

”مقصد وہیں بتاؤں گا۔“

”یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مز شوخ کی پیشین گوئی ہے۔“

”مگر سونا گھاٹ پر کس جگہ۔“

”ارے باپ رے..... نہیں الا قسم.....!“

”جہاں مامی گیدوں کی کشتیاں رہتی ہیں۔“

”جب دم نکلنے لگے تو مجھے فون کر دینا۔ کیا تمہیں اپنے سر کا پچھلا حصہ کچھ بھاری

”اچھی بات ہے..... میں سمجھ گیا۔“

”ساگ رہا ہے۔“

”کیا سمجھ گئے!“

دوسری طرف خاموشی رہی پھر یک بیک قاسم کی آواز آئی۔ ”غاں..... غاں..... بھاری لہجہ رہا

”الفریڈ راج یا راجو کا چکر ہے۔“

”خدا تم پر رحم کرے۔“ حمید نے دردناک آواز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے..... ایسا ہی ہو۔ تمہیں ٹھیک آٹھ بجے وہاں پہنچ جانا چاہئے۔ تمہارے سر پر

”قیوں..... قیوں.....!“

”سرخ رنگ کا رومال ہوگا۔“

”اس نے یہی علامت بتائی تھی۔“

”پہنچ جاؤں گا۔“

”اے حمید..... سالے.....!“ قاسم حلق پھاڑ کر دھاڑا۔ ”اگر میں مر گیا تو تمہیں

”دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ مزرشوخ کا اغوا اسکی سمجھ سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت چھ بجے تھے۔ اس نے میک اپ کیا اور اندھیرا گہرا ہونے کا انتظار کرنا۔ اس نے ایک ریوالور اور ساٹھ راؤنڈ اپنے ساتھ رکھنے کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ سونا گھاٹ پر زیادہ تر مای گیر آباد تھے۔ یہاں کچھ بڑی عمارتیں بھی تھیں جن میں مای گیر کمپنیوں کے دفاتر اور کولڈ اسٹوریج تھے۔ دو ایک گھنٹیا قسم کے ہوٹل اور بار بھی تھے۔ اکثر سرمایہ داروں نے اپنے لئے سرماؤز بھی بنوا رکھے تھے۔

مید ٹھیک اسی حصے میں رک گیا جہاں کچھ دور پانی میں بیٹھا بادبانی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ایک آدی اس کے قریب سے کہتا ہوا گزر گیا۔ ”ڈریک بار پلیر.....!“ وہ فریدی ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر فریدی ہوتا تو چال اور آواز بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے کشتیوں کے مستوبوں سے لٹکنے والی لال ٹینوں کی دھندلی روشنی میں اس کی ہلک جھلک دیکھی تھی۔ وہ کچھ در تک نظر آتا رہا پھر چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی اسے نگل گئی۔ حمید بھی بستی کی طرف چل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈریک بار کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ گھنٹیا قسم کے نشہ باز جہاز راں ہوا کرتے تھے اور صرف نام کی بار تھی، ورنہ حقیقتاً وہاں شراب بجائے کشیدنی قسم کے نشوں کا غیر قانونی بیوپار ہوتا تھا۔

چرس اور افیون کے شائق غیر ملکی جہاز رانوں کے لئے یہ بہترین جگہ تھی۔ بیڑے سامنے رکھ کر وہ چرس اور کشیدنی افیون کے سگریٹ پیا کرتے تھے۔ اس طرح پولیس کی مدد کا خدشہ بھی باقی نہیں رہتا تھا۔

حمید بار میں داخل ہو کر ایک خالی میز پر جم گیا۔ پھر ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ آدی اسکے سامنے والی کرسی پر بیٹھتا ہوا آہستہ سے بولا۔ ”اب رومال کھول کر جیب میں رکھ لو۔“ حمید بیساختہ چونک پڑا لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ آدی نے گھاٹ کے قریب اسے ڈریک بار میں پہنچنے کا مشورہ دیا تھا اور یہ تھا کون؟ الفریڈ یا راجو..... وہی جس کا نام سننے ہی فریدی نے بڑے پر جوش انداز میں اسے شاباش دی تھی۔

حمید کا ذہن بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے دوست۔“ راجو نے آگے جھک کر آہستہ سے پوچھا۔ ”جہیں میرے نام سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔“ حمید نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”گڈ.....!“ راجو نے اسے پسندیدگی سے دیکھتے ہوئے سر ہلایا پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولا۔ ”جہیں کس نے بھیجا ہے۔“

”میں یہاں فضول بکواس سننے کے لئے نہیں آیا۔“ حمید نے اسے گھورنا۔ ہوئے آ۔ ”میں نے تو تم سے نہیں پوچھا کہ تم کون ہو یا تمہارا نام کیا ہے۔“ ”ویری گڈ.....!“ راجو مسکرا کر بولا۔ ”کچھ پیو گے۔“ ”نہیں.....!“ حمید غرلا۔ ”میں صرف اسی صورت میں پیتا ہوں جب گھر پر پڑے رہنا ہو۔“ ”بہت عمدہ۔ میں ایسا ہی آدی چاہتا ہوں۔“ راجو بولا۔ ”تھوڑی دیر اور ٹھہرو پھر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ حمید کچھ نہ بولا۔ وہ بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ان میں تیسرے آدی کا اضافہ ہو گیا۔ یہ بھی راجو کی طرح جہاز رانوں کے سے لباس میں تھا لیکن اس کے چہرے پر گھنی ڈاڑھی تھی۔ اسکے آتے ہی راجو اٹھ گیا۔ حمید بھی اٹھا اور یہ لوگ گھاٹ کی طرف چل پڑے۔ نیا آنے والا ابھی تک ایک بار بھی نہیں بولا تھا۔ حمید کو کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہو۔ وہ بھی خاموش سے چلا رہا۔ گھاٹ پر پہنچ کر وہ ایک کشتی میں بیٹھ گئے۔ ہوا اس وقت زیادہ تیز نہیں تھی۔ اس لئے بادبان کھول دیا گیا اور راجو نے چپو سنہال لئے۔ سمندر کی سطح پر سکون تھی۔

”اب کیا دیر ہے۔“ نئے آنے والے نے پوچھا اور حمید یک بیک چونک پڑا۔ اگر اندھیرا نہ ہوتا تو وہ دونوں ہی اس کے چہرے پر استعجاب کے آثار دیکھ لیتے کیونکہ یہ آواز پروفیسرشوخ کے بھتیجے داؤد کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ داؤد جسے آج ہی حمید نے اپنا چ آدیوں کی بیویوں دار کرسی پر دیکھا تھا۔

اب حمید اس فکر میں پڑ گیا کہ کھیل کی طرح بگڑنے نہ پائے۔ اُسے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

”زیدی سے تم نے وضاحت نہیں طلب کی۔“ داؤد نے پوچھا۔

”نہیں..... انہوں نے مزید کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”میں اسے درست نہیں سمجھتا۔“ داؤد نے کہا۔ پھر حمید کو مخاطب کر کے بولا۔

”کیوں جناب کیا آپ اپنے متعلق کچھ نہیں بتائیں گے۔“

”نہیں!“ حمید کا لہجہ درشت تھا۔

”پھر کیسے کام چلے گا۔“

”میں کام کرنے کے لئے آیا ہوں۔ یہ سوچنے کے لئے نہیں آیا کہ کام کیسے چلے گا۔“

”تم کیسے آدی ہو۔“ داؤد نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”اگر زیدی صاحب کا معاملہ نہ ہوتا تو اس لہجے کا مزہ چکھا دیتا۔“ حمید غرایا۔

”آپ بات نہ بڑھائیے جناب۔“ راجو نے داؤد سے کہا۔ ”ہر آدی کا طریقہ الگ ہوتا

ہے۔ مجھے یہ طریقہ بے حد پسند ہے۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف کام سے

غرض ہونی چاہئے۔“

داؤد خاموش ہو گیا اور حمید بھی کچھ نہیں بولا۔ کشتی سمندر کا پرسکون سینہ چیرتی رہی، چپوؤں

کی ”شباشپ“ سے فضا مرتعش ہو رہی تھی۔

راجو کے بازو ابھی تک شل نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک مشاق قسم کا کشتی بان معلوم ہوتا

تھا۔ کچھ دیر بعد کشتی فن آئی لینڈ کے ایک ویران ساحل سے جا لگی۔ راجو نے پتو اتر رکھ دیئے اور

خفگی پر کود گیا۔ پھر وہ دونوں بھی اترے۔

اب تیرے کے جس حصے میں وہ چل رہے تھے بالکل ویران اور تاریک تھا۔ حمید کا

ذہن مختلف قسم کے خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

دھنساؤہ چلتے چلتے رک گیا۔ داؤد بھی رکا۔

یہ کیا قصہ تھا؟ حمید کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس ایک عورت کے اغوا کے لئے اتنی

سری۔ پورا ایک گروہ جس کے لئے سرگرم عمل تھا اور پھر اب وہ لوگ کیا چاہتے تھے۔

داؤد نے کتنا خطرہ مول لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت وہ پروفیسر کو دھوکے میں رکھ کر

گھر سے باہر ہوگا۔

حمید سوچنے لگا کہ پروفیسر بھی نرا گاؤ دی نہیں ہے۔ داؤد کے متعلق اس نے پہلے ہی

شبہ ظاہر کر دیا تھا۔ لہذا یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس وقت دھوکا ہی کھا گیا ہوگا۔ پھر؟

داؤد سے ڈرتا ہے۔

کشتی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ رات کے سرمئی غبار میں راجو کی متحرک پرچھائیں

نظر آ رہی تھیں جو کشتی کھے رہا تھا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ داؤد نے پھر کہا۔

”دیکھیے..... یہ ایسا آسان کام تو ہے نہیں۔“ حمید نے راجو کی آواز سنی۔ ”بہر حال

انتہائی جدوجہد کر رہے ہیں۔“

”اس اسکیم کا کیا رہا۔“

”اس اسکیم کے لئے یہ صاحب آئے ہیں۔“ غالباً حمید کی طرف اشارہ تھا۔

یہ کون ہیں۔“

”میں خود بھی نہیں جانتا لیکن کام کے آدی معلوم ہوتے ہیں۔“

”کیا بات ہوئی۔“ داؤد غرایا۔

”زیدی صاحب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا جو آدی وہ

گے ہر لحاظ سے کارآمد ہوگا۔“

اب معاملہ حمید کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ سوچنے لگا شاید ان کی کسی اسکیم کا علم فریدی

ہے۔ اسی لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ یہ کتنا خطرناک تھا۔ اگر حمید سے نادانستگی میں

بھی لغزش ہو جاتی تو سارا کھیل بگڑ جاتا۔ اُسے چاہئے تھا کہ صورتحال سے پہلے ہی آگاہ کر دیا

”تو تم اپنے متعلق نہیں بتاؤ گے۔“ راجو نے غصیلی آواز میں کہا۔

”نہیں.....!“ حمید کا لہجہ پرسکون اور سرد تھا۔

”اگر ہم تمہیں یہاں مار ڈالیں تو.....!“ راجو کا لہجہ اب بھی درشت تھا۔

”کوشش کر کے دیکھو۔“

راجو حمید کی طرف بڑھا لیکن حمید نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر

اور وہ داہنے بازو کے بل زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کے حلق سے کراہ نکلی۔

”میرے ہاتھ میں بغیر آواز کا ریوالور ہے۔ تم لوگ اپنی جگہوں سے ہلنا بھی منہ کر سکتے ہیں۔“

حمید نے گرجدار آواز میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ راجو نے زمین پر پڑے ہوئے کہا۔

”شاید میرا ساتھ علط آدمیوں سے پڑ گیا ہے۔“ حمید نے اپنے لہجے میں سفاکی سی باتیں ہوئی ہوں۔ آبادی میں پہنچ کر راجو نے ایک چھوٹے سے مکان کا قفل کھولا اور وہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر میں اس کی پروا کم کرتا ہوں۔ بتاؤ تم لوگ کون ہو۔ ورنہ مجھے یہاں اندر داخل ہوئے۔“

لاشیں ملیں گی۔“

جس کمرے میں راجو نے ٹھہرنے کے لئے کہا وہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ درمیان میں ایک ”ہم تمہارا امتحان کر رہے تھے دوست۔“ راجو نے آہستہ سے کہا۔ ”ریوالور جیب میں رکھنا میری جگہ جس کے گرد کریاں پڑی ہوئی تھیں۔“

”بکو اس ہے۔“ حمید غرایا۔ ”تم اب مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔“

”پھر تمہاری دانست میں ہم کون ہیں۔“ راجو نے پوچھا۔

”پولیس.....!“

اس پر نہ صرف راجو نے بلکہ داؤد نے بھی قہقہہ لگایا۔

”بس بس..... بالکل ٹھیک ہے۔ تم ایسے ہی آدمی معلوم ہوتے ہو کہ ہر قسم کا کام ادا

دے سکو گے۔“ راجو نے کہا اور اٹھ بیٹھا۔ پھر بولا۔ ”یہ ریوالور رکھ لو دوست..... میں تم

بالکل مطمئن ہوں۔“

”لیکن مجھ سے معاوضے کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔“ حمید بڑبڑایا۔

”پہلے تم کام سن لو..... اس کے بعد جو معاوضہ بھی مانگو گے دیا جائے گا۔“

”اٹھو.....!“ حمید ریوالور جیب میں رکھتا ہوا غرایا۔

راجو زمین سے اٹھ گیا۔

”کام کیا ہے۔“ حمید نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہتا۔“

”چلو کچھ دور اور چلنا پڑے گا۔ پھر ہم بیٹھ کر اطمینان سے گفتگو کریں گے۔“ راجو نے کہا۔

”کیا پھر کوئی امتحان۔“

”نہیں دوست!“ راجو اس کا شانہ تھپتھا کر بولا۔ ”اتنا کافی ہے۔ ہم تم پر ہر طرح اعتماد

حمید پھر ان کے ساتھ چلنے لگا۔ ان دونوں کو سبق دینے کے بعد اس کی ذہنی اور جسمانی

توانائی بڑھ گئی تھی اور وہ اتنی لا پرواہی سے ان کے ساتھ چل رہا تھا جیسے کچھ دیر قبل ان سے چند

جس کمرے میں راجو نے ٹھہرنے کے لئے کہا وہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ درمیان میں ایک

”ہم تمہارا امتحان کر رہے تھے دوست۔“ راجو نے آہستہ سے کہا۔ ”ریوالور جیب میں رکھنا میری جگہ جس کے گرد کریاں پڑی ہوئی تھیں۔“

”بکو اس ہے۔“ حمید غرایا۔ ”تم اب مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔“

”پھر تمہاری دانست میں ہم کون ہیں۔“ راجو نے پوچھا۔

”پولیس.....!“

اس پر نہ صرف راجو نے بلکہ داؤد نے بھی قہقہہ لگایا۔

”بس بس..... بالکل ٹھیک ہے۔ تم ایسے ہی آدمی معلوم ہوتے ہو کہ ہر قسم کا کام ادا

دے سکو گے۔“ راجو نے کہا اور اٹھ بیٹھا۔ پھر بولا۔ ”یہ ریوالور رکھ لو دوست..... میں تم

بالکل مطمئن ہوں۔“

”لیکن مجھ سے معاوضے کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔“ حمید بڑبڑایا۔

”پہلے تم کام سن لو..... اس کے بعد جو معاوضہ بھی مانگو گے دیا جائے گا۔“

”لیکن مجھ سے معاوضے کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔“ حمید بڑبڑایا۔

”پہلے تم کام سن لو..... اس کے بعد جو معاوضہ بھی مانگو گے دیا جائے گا۔“

”لیکن مجھ سے معاوضے کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔“ حمید بڑبڑایا۔

”واقعی مسئلہ ہے۔“ حمید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ ”نام“
 بتاؤ۔ ممکن ہے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”تم ہمت ہار رہے ہو شاید۔“ راجو مسکرایا۔
 ”کیا دیکھنا چاہتے ہو۔“ حمید ایک زہریلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”کیا تمہاری

”میری توہین نہ کرو۔“ حمید غریبا۔ ”مجھے نام اور پتہ بتاؤ۔ تم لوگ مجھ سے واقف نہیں۔“
 ”میں بدتمیزوں کی زبان سمجھنے لیا کرتا ہوں۔“ داؤد غریبا اور حمید اپنی زبان نکال کر بیٹھ گیا۔
 ”سنو تو..... تم بہت جلد غصے میں آ جاتے ہو۔“ راجو نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”نام“

”سنو تو..... تم بہت جلد غصے میں آ جاتے ہو۔“ راجو نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”نام“
 تصویر اس لفافے میں ہے۔ کیا تم پڑھ سکتے ہو۔“
 حمید زبان اندر کر کے بولا۔ ”میں ہر وقت ہر ایک کا چیلنج قبول کرنے کو تیار رہتا ہوں۔“

اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور حمید نے کہا۔ ”تحریر کس زبان میں ہے۔“
 ”اردو میں۔“
 ”یار تمہیں مذاق بھی گراں گزرتا ہے۔“ راجو نے ہنس کر کہا۔

”نہیں تو..... میں بھی مذاق ہی کے موڈ میں ہوں۔“ حمید نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔
 ”پڑھ لوں گا..... کیا اسے کھول ڈالوں۔“
 ”ظاہر ہے کہ یہ اسی لئے دیا گیا ہے۔“

حمید نے لفافہ کھول ڈالا۔ یہ ایک معمر آدمی کی تصویر تھی۔ نام کے ایل بھٹی تھا۔
 ۵۳/۱ نکلس لین۔ حمید نے سوچا یقیناً کوئی بڑا آدمی ہوگا کیونکہ نکلس لین میں معمولی
 کے لوگ نہیں رہتے تھے۔
 ”کیا تم میں سے کوئی وہاں موجود ہوگا۔“ حمید نے پوچھا۔
 ”ہم میں سے کسی کی موجودگی وہاں ضروری نہیں ہے۔“ راجو بولا۔
 ”اچھی بات ہے تو اب میں چلوں۔“

حمید نے لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ وہ دونوں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔
 نے میز پر کہنیاں ٹیک کر آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ”معاوضہ کتنا ہوگا۔“
 ”اگر تم کل رات کو اسی وقت اسے یہاں لے آؤ تو دس ہزار لیکن اگر تم اپنے

سرکاری سراغ رسانوں کو لگا لائے تو انجام کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“
 ”یقیناً..... اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اگر وہ تمہارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک
 یہ کام بہ آسانی کر لو گے۔“

”تمہیں سادہ لباس والوں کی وجہ سے تشویش ہے۔“ حمید نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”اور اسکی کیا گارنٹی ہے کہ کام بخوبی انجام پا جائے۔“
 ”تم کوئی فرشتے تو نہیں کہ صبر کر لو گے۔“ راجو مسکرایا۔

”تم کوئی فرشتے تو نہیں کہ صبر کر لو گے۔“ راجو مسکرایا۔
 ”صبر بھی کر لوں گا مگر اس صورت میں آس پاس کی زمین سرخ نظر آئے گی۔“
 ”اس کے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ کسی ایسی عمارت کا انتخاب کرو جس کے متعلق کوئی
 بتانہ سکے کہ وہ کس کے قبضے میں ہے، میں اسے وہیں لاؤں۔ تم لوگ قطعی الگ رہو۔ جب
 تمہیں اچھی طرح اطمینان ہو جائے کہ کوئی خطرہ نہیں ہے تب اس عمارت میں قدم رکھو۔“

لا پرواہی سے کہا۔

”تجویر معقول ہے۔“ راجو نے داؤد کی طرف دیکھ کر کہا۔

داؤد نے صرف سر ہلا دیا۔

پھر کچھ دیر بعد راجو نے کہا۔ ”یہی عمارت مناسب رہے گی۔“

”تم جانو.....!“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔ ”مجھے جتنا بھی کرنا ہے کر ڈالوں گا۔“

حمید اٹھنے لگا اور راجو نے کہا۔ ”یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تم کچھ پیتے نہیں ہو۔“

”جو کچھ میں پیتا ہوں تم پلا نہیں سکو گے۔“

”کیا پیتے ہو۔“

”خون.....!“ حمید اپنی آنکھوں میں سفاکانہ چمک سی پیدا کر کے بولا۔

”یار..... تم بڑے تیس مار خاں معلوم ہوتے ہو۔“ راجو مسکرایا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ

یہی شہر میں رہنے کے باوجود بھی ہم پہلی بار ملے ہیں۔“

”تمہیں حیرت نہ ہونی چاہئے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خریہ اور اعلا

پر اپنے لفنگے پن سے لوگوں کو مرعوب کرنے کے شائق ہوتے ہیں۔“

”گھرے معلوم ہوتے ہو۔“

”اچھا! اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ حمید نے کہا اور اُن کے جواب کا

کئے بغیر مکان سے نکل آیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ ساتھ ہی

اس کی فکر بھی تھی کہ کہیں کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔

ساحل پر بیٹھ زیادہ تھی۔ لوگ لالچوں کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ آج نہ

کیوں لالچیں بھی کم تھیں۔ دفعتاً حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے جیب میں ہاتھ

دیا ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا مگر پیچھے ایک بھی ایسا آدمی نہیں نظر آیا جس پر وہ شبہ کر سکتا

اس کا ہاتھ اسی جیب میں رینگ گیا اور انگلیاں ایک مڑے مڑے کاغذ سے ٹکرائیں وہ اُن

رہا لیکن جیب سے باہر نہیں نکالا۔

اُس کا اضطراب بڑھتا رہا اور آخر کار اُس نے فیصلہ کیا کہ اسے قریبی رستوران

جا کر اس کاغذ کو دیکھنا چاہئے۔

ساحل پر ہی کئی رستوران تھے۔ حمید نے ایک کی راہ لی۔ اتفاق سے اُسے ایک خالی میز

بھی ایک گوشے میں مل گئی۔ یہ تفریح کرنے والوں کی واپسی کا وقت تھا۔ لہذا رستوران خالی

ہوتے جا رہے تھے۔ حمید نے کافی کا آرڈر دے کر جیب سے کاغذ نکالا جس پر تحریر تھا۔

”حمید..... بہت اچھے جا رہے ہو لیکن اب تم گھر واپس نہیں جاؤ گے۔ ارجن پورے کی

داس بلڈنگ کے پندرہویں فلیٹ میں تمہارا قیام ہوگا۔ یہ دوسری منزل پر ہے۔ داس بلڈنگ

پانچویں گلی میں ہے۔ اُسے تلاش کرنے میں تمہیں کوئی دشواری نہیں پیش آئے گی۔ جس فلیٹ

میں تمہیں قیام کرنا ہے وہاں ایک آدمی ہوگا تم اُسے صرف میرے نام سے آگاہ کر دینا اور وہ

تمہارے لئے ساری سہولتیں بہم پہنچا دے گا۔“

لکھنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا لیکن یہ تحریر فریدی کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

حمید کاغذ کو جیب میں ٹھونس کر کافی پینے لگا۔

اجنبی لوگ

حمید کی الجھن بڑھ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس ایک عورت کے لئے کیا کیا ہو رہا ہے۔

ہو سکتا ہے یہ بھٹی بھی اُس کے عاشقوں میں سے ہو۔ کوئی ایسا عاشق ہو جو اغواء کنندگان کے

لئے پریشانی کا باعث بن سکتا ہو۔

وہ ارجن پور کی پانچویں گلی میں داخل ہوا۔ داس بلڈنگ کا پتہ لگانے میں دیر نہیں لگی۔

حمید نے دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا۔

”فریدی۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔ وہ آدمی احتراماً خفیف سا جھکا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

حمید اندر آیا۔ وہ اس آدمی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کا لباس نچلے طبقے کے

لباس بھی نچلے ہی طبقے والوں کا سا تھا۔
حمید اٹھ کر بیٹھ گیا۔

آنے والے نے کہا۔ ”کیا بہت تھک گئے ہو۔“

اب حمید نے آواز سے اسے پہچانا۔ وہ فریدی تھا۔

”نہیں کچھ ایسی تھکن تو نہیں ہے۔“ حمید نے غصیلے لہجے میں کہا اور فریدی ہنسنے لگا پھر

بولاً۔ ”اس عمارت میں جو کچھ بھی گفتگو ہوئی تھی اس سے میں واقف ہوں۔ لہذا اس سے پہلے کی باتیں بتاؤ۔“

”عمارت کی گفتگو کا علم آپ کو کیسے ہوا۔“

”وہاں کئی ڈکٹافون موجود ہیں۔ لہذا وہاں ہونے والی ہر گفتگو مجھ تک پہنچ جاتی ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔“

حمید نے سونا گھاٹ سے فن آئی لینڈ تک کے واقعات دہرائے اور پھر بولا۔ ”اگر مجھ

سے کوئی لغزش ہو جاتی تو..... آپ کو صورت حال سے پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہئے تھا۔“

”میں تم میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتا ہوں اگر انگی پکڑ کر چلاتا رہا تو تمہاری صلاحیتیں رنگ

آلود ہو جائیں گی۔ میں نے تمہیں اس طرح خطرات میں دھکیلتا رہوں گا۔“

”کیا اس میں بھی کوئی خطرہ تھا۔“

”کیوں نہیں! کیا تمہاری ذرا سی لغزش تمہیں موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی تھی۔“

”مجھے لڑکیوں کے جھرمٹ میں دھکا دے دیجئے۔ تب البتہ پھر آپ کو وہاں سے میری

لاش ہی اٹھانی پڑے گی۔ ویسے میں کافی سخت جان ہوں اور اسے لکھ لیجئے کہ میری موت میں

کس مرد کا ہاتھ ہرگز نہیں ہوگا۔“

”یہ کہو اس کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھو۔ وہ لفافہ نکالو۔“

حمید نے لفافہ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔

فریدی اسے دیکھتا رہا پھر حمید کو واپس کرتا ہوا بولا۔ ”کل رات تم اسے وہاں سے لے جاؤ

آدمیوں کا سا تھا لیکن وہ خود نچلے طبقے کا آدمی ہرگز نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کا رنگ بہت ملاز
تھا۔ آنکھیں ہلکے سبز رنگ کی تھیں۔ بال گھنگھریالے جن کی رنگت گہری کتھتی تھی اور پڑ
فراخ۔ اس کے ہاتھ بھی محنت کشوں کے سے سخت اور کھر درے نہیں تھے۔

”آپ آرام سے رہئے۔“ اس نے یہ جملہ اردو ہی میں کہا لیکن لہجے کی اجنبیت پکارا
کر کہہ رہی تھی کہ وہ کوئی غیر ملکی ہے۔

”شکریہ۔“ حمید ایک خالی پلنگ پر دراز ہوتا ہوا بولا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔

”کیا آپ کچھ کھائیں گے۔“

”نہیں شکریہ! حاجت نہیں ہے۔“ حمید نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر بولا۔ ”اردو بولنے میں آپ کو زحمت محسوس ہوتی ہے۔ آپ اپنی ہی زبان میں

کریں تو بہتر ہے۔“

حمید نے سوچا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کوئی انگریزی، جرمن یا ذ انسیسی ہوگا۔

اس کے جواب میں اس آدمی نے کچھ کہا لیکن حمید احمقوں کی طرح منہ پھاڑ کر

کیونکہ اس نے جو زبان استعمال کی تھی وہ اس کے لئے بالکل نئی تھی۔

وہ آدمی مسکرایا۔ لیکن انداز مضحکہ اڑانے کا سا نہیں تھا۔

”آپ اردو ہی بولیں۔“ حمید نے سر کھجا کر کہا۔

”اگر آپ سونا چاہیں تو بستر.....!“

”نہیں شکریہ۔“ حمید نے کہا۔ ”میں ابھی سونا نہیں چاہتا۔“

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے پوچھے کہ تمہارا فریدی سے کیا تعلق ہے۔ لیکن

خیال کے تحت اس نے ایسا نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد پھر دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اس آدمی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

اندر آنے والے نے اپنی کلائی کھول کر اسے کچھ دکھایا اور وہ آدمی اتنا جھکا کہ اس پر رکنا

گمان ہونے لگا۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہو کر ایک طرف ہٹ گیا۔ نو وارد ایک معمر آدمی تھا اور

گئے۔“ کیا یہ حقیقت ہے کہ وہاں سادہ لباس والوں کا پہرہ ہے۔“

”ہاں..... یہ حقیقت ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”مگر تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں چاہتا ہوں“

”لیکن.....!“ اس نے کچھ دیر بعد سر اٹھا کر کہا۔ ”آپ کو اس کا علم کیسے ہوا تھا کہ زیدی وہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ جائے۔“

”ان کے لئے کوئی مددگار تیار کیا ہے۔“

کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔ ”وہ آدمی جسے سونا گھاٹ پہنچنا تھا اس کا کیا بنا“

”دفن آئی لینڈ والا وہ مکان حقیقتاً اُن کی مشورہ گاہ ہے۔ وہ وہیں اکٹھے ہو کر اپنے مسائل

”وہ حراست میں ہے۔“

”لیکن..... اگر..... شاید ڈاکٹر زیدی نے اُسے وہاں بھیجا تھا۔ اگر اُس کی وجہ“

”میرے خدا۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔ ”وہ شیطان کی محبوبہ مسائل بھی رکھتی ہے۔“

”لا تعداد“ فریدی مسکرایا۔ پھر بولا۔ ”ڈاکٹر زیدی پر عرصہ سے میری نظر تھی۔ داؤد اور

”وہ.....!“ فریدی مسکرایا۔ ”وہ بیچارہ بھی میرے ڈر سے روپوش ہو گیا ہے۔ لیکن اگر تمہاری دریافت ہیں۔ اب دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ داؤد ہی اُن کا سرغنہ ہے۔ لیکن

داؤد سے فون پر گفتگو کر لیتا ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”وہ بھی میری قید میں ہے لیکن داؤد سے فون پر گفتگو کرتا رہتا ہے اور اس وقت اس کا

کھوپڑی پر پستول کی نال ہوتی ہے، جو کچھ اس سے کہا جاتا ہے وہی اسے کہنا پڑتا ہے۔“

”اوہ.....!“ حمید اپنا سر کھجاتا ہوا بولا۔ ”وہ بیچ مچ شیطان ہی کی محبوبہ معلوم ہوتی ہے۔“

”نہیں.....!“

”ہاں..... اور غالباً تمہاری لاف و گزاف نے انہیں اس بات پر مجبور کر دیا ہے۔“

”میں جس وقت یہاں پہنچا ہوں ایک آدمی عمارت کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ انہیں میں

سے ایک ہے۔ میں اُسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد ہی میں عمارت میں

غل ہوا تھا۔ بہر حال میرا خیال ہے کہ یہ نگرانی مسٹر بھٹی کے انواء کے بعد تک جاری رہے

لیا۔ اس لئے تمہیں بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“

”یہ بات آپ نے پہلے سے کیوں بتادی۔“ حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”کیونکہ اس اسٹج پر بگڑا ہوا کام کسی طرح نہیں سنہیلے گا۔ اگر آج رات والا کھیل بگڑ بھی

حمید نے اشارے سے پوچھا کہ وہ کون ہے لیکن فریدی نے اپنی بائیں آنکھ دبا دی۔

جاتا تو اُسے سنبھالا جاسکتا تھا۔

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ اس شخص مسٹر بھٹی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

آخر وہ اس کے بارے میں فریدی سے پوچھ ہی بیٹھا۔ اس پر فریدی نے ایک قہقہہ لگایا پھر بولا۔ ”کیا تم اس پر یقین کر لو گے کہ اصلی مسز شوخ وہی ہے۔“

”ہائیں.....!“ حمید منہ پھاڑ کر رہ گیا۔

”ہاں اس ناول کا نام بہرام کی خالہ عرف ادا اس چوترا ہے۔“

”عرفیت تو بڑی ترقی پسند قسم کی ہے۔“

فریدی سگار سلگانے لگا۔

”آپ بتانا نہیں چاہتے۔“ حمید نے کہا۔

”بتا تو دیا۔“

حمید نے ہونٹ سکڑ لئے۔ وہ بھی جیب میں تباہ کوکا پاؤچ تلاش کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اُس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کیونکہ اندر سے ایک لڑکی پر کافی کی ٹرے اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ بھی غیر ملکی ہی تھی اور

قبول صورت۔ حمید نے ایک طویل سانس لی اور فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ارے اس کی ضرورت نہیں تھی بے بی۔“ فریدی نے انگریزی میں کہا۔

”آپ لوگ بہت تھک گئے ہوں گے جناب۔“ اُس نے بڑے ادب سے جواب

ٹرے میز پر رکھ کر پیالیاں سیدھی کرنے لگی۔ اب وہ تیسرا آدمی بھی ان کے قریب آگیا

وہ کافی پینے لگے۔ لڑکی بھی انہیں شامل تھی۔ کسی خوبصورت لڑکی کی موجودگی میں حمید

کھلے لگتی تھی اس نے لڑکی سے کہا۔ ”آپ لوگوں کو اس گندی بستی میں بڑی تکلیف ہوئی“

”نہیں کیپٹن! ایسا تو نہیں ہے۔“ لڑکی مسکرائی اور حمید تھیر رہ گیا۔ تو وہ اسے جانتی

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ کافی کے دو تین گھونٹ لینے کے بعد کرسی کی پشت سے ہٹا

سگار کے کش لے رہا تھا اور اس کی آنکھیں چھت کی طرف تھیں۔

”کیا آ۔۔۔ لوگ ہمیشہ یہیں رہتے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”ایسا بھی نہیں ہے۔“ لڑکی پھر مسکرائی۔ ”کیا آپ ہم لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

فریدی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور لڑکی سے بولا۔ ”ضروری نہیں ہے کہ کیپٹن حمید میرے ہر

راز میں شریک ہو۔ اس پر ہی کیا منحصر ہے۔ دنیا کا کوئی آدمی میرے متعلق سب کچھ نہیں جانتا۔“

لڑکی اور اس کے ساتھی کے چہروں پر حیرت کے آثار نظر آنے لگے لیکن حمید کو فریدی

کے اس جملے میں اپنی توہین نظر آئی۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اگر وہ دونوں

نہ ہوتے تو وہ بلاشبہ فریدی سے الجھ پڑا ہوتا۔

کچھ دیر بعد فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”اچھا تو اب میں جا رہا ہوں۔ کیپٹن حمید یہیں رہیں

گے اور تم۔“ اُس نے مرد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ دونوں فلیٹ سے باہر نکل گئے۔

لڑکی برتن سمیٹنے لگی اور حمید اٹھ کر اس کی مدد کرنے لگا۔

”اوہ..... آپ رہنے دیجئے کیپٹن۔“ اس نے کہا۔

”مجھے گھریلو کاموں سے بہت دلچسپی ہے۔ میں اکثر اپنی پڑوس کی عورتوں کے ہاتھ بٹایا

کرتا ہوں۔“

”نہیں.....!“ لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں..... اُن کے بچوں کیلئے کپڑے دھوتا ہوں۔ انہیں کھانا پکانے میں مدد دیتا ہوں۔

پڑوس کی جس عورت کا بچہ بیمار ہوتا ہے وہ مجھے فون کر دیتی ہے پھر اُسے کچھ نہیں کرنا پڑتا۔“

”آپ دونوں کے شوق عجیب ہیں۔ آخر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔“

”دراصل مجھے خدمت خلق کا شوق ہے۔ لیکن اپنی بیوی کی خدمت..... خدمت نہیں بلکہ

زن مریدی کہلاتی ہے یہاں میرے ملک میں..... میں تمہارے ملک کے متعلق نہیں جانتا۔“

”بہر حال مجھے ماؤں کا ہاتھ بٹانے سے بڑا سکون ملتا ہے۔“

”لیکن میں ماں تو نہیں ہوں۔“ لڑکی ہنسنے لگی۔

”پھر آپ اُن صاحب کی کون ہیں، جو کچھ دیر پہلے یہاں تھے۔“

”ہشت.....!“ لڑکی شرمیلے انداز میں مسکرائی۔ ”وہ میرا ساتھی ہے۔“

”شوہر.....!“

”نہیں ساتھی..... آپ نے بے تکلی باتیں کیوں شروع کر دیں۔“

”مجھے افسوس ہے اگر یہ باتیں آپ کو بے تکلی معلوم ہوتی ہیں۔“ حمید نے کہا اور پھر

پنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”کیوں؟ کیا بات ہے..... کیا کوئی تکلیف ہے۔“

”ہاں سینے میں بہت درد ہے۔“ حمید کراہتا ہوا لیٹ گیا۔ ”ابھی ابھی اچانک اٹھا ہے۔“

انی برازیل کی تھی۔

”تھی تو برازیل ہی کی۔“

”اوہ..... اسی لئے..... میں جب بھی برازیل کی کافی پیتا ہوں یہی کیفیت ہوتی ہے۔“

”اچھا..... دیکھئے میں ابھی آئی۔“ اُس نے کہا اور برتن سمیٹ کر اندر چلی گئی۔

حمید مسکراتا ہوا اپنے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی۔ اس کے

ایک شیشی تھی۔

”یہ دیکھئے..... اسے آہستہ آہستہ سینے پر مل لیجئے۔“ اُس نے حمید کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔

”مگر میں کیسے ملوں گا..... مجھ ہی نہیں بنے گا۔“ حمید نے مایوسی سے کہا۔

”بنے گا..... آپ کو کوشش تو کیجئے۔“

”نہیں بنے گا..... میں جانتا ہوں۔ ایسے کام خود اپنے ہاتھوں سے نہیں ہو پاتے۔“

”کوشش ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتی ہے۔ نیولین کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کیجئے۔“

ب۔ بیئر۔“ لڑکی نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ حمید اُلُو کا سامنہ لے کر وہ گلا

نا سامنہ رہ جانا محاورہ ہے لیکن محاورے حمید کو عموماً غلط معلوم ہوا کرتے تھے۔ لہذا اس محاورے کے مطابق حمید کو خواب گاہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔

دوسرا انخوا

اُلُو والی صبح خود اسی نے کی تھی۔ اسے توقع تھی کہ وہ اس لڑکی سے اپنے سینے پر مالش کرانے کا کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن صبح درد منب کش دوا نہ ہوا..... اور دوسرے صبح صبح کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ بیمار ہی کب تھا۔

بھئی کے انخوا کا مسئلہ ابھی تک حمید کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن بہر حال اسے وہ کام بام دینا تھا۔ فریدی نے دوسرے دن اُسے طریق کار سمجھا دیا۔

سات بجے شام تک حمید اور وہ غیر ملکی جس کے فلیٹ میں اس کا قیام تھا کنکس لین پہنچ گئے۔ وہ دونوں ایک بڑی شاندار کار میں آئے تھے۔ حمید پچھلے ہی دن کے میک اپ میں تھا۔ لیکن آج اس کے جسم پر میلے کچیلے لباس کی بجائے بہترین قسم کا سوٹ تھا اور اس کا سفید فام اٹھی کوئی ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا اُس کے ہاتھ میں ایک اسٹتھو سکوپ تھا۔

کار چمکانک کے اندر چلی گئی۔ حمید کو باہر کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے تھے۔ یہ اسی کے کھمکے کے لوگ تھے۔ حمید نے اس کا اندازہ بھی کر لیا تھا کہ ان لوگوں نے انہیں شہبے کی نظر سے دیکھا تھا۔

کار سیدھی پورج میں چلی گئی اور پھر حمید نے اُسے اس طرح موڑ کر اس کا پچھلا حصہ اُمدے کی میزھیوں سے لگا دیا جیسے ڈکے سے کچھ سامان نکال کر برآمدے میں رکھنا ہو۔

وہ دونوں اتر گئے۔ حمید کے ہاتھوں میں دواؤں کا بیگ تھا۔ پھر وہ نہایت اطمینان سے اندر گھستے چلے گئے۔

چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ لیکن سارے کمرے روشن تھے۔ فریدی کے بتائے ہوئے مطابق حمید کو خواب گاہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔

لیکن اس کی توقعات کے خلاف وہاں بھی قبرستان کا سا ماحول نظر آیا۔ مسمری، موثر سائیکس سنجال کی تھیں۔ حمید نے سوچا کافی منظم طور پر سارے کام ہو رہے ہیں۔

چاپ پڑے ہوئے آدمی کو اس نے فوراً ہی پہچان لیا کیونکہ بھٹی کی تصویر اس وقت بھی

جیب میں پڑی ہوئی تھی اور اُس نے آج دن میں کئی بار اس کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔

مگر.....! وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

”یہاں کوئی نوکر بھی نہیں نظر آتا۔“ حمید نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”مجھے خود بھی حیرت ہے ویسے کرل نے تو یہی کہا تھا کہ تم لوگ اُسے بہت آگاہ

نکال لے جاؤ گے۔ ہو سکتا ہے ان کا اشارہ انہیں آسانوں کی طرف رہا ہو۔“

حمید نے آگے بڑھ کر بھٹی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا لیکن نہ تو وہ چونکا اور نہ

آنکھیں میٹھیں۔

”یہ بیہوش ہے۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے اس پر حیرت نہیں ہے۔“ سفید فام ساتھی بولا۔ ”کرل کے کام ایسے ہی ہوتے

حمید نے دواؤں کا بکس کھول کر اُس میں سے ایک تھیلہ نکالا۔

اور پھر پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر مسمری خالی ہو گئی۔

”راہداری اور برآمدے کی روشنیاں گل کر آؤ۔“ حمید نے سفید فام ساتھی سے کہا۔

چلا گیا..... حمید کھڑا اس تھیلے کو دیکھتا رہا جواب خالی نہیں تھا۔

سفید فام ساتھی کی واپسی پر تھیلہ اٹھایا گیا اور پھر وہ اندھیرے ہی میں برآمدے

آئے۔ سفید فام ساتھی نے ڈکے اٹھائی اور حمید نے تھیلہ بڑی پھرتی سے اس میں ٹھونس

کار کو دھکیل کر اس کا رخ دوسری طرف کرتے ہوئے انہوں نے دروازے کھولے اور اندر بیچے میدان صاف تھا۔

ٹھیک اُسی وقت برآمدہ پھر روشن ہو گیا اور ان کی کار پھانک سے نکلی چلی گئی۔

بیچ کر حمید نے اُسے بائیں جانب موڑ دیا۔

”تعاقب کا خیال رکھنا۔“ اس نے مڑ کر سفید فام ساتھی سے کہا جو پچھلی نشست

دراز تھا۔ لیکن حمید نے خود ہی سادہ لباس والوں کو حرکت میں آتے دیکھ لیا۔ تین آدمی

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا تم خود ہی اسے عمارت تک نہیں لے جاسکتے؟“
”دیکھو دوست.....!“ راجو اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”ہم اپنا اطمینان کئے بغیر

اتنی بڑی رقم کیسے دے سکتے ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب صاف ہے۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہاں چل کر ہم دیکھیں گے کہ تم نے ہمیں

دھوکہ تو نہیں دیا۔“

”اوہ..... اچھا چلو۔ تم سمجھتے ہو شاید میں بھیٹی کے علاوہ اور کسی کو اٹھا لایا ہوں۔“

”میری جگہ تم ہوتے تو کیا سوچتے۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں بھی اطمینان کئے بغیر اتنی بڑی رقم کبھی نہ دیتا۔“

”گڈ..... اچھا تو اب چلو۔“

لانچوں کو وہیں چھوڑ کر وہ چاروں ہستی کی طرف چل پڑے۔ تھیلے کو دو آدمیوں نے اٹھا رکھا تھا۔

عمارت میں داخل ہو کر راجو نے صدر دروازہ بند کر دیا اور پھر حمید سے بولا۔ ”یاد تم بہت کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں مستقل طور پر تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔“
”اس سے کیا ہوگا۔“ حمید نے سوال کیا۔

”ہم دونوں ہی بہت زیادہ فائدے میں رہیں گے۔“

وہ ایک کمرے میں آئے اور راجو خاموش ہو گیا۔ یہاں پہلے ہی سے تین آدمی موجود تھے۔ ایک تو داؤد تھا اور اس وقت بھی وہ ڈاڑھی بی والے میک اپ میں نظر آ رہا تھا۔ دوسفید فام غیر ملکی تھے۔ ان کے داخل ہوتے ہی تینوں کے چہرے چمک اٹھے۔

”کیا رہا۔“ داؤد نے بے صبری سے پوچھا۔

”نچ۔“ راجو نے فخریہ انداز میں کہا۔ تھیلہ اتار کر میز پر رکھ دیا گیا اور حمید آگے بڑھ کر اُسے کھولنے لگا۔ تھیلے کا منہ کھلتے ہی راجو نے بیساختہ کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“

دوسری طرف حمید خود ہی لانچ کو اسٹیز کرتا ہوا فن آئی لینڈ کی جانب لے جا رہا تھا رات تاریک تھی لیکن تاروں کے غبار نے رات کا سرمئی رنگ اکھاڑ دیا تھا۔
لانچ فن آئی لینڈ کی طرف بڑھتی رہی۔ اب حمید سوچ رہا تھا کہ وہاں پہنچ کر وہ ان کو عمارت تک کیسے لے جائے گا۔

ابھی اس نے آدھا راستہ بھی نہیں طے کیا تھا کہ پیچھے سے ایک لانچ آ کر اس کی ہی چلنے لگی۔

”واہ دوست..... تم نے سچ سچ کمال ہی کر دیا۔“ اس پر سے آواز آئی۔

”مگر کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔“ حمید نے جواب دیا۔

”محنت کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ تم خوش کر دیئے جاؤ گے۔ مگر کیا وہ بیہوش ہے جس وقت میں نے اُس کار کے ڈکے میں ٹھونسا تھا اس وقت تو بیہوش ہی تھا۔“

نہیں کہہ سکتا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔“

”ایسا نہ کہو پیارے..... اس کی موت سے ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“

”لیکن اگر مر ہی گیا تو۔“

”تب پھر ہمیں گھنٹوں اس مسئلہ پر غور کرنا پڑے گا۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ دونوں لانچیں جزیرے کی طرف بڑھتی رہیں۔

پھر جیسے ہی وہ ساحل سے لگیں دوسری لانچ سے تین آدمیوں نے اتر کر حمید کو گھیرا

راجو نے کہا۔ ”تم لوگ تھیلے کو اٹھاؤ۔“

”ہرگز نہیں.....!“ حمید غرایا۔ ”پہلے دس ہزار میرے ہاتھ پر رکھ دو۔“

”آف نوہ! اتنی بے صبری۔“ راجو ہنسنے لگا۔

”اپنا وعدہ یاد کرو۔“

”میں نے یہ کب کہا تھا کہ ساحل ہی پر معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔ تم شاید بھول

میں نے کہا تھا کہ جس وقت تم اس عمارت میں اسے لاؤ گے دس ہزار ادا کر دیئے جائیں گے

تھوڑی ہی دیر بعد بھٹی میز پر چت پڑا ہوا تھا اور اس طرح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا جیسے اُسے بہت بڑی گھٹن سے نجات ملی ہو لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”یہ ہوش میں کیسے آئے گا۔“ راجو نے حمید سے پوچھا۔

”خود بخود۔“ حمید نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ایک گھنٹہ گزر چکا۔“

اب اسے ہوش میں آ جانا چاہئے۔ تم ذرہ ذرہ کھڑکی کھول دو۔“

”کھڑکی نہیں کھولی جاسکے گی۔“ داؤد بولا۔

”ہوا کے بغیر اس کا بیہوش طویل بھی ہو سکتی ہے۔“ حمید نے جواب دیا۔

”کس چیز سے بیہوش کیا تھا۔“

”اب کیا میں در ہزار میں اپنے راز بھی بتا دوں گا۔“

داؤد اُسے گھورتا ہوا خاموش ہو گیا۔ وہ اس وقت بھی اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں

رہا تھا۔

حمید جھک کر بھٹی کے چہرے پر رومال جھٹکنے لگا۔ شاید وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں

بڑبڑائے بھی جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بھٹی کے پوٹوں میں حرکت ہوئی اور وہ منہ چلانے لگا پھر کراہ کر روٹ پڑا۔

وہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔

پانچ منٹ کے اندر ہی اندر بھٹی کو ہوش آ گیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ

چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم لوگ اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب

نہیں ہو سکو گے۔“

”ہم کامیاب ہو گئے۔“ داؤد نے قہقہہ لگایا اور بھٹی کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

”دیکھو.....!“ داؤد نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کتنی آسانی ہے“

بلوایا گیا حالانکہ تمہاری کونٹھی کے گرد سادہ لباس والوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس طرح تم

چاہیں تمہیں قتل کر سکتے ہیں۔“

”نہیں.....!“ بھٹی کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم لوگ مجھ پر ظلم نہیں کر سکتے۔“

”تمہیں یہاں اس لئے نہیں لایا گیا ہے کہ تمہاری پوجا کی جائے گی۔“ داؤد ایک زہریلی

سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت جھانک رہی تھی۔

”اب میرا حساب صاف کر دو۔“ دفعتاً حمید نے کہا۔

”نہیں ابھی ٹھہرو۔“ داؤد نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے اس آدمی کو قتل ہی کر دینے کی نوبت آ جائے۔“

”نہیں نہیں.....!“ بھٹی بے بسی سی کراہا۔

”قتل کے بیس ہزار۔“ حمید کے لہجے میں بڑی سفاکی تھی۔ ”قتل کے لئے ہمیشہ اغواء کی

رقم کا دو گنا وصول کرتا ہوں۔“

”میں کیا اس آدمی کے قتل کیلئے چالیس ہزار بھی صرف کئے جاسکتے ہیں۔“ داؤد بولا۔

”تب پھر میں ضرور رکوں گا۔“ حمید نے کہا اور کرسی کھینچ کر برابر ہی بیٹھ گیا۔

”میں..... میں نہیں..... یہ نہیں..... تم لوگ کیا چاہتے ہو۔“ بھٹی کانپتا ہوا ہلکایا۔

”ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم سے جو کچھ کہا جائے کرو اور اس کے بعد اپنی زبان بند رکھو

ورنہ اس کے خلاف کرنے کا انجام قتل ہی کی صورت میں ظاہر ہوگا ہم اس پر بھی خاک ڈالنے کو

تیار ہیں، جو تم ابھی تک کرتے رہے ہو۔“

”مم..... میں..... مجبور تھا..... اس نے زبردستی کی تھی..... مجھے بتانا پڑا۔“

”خیر تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہم اس سے سمجھ لیں گے..... مگر تم.....“ داؤد جیب میں ہاتھ

ڈال کر کچھ کاغذات نکالتا ہوا بولا۔ ”ان پر اپنے دستخط کر دو۔ تم خوب سمجھتے ہو کہ اس کا کیا

مطلب ہے۔ لہذا فضول قسم کی گفتگو کر کے وقت برباد نہ کرنا۔“

”مم..... میں سمجھتا ہوں۔“

”پھر شاہش جلدی سے دستخط کر دو۔“

”لیکن اگر..... اگر..... اس کے بعد..... تم نے مجھے قتل کر دیا۔“

”ہم اتنے احمق نہیں ہیں۔ تمہاری زندگی ہمارے لئے زیادہ مفید ہوگی مگر اسی صورت

”لاؤ.....!“ وہ کاغذات کیلئے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ کاغذات اسے پھر واپس کر دیئے گئے۔
 لیکن خلاف توقع بھٹی نے انہیں تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔
 ”کیا مطلب.....!“ داؤد ہاڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”کچھ نہیں بیٹھ جاؤ۔ کھیل ختم ہو گیا۔“ بھٹی نے کہا اور اب اس کی آواز سن کر حمید
 ماتحت اچھل پڑا کیونکہ یہ فریدی کی آواز تھی..... سردار سفاکی کی جھلکیاں رکھنے والی آواز۔

جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کے دستے پر حمید کی گرفت مضبوط ہو گئی۔
 وہ دونوں غیر ملکی بھی کھڑے ہو گئے اور راجو اپنے ساتھیوں سمیت فریدی کی طرف بڑھا۔

”ٹھہرو۔“ بھٹی کے روپ میں فریدی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ راجو اور اس کے ساتھی رک
 داؤد نے کاغذات دونوں غیر ملکیوں کی طرف بڑھا دیئے۔ انہوں نے کاغذات کو اپنے

”خبردار۔“ حمید نے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ ”تم سب اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“
 ”کیا.....!“ راجو اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

لیکن حمید کی نظر اس غیر ملکی ہی کی طرف تھی جس نے ریوالور نکالنے کی کوشش کی تھی۔
 یہ اب اس کے دونوں ہاتھ میز پر رکھے ہوئے تھے اور وہ حمید کو گھور رہا تھا۔

”میں نے کہا ہے کہ تم سب اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو..... یہ ریوالور بے آواز ہے۔“
 ”تم کیا چاہتے ہو۔“ راجو اپنے ہاتھ اٹھاتا ہوا بولا۔

”میں وہی چاہتا ہوں جو مسٹر بھٹی چاہتے ہیں۔“

”اوہ.....!“ داؤد پیر شیخ کر دھاڑا۔ ”فریدی نے دھوکا دیا۔“

”نہیں ننھے بچے وہ خود دھوکا کھا گیا۔“ فریدی نے کہا۔

”تم خود کو محفوظ نہ سمجھو۔“ داؤد آنکھیں نکال کر بولا۔ ”ہم چھ ہیں اور تم صرف دو۔“

”اس کی فکر نہ کرو۔“ فریدی مسکرایا۔ ”شاید تم نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں کسی ایسے آدمی

کا نام ممکن ہے جو کرنل فریدی کی حفاظت میں ہو۔“

”تم..... تم.....!“ راجو ہٹکایا۔

میں جب تم اپنی زبان بند رکھو۔“

”دستخط کر دینے کے بعد..... کیا میں اپنی زبان سے کچھ نکال سکوں گا۔“

”ٹھیک..... تم بہت سمجھدار ہو۔“ داؤد مسکرا کر بولا۔ ”دستخط کرو۔“

بھٹی نے کاغذات میز پر پھیلا دیئے۔ داؤد نے قلم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے
 ”یہ دستخط تمہارے لئے ایک شاندار مستقبل کا پیام لائیں گے۔“

بھٹی کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔ حمید بڑی طرح بیتاب تھا یہ معلوم کرنے کے لئے
 کاغذات کیسے ہیں۔

دو منٹ بعد بھٹی نے کاغذات اور قلم رکھ دیئے اور کرسی کی پشت سے ٹک کر ہانپنے لگا۔
 داؤد نے کاغذات دونوں غیر ملکیوں کی طرف بڑھا دیئے۔ انہوں نے کاغذات کو اپنے

پلٹ کر دیکھا اور پھر ان میں سے ایک دھاڑا۔ ”یہ تمہارے دستخط ہیں۔“

”ہاں.....!“ بھٹی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ کھلی ہوئی بکواس ہے۔“ غیر ملکی نے داؤد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ ہمیں دھوکا دے
 کوشش کر رہا ہے۔ یہ اس کے کاروباری دستخط نہیں ہیں۔“

داؤد کی خوشخوار آنکھیں بھٹی کی طرف اٹھیں، جواب بھی کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا ہانپ رہا تھا۔

تھکڑیاں

بھٹی اسی طرح پڑا ہانپتا رہا۔

”کیا تم مرنا ہی چاہتے ہو۔“ داؤد غرایا۔

بھٹی سیدھا ہو کر بولا۔ ”میں کیا کروں۔“

”انتا کچھ سمجھانے کے باوجود بھی تم ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”اوہ..... بابا بابا۔“ داؤد نے پھر قبہ لگایا۔ ”تم..... تم..... بہت ذہین ہو۔“
لوہے کا برادہ دیکھ پایا ہے جسے ہم یہاں اسٹاک کر رہے ہیں۔“
”چلو..... وہ لوہے کا برادہ ہی سہی۔“ فریدی مسکرایا۔ ”لیکن لوہے کے

بھی موجود ہوتیں۔“

”شٹ اپ.....!“ داؤد حلق پھاڑ کر چیخا۔

”ان کی چچی۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”کیوں داؤد! کیا تم مجھے اتنا ہی احمق سمجھتے ہو؟“

میں سلیہ کے اغواء والے معاملے میں الجھ کر تم لوگوں کا پیچھا چھوڑ دوں گا۔“

”کیا مطلب.....!“ حمید فریدی کی طرف مڑا۔

”یہ ایک شاندار ڈھونگ تھا۔ جن دنوں میں اُن ذرات کے متعلق چھان بین کر

لوگوں کو اس کا علم ہو گیا اور انہوں نے ہماری توجہ دوسری طرف ہٹا دینے کی کوشش کی

لئے شیطان کی محبوبہ تخلیق کی گئی اور سب سے پہلے تمہیں اس معاملے میں الجھایا گیا

خیر..... پھر اس کا اغواء اسی لئے عمل میں لایا گیا کہ پروفیسر شوخ تمہارے خلاف رہا

کر دے..... اور میں تمہیں بچانے کے لئے اس کیس میں الجھ جاؤں۔ یہ صرف اتنا

چاہتے تھے کہ ان ذرات کو باہر بھیجنے میں کامیاب ہو جائیں۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ پھر داؤد کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ کاغذ جو اس وقت

میں موجود ہیں انہیں اپنے تابوت میں آخری کیل سمجھو۔“

”تم ہمارے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گے۔“ داؤد غرایا۔ ”زیادہ سے زیادہ

فریب دہی کا کیس چل جائے گا کیونکہ ہم کھوکھلے گارڈروں میں لوہے کا برادہ بھر دیے

”سرا جرم تو اتنا گھناؤنا ہے کہ تمہیں گولی مار دینے کو دل چاہتا ہے۔ تم اپنے بچا کی بیوی پر

تصرف رہے ہو۔ وہ بوڑھا بھی اسے اچھی طرح سمجھتا تھا..... لیکن بدنامی کے ڈر سے اس کی

زبان بند تھی۔“

داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں ایک بے حیا اور بے جگر آدمی ہوں۔ میری نظروں

میں نہ تو رشتوں کا کوئی احترام ہے اور نہ چھانسی کے پھندے ہی سے ڈرتا ہوں۔ لہذا تم خواہ

مگر وہ شیطان کی محبوبہ ہے کہاں۔“ حمید نے فریدی سے پوچھا۔

کیا تم میرے ملک کی ایک بہت بڑی دولت غیر قانونی طور پر ایک دوسرے ملک کے حوالے

نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کیا وہ ذرات..... اگر انہیں لاسٹیک ایسڈ میں ڈال دیا جائے تو ”یری

ڈیم“ کے شفاف ذرے نکل آئیں گے یا نہیں؟“

”یہ..... یہ..... غغ..... غلط ہے۔“ ایک غیر ملکی ہٹلایا لیکن فریدی اس کی طرف دھیان

دینے بغیر کہتا رہا۔ ”تم ان ذرات کو باہر بھیجتا چاہتے تھے۔ ایک غیر ملکی فرم سے اس کے لئے

معائدہ بھی ہو گیا تھا مگر معائدہ تھا لوہے کے گارڈرز کے ایکسپورٹ کا۔ البتہ معائدہ اُس وقت

میں مکمل سمجھا جاتا جب تک کہ تمہاری فرم کے ایک ڈائریکٹر مسٹر بھٹی کے دستخط اس پر نہ

ہو جاتے۔ یعنی کو تمہاری اسکیموں کا علم ہو گیا تھا لیکن وہ بیچارہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اُن ذرات کی

نوعیت کیا ہے۔ اور نہ اُسے یہی معلوم تھا کہ ذخیرے کہاں ہیں۔ اگر بھٹی سچ سچ اس وقت

تہارے ہاتھ پڑ گیا ہوتا تو تم اس وقت تک اسے اپنی حراست میں رکھتے جب تک کہ سارا مال

یہاں سے نکل نہ جاتا۔ بھٹی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ذرات یہاں سے بھیجے کس طرح جائیں

گے لیکن اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب کسی نئے معائدے پر دستخط نہیں کرے گا اور اسے یہ

مشورہ میں نے ہی دیا تھا۔ اس لئے تمہیں اس کے اغواء کی بھی ضرورت پیش آئی..... اور تم

داؤد..... تمہاری جراثیم تو بہت ہی سنگین ہیں۔ اس دوران میں تمہاری اصلیت بھی ظاہر ہو گئی

ہے۔ تم کافی عرصے سے ایک غیر ملک کے ایجنٹ کی حیثیت سے یہاں کام کرتے رہے ہو اور

”سرا جرم تو اتنا گھناؤنا ہے کہ تمہیں گولی مار دینے کو دل چاہتا ہے۔ تم اپنے بچا کی بیوی پر

تصرف رہے ہو۔ وہ بوڑھا بھی اسے اچھی طرح سمجھتا تھا..... لیکن بدنامی کے ڈر سے اس کی

زبان بند تھی۔“

داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں ایک بے حیا اور بے جگر آدمی ہوں۔ میری نظروں

میں نہ تو رشتوں کا کوئی احترام ہے اور نہ چھانسی کے پھندے ہی سے ڈرتا ہوں۔ لہذا تم خواہ

مگر وہ شیطان کی محبوبہ ہے کہاں۔“ حمید نے فریدی سے پوچھا۔

”باٹم روڈ کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں..... بنگلہ نمبر تیرہ۔“ فریدی نے جواب دیا۔
 کچھ دیر بعد قیدیوں کا جلوس اس عمارت سے نکلا۔ فریدی اور حمید پیچھے تھے۔
 ”خدارا اب ایک بات اور بتا دیجئے۔“ حمید نے کہا۔ ”وہ ارجن پور کے فلیٹ والی کپالتیں۔“
 کون تھی اور وہ آدمی کون تھا۔“

”بلیک فورس کے دور کن۔“
 ”اوہ..... تو کیا اُس بلیک فورس میں غیر ملکی بھی ہیں۔“
 ”یقیناً ہیں..... لیکن ان کا تعلق ان دوست ممالک سے ہے جس کے اور ہمارے کھانا جاؤں گا۔ دیکھو میری دم پر ستارہ چمک رہا ہے۔“
 مفادات مختلف نہیں ہیں۔“

”یہ اریڈیم اپنے یہاں کیسے آپکا۔“
 ہنس ہوئی اٹھ بیٹھی۔
 ”ہماری زمین کے سینے میں کیا نہیں ہے مگر ہم مفلس ہیں..... کامل ہیں..... ہمیں ہمارا۔“
 ”تم بہت شریر ہو گئے ہو۔“ وہ اس کی کمر پر دھپ رسید کرتی ہوئی بولی مگر پھر سنجیدگی سے
 بتانی آتی ہیں۔ ہم تقریریں کر سکتے ہیں ایک دوسرے پر اپنی ذہنی برتری کا رعب ڈال رکھا۔ ”کیا تم کچھ بیمار ہو۔ تمہاری آواز اتنی بھرائی ہوئی ہے کہ پہچانا مشکل ہے۔“
 ہیں۔ ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کے لئے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتیں ضائع کر سکتے ہیں۔
 ”میں آج کل شو پنہار پر ریسیرچ کر رہا ہوں۔ اسی لئے روتے روتے گلا پڑ گیا ہے۔ تم۔“
 اس کی فکر نہ کرو۔ میں اس وقت اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں جہنم کی سیر کرا دوں۔ کیا تم نے برنارڈ
 شاہ کا ڈرامہ مین اینڈ سپر مین پڑھا ہے۔“

”یہ آج تم کیسی بھکی بھکی باتیں کر رہے ہو ڈیر..... یہ نفرت انگیز خول اپنے چہرے سے
 اتار دو..... آدمی بنو۔“

شیطان اور محبوبہ

”آدمی شیطان بن سکتا ہے لیکن شیطان کبھی آدمی نہیں بن سکتا۔“
 ”داؤد.....!“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح ہنسی۔
 ”پھر وہی نام..... میں صرف شیطان ہوں..... جو اپنی چچی.....!“
 ”شٹ اپ..... تم گدھے پن کی باتیں کیوں کر رہے ہو۔“ وہ جھینپے ہوئے انداز میں بولی۔
 ”گدھوں میں آدمیت نہیں ہوتی اسی لئے مجھے گدھے پسند ہیں۔“
 ”کیا تم نشے میں ہو داؤد۔“

سلیہ بے خبر سو رہی تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی والا نیلا بلب روشن تھا۔ دفعتاً ایک کڑکھلی اور اس میں کسی بہت بڑے بندر کا چہرہ دکھائی دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چھٹ کاٹ کرے میں تھا لیکن اس کے جسم پر ایک نہایت نفیس قسم کا سیاہ سوٹ تھا اور پیچھے لمبی سی دم رہی تھی جس کے سرے پر ایک ننھا سا بلب روشن تھا۔ اس کا چہرہ بندروں کا سا تھا۔ مگر جسم ہاتھ پیر آدمیوں کے سے تھے۔ اس نے ہولے ہولے سلیہ کا گال تھپتھپایا۔ وہ جاگ پڑی۔

”نہیں شاید تم نشے میں ہو۔“ شیطان نے اپنے چہرے سے بندر کا خول اگلے ہوئے کہا۔

سلیمہ کے حلق سے ایک کھٹی کھٹی سی چیخ نکلی اور وہ مسہری پر گر کر رہنے لگی۔ کیپٹن نے کھاجانے والی نظروں سے گھور رہا تھا اس نے بلٹ سے دم الگ کی اور اسے ایک طرز ہوا بولا۔ ”تم جیسی عورت آج تک میری نظروں سے نہیں گذری۔ مگر کھیل ختم ہو چکا ہے وغیرہ اس وقت حوالات میں ہیں اور اری ڈیم کا ذخیرہ ہمارے قبضے میں ہے۔“

وہ اپنی حالت پر قابو پا چکی تھی۔ مسہری پر لیٹے ہی لیٹے اس نے انگڑائی لی اور ”کیپٹن! تم اتنے بدھویوں ہو۔ کیا تم اتنے ذہین نہیں ہو کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر“ ”نہیں! میں بالکل بدھو نہیں ہوں۔“ حمید نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں مر رہا ہوں عیاش نہیں۔“

فائدہ ہی اٹھانے کے لئے آیا ہوں۔“

”پھر..... وہ الماری کھول کر اسکاچ کی بوتل نکالو۔“ اس نے پھر انگڑائی لی۔ بارہ

کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔“

”پہلے میرا ایک حقیر تحفہ قبول کر لو ڈارلنگ۔“ حمید نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے لئے جڑاؤ کنگن لایا ہوں۔“

اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اس کی جیب سے جھکڑیوں کا جوڑا نکل پڑا۔

”تم مذاق کر رہے ہو..... ڈیر۔“ وہ اٹھلائی۔

”خاموشی سے اسے پہن لو۔“ حمید نے حکمانہ لہجے میں کہا۔ ”اپنے ہاتھ آگے بڑھا“ ”نہیں.....!“ وہ پھر خوفزدہ نظر آنے لگی۔

”یقیناً میں تمہارے جھکڑیاں لگا کر یہاں سے پیدل کو توالی تک لے جاؤں گا“

صرف گیارہ بجے ہیں۔ سڑکیں جگمگا رہی ہیں اور.....!“

”نہیں..... خدا کے لئے نہیں۔“

”شیطان کی محبوبہ کو خدا سے کیا سروکار۔ شاید تم نشے میں ہو۔“

”کیپٹن!“ وہ اسکا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔ ”اس طرح بے عزت نہ کرو۔“

”اوہ..... تم تو ایک دلیر عورت ہو۔ تم جو اپنی پنڈلی میں اپنے ہی ہاتھوں سے پوری سوئی

پھوست کر لیتی ہو۔ ہو سکتا ہے عدالت تمہیں بری بھی کر دے مگر میں تو اس وقت تمہیں ایک آوارہ

سبکیا کی طرح کھینچتا ہوا لے جاؤں گا۔“

”کیپٹن.....!“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ چلے۔

”شریف عورتوں کے آنسوؤں پر میں اپنا گلا بھی گھونٹ سکتا ہوں۔ تم شاید مجھے کوئی

عیاش آدمی سمجھتی تھیں اسی لئے مجھے متوجہ کرنے کے لئے وہ ڈرامہ اسٹیج کیا تھا..... لیکن.....

چلو..... جھکڑیاں پہن لو..... مجھے تشدد پر آمادہ نہ کرو..... میں صرف عورتوں سے دوستی کا شائق

ہوں..... عیاش نہیں۔“

حمید نے اس کے جھکڑیاں لگا دیں..... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

ختم شد

حرفِ اول

ایک بڑا آرٹسٹ ایک عظیم فنکار یا مفکر اپنے دور کا نمائندہ بھی ہوتا ہے، ترجمان بھی ہوتا ہے اور خالق بھی۔ ابن صفی نے اپنے مخصوص اندازِ تحریر سے اردو میں ایک نئے دور کی تخلیق کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُن کی ہمیشہ سے یہ بھی خصوصیت رہی ہے کہ موجودہ مسائل کی بنیاد پر انہوں نے سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ کسی خشک ریاضی داں کی طرح مسئلے گنوا کر یا کسی فنارچی کی طرح چیخ چیخ کر انہوں نے کسی مسئلہ کو نہیں چھوا بلکہ ایک سچے حسن کار کی طرح انہیں خوبصورت اور ڈھنگ سے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا سلیقہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے جہاں نفسیاتی نکتے سامنے رکھے، تجزیے کئے اور تحلیل نفسی کے گر بتائے وہاں انہوں نے امن پر مغربی ممالک کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور تباہ کن ایجادات پر بھی اپنے خیالات پیش کر کے رہنمائی کا حق ادا کیا! موجودہ دور کا سب سے زیادہ بھیانک مسئلہ وہ تجربے ہیں

انوکھے رقص

(مکمل ناول)

جنہوں نے انسانی زندگی میں زہر بھر دیا ہے۔ مشرق کے ہر گوشے سے نئی نئی بیماریوں کی خبریں بیماروں کی تعداد مرنے والوں کی تفصیل ان ایٹمی اور ہائیڈروجنی تجربوں کا نتیجہ ہے۔ آج ساری انسانیت کراہ اٹھی ہے۔ شرافت، امن اور زندگی و اخلاق کے علمبردار ممالک ان تجربوں کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ ابن صفی کو بھی ایک فن کار کی حیثیت سے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان تجربوں کے خلاف آواز بلند کریں۔ یہ آواز ”انوکھے رقص“ کے ابتدائی صفحات میں ابھری ہے۔ اس میں اتنی گہرائی اتنی شدت اور اتنا نوکیلا پن ہے کہ آپ اسے بھول نہیں سکتے۔ اُن کا یہ پیمبرانہ جملہ:

”جب ایک آدمی پاگل ہو جاتا ہے تو اُسے

پاگل خانے میں کیوں بند کر دیتے ہیں اور جب پوری قوم پاگل ہو جاتی ہے تو طاقتور کیوں کہلانے لگتی ہے۔“

فاشیستی تکنیک اور مغرب کے استبدادی نظام پر اس سے بہتر طنز ممکن نہیں ہے۔ اس طرح کے جملے ”انوکھے رقص“ میں بہت جگہوں پر آپکولیس گے۔ ان میں ”روح عصر“ (Zeitgeist) کی جلوہ گری ہے اور اسے دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ ابن صفی صرف ناول نگار ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مفکر بھی ہیں۔

کہانی کے اعتبار سے اس ناول کو حمید کا ہی کارنامہ کہنا مناسب ہوگا۔ اس کی دلچسپی، اس کے قہقہے اور آخر میں اس کا چونکا دینے والا اختتام اسی انوکھے انداز کا ہے جس کیلئے ابن صفی مشہور ہیں۔

پبلشر

لڑکی کا حمایتی

سورج دور کی پہاڑیوں میں جھک رہا تھا اور تاریخی رنگ کی دھوپ میں خنکی سی پیدا ہو گئی۔ ادھر کچھ دنوں سے بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ موسم صرف دن ڈھلے ہی اس قابل ہوتا تھا ڈگ باہر نکل سکیں۔ شامیں اچھی گذرتیں اور راتیں حسب معمول ویسی ہی ہوتیں جن کے رام گڈھ خاص طور سے مشہور تھا، لیکن دن میں اتنی گرمی رام گڈھ کے لئے بالکل نئی چیز۔ وہاں کے باشندوں کا کہنا تھا کہ ان کے ہوش میں اتنی سخت گرمی نہیں پڑی۔

بہر حال میدانوں سے آئے ہوئے لوگ سوچ رہے تھے کہ اگر پورا ییزن اسی طرح گذرا اتھے خاصے احمق کہلائیں گے۔ کیونکہ گرمی ہی سے بھاگ کر انہوں نے رام گڈھ کی بپہاڑیوں میں پناہ لی تھی۔

وہ انیم اور ہائیڈروجن بموں کا تجربہ کرنے والوں کو گالیاں دیتے، جن کی وجہ سے ساری میں غیر متوقع موسمی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں، زہریلی ہوائیں چلنے لگی تھیں اور ایسی لہ ہونے لگی تھیں جن کے پانی سے جسم پر آبلے پڑ جاتے تھے۔ طرح طرح کی دباؤ

بلند نمبر 20

بیماریاں پھیلتی تھیں۔ وہ بڑی طاقتوں کے نام کو روتے جو محض ایسی تجربات سے ایک بھلا کر کہا۔
مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن بھگتنا انہیں بھی پڑ رہا تھا جو ”طاقت“ یا ”بہا“
سے بھی سروکار نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

رام گڈھ کا نچلا طبقہ تو گویا بے موت مر رہا تھا۔ اُس کی روزی کا ذریعہ دراصل شروع کر دیا تو میں بور ہو کر دوبارہ زندہ ہو جاؤں گا۔
ہوتے تھے جو یزن میں باہر سے آتے تھے لیکن ایسے موسم میں تفریح کی کے ہوئے۔
تفریح بند اور رام گڈھ کے قلیوں کی آمدنی بند۔ یزن ہی میں جو کچھ کماتے وہی اس لڑکی سے نہیں ملو گے، جو اپنے جوڑے میں گلاب لگاتی ہے۔
ایام میں بھی ان کے کام آتا۔ لیکن اب وہ سوچ رہے تھے کہ اگر سارا یزن ایسا ہی
سردیاں نہ دیکھ سکیں گے۔ وہ اسے خدا کا غضب اور اپنے گناہوں کا ثمرہ تصور کرتے۔
اور ہائیز روجن بموں کے بمات ان کی سمجھ سے باہر تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ کیا رہا تھا جب وہ تمہاری میز پر آئی تھی۔
آدی پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں کیوں بند کر دیا جاتا ہے اور جب کئی
ہو جاتی ہے تو ”طاقتور“ کیوں کہلانے لگتی ہے۔

رام گڈھ کے قلی یہ نہیں سوچ سکتے تھے لیکن کمیشن حید بھی سوچ رہا تھا۔ کیونکہ اگلے لنگوں کی طرح جھگڑا کرتے پھرو۔
بہانہ کر کے وہ فریدی کو یہاں تک دھکیل لایا تھا اور اب فریدی اس کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔
”جو کچھ تمہارے مقدر میں ہے۔“ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ ”کہیں بھی جاؤ پورا
گا۔ تم نے خواہ خواہ میری چھٹیاں برباد کرائیں۔ میں نے چھٹی صرف اسی لئے لی تھی۔“ دونوں کا قیام یہاں کے سب سے بڑے ہوٹل پیراڈائز میں تھا۔
کروں گا۔ بہت دنوں سے مطالعہ کے لئے وقت نہیں نکال سکا تھا۔
”اچھا آپ مطالعہ کیجئے، میں منہ کالا کرتا ہوں۔“ حید اٹھتا ہوا بولا۔ ”یہ بھی کالے میزیں لگائی جاتی تھیں۔“

ہے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہو۔
”زندگی دراصل یہی ہے حید صاحب۔“ فریدی نے کہا اور ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ فریدی ہر وقت ہی لڑکیوں کے متعلق اُسے بور کرتا رہتا تھا اور اب تو یہ حال ہو گیا تھا
کہ اگر کوئی دن خالی جانے والا نظر آتا تو حید خود ہی ایسے تذکرے چھیڑ دیتا کہ لڑکیوں کی بات
دور ویرانے میں بھٹک رہی تھی۔

”میں کب کہتا ہوں کہ آپ زندہ نہ رہتے۔ مگر کم از کم مجھے تو مرنے دیجئے۔“
باغ کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے دو چار گہری سانسیں لیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

رقص کے میدان کے چاروں طرف لاتعداد میزیں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں عموماً کھلے عرصے ہوا کرتے تھے۔ رقص گاہ کا فرش پختہ اور بہت چمکتا تھا۔ اس کے چاروں طرف بڑی بڑی باغات ترتیب دیئے گئے تھے جن کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ انہیں بانٹار دوسری تفریح گاہیں بھی تھیں۔ نہانے کے لئے پختہ تالاب، ٹینس کورٹس اور ان کے علاوہ بیرون خانہ تفریحات کی جگہیں۔

رقص گاہ میں حمید کی میز مستقل طور پر ”مخصوص“ تھی۔ لیکن وہ سیدھا اپنی میز پر گیا۔ اُسے حقیقتاً اس لڑکی کی تلاش تھی جس کے متعلق ابھی ابھی فریدی سے جھڑپ ہو چکی تھی۔ اس ہوٹل میں قیام کرتے ہی اُس لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی بالکل پر۔ ایک رات حمید اس سے رقص کے لئے درخواست کر بیٹھا تھا اور پھر ان میں جان پر تھی۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں وہ حمید کو غیر معمولی طور پر دلچسپ اور دلکش معلوم ہوتی کا نام زد ہوا تھا۔ دیکھی ہی تھی۔ مگر حمید نے اس کی قومیت کے بارے میں استفسار نہیں کیا اس کا خیال تھا کہ عورت بجائے خود ایک قوم ہے، مردوں کی طرح اُسے رنگ و نسل سے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس کا نظریہ تھا۔ لیکن وہ نظریے پر بحث کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہا تھا۔ بہر حال اس نے زویا سے اس کے مذہب یا قومیت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ وہ یہاں تنہا ہی مقیم تھی اور اس نے حمید کو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا تھا کہ زویا ہے اور وہ یسین گزرنے کے لئے یہاں آئی ہے اور نہ اس نے بتایا کہ وہ کہاں تھی اور نہ یہی بتایا کہ وہ خود مختار تھی یا والدین کی پابند۔ عمر بمشکل بیس سال ہوگی اور حمید تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔

اس سے حماقتیں بھی سرزد ہوتی تھیں..... دلچسپ حماقتیں اور اُن میں اتنی بڑی تھی کہ حمید انہیں تصحیح سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔ ویسے عام طور پر اس کی حرکات و سکنات ظاہر ہوتا۔ صورت و شکل غیر معمولی نہیں تھی۔ بس وہ جوان تھی..... اور لڑکی..... اس کے کرگھنٹوں گفتگو کرنے پر بھی حمید اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ یہی سب سے بڑی خوبی تھی

وہ اُسے رقص گاہ میں تلاش کرتا رہا۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ آخر تھک ہار کر اپنی میز پر بیٹھا۔ درختوں کی شاخوں سے اچھے ہوئے رنگارنگ برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے اور لاؤڈ سپیکر مقامی دستکار اداروں کے اشتہارات نشر کئے جا رہے تھے۔ حمید نے پائپ میں تمباکو بھری اور اُسے سلگانے ہی جا رہا تھا کہ لاؤڈ سپیکر پر نشر کئے جانے والے ایک اعلان نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔

”رقاصوں کی پارٹی“ معلن کہہ رہا تھا۔ ”یہ ساری دنیا میں اپنے طرز کے انوکھے رقص، حیرت انگیز اور ہوش اڑا دینے والے۔ کل سے آپ ان کے پروگرام پیراڈائز میں ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسے حیرت انگیز کمالات آپ نے آج تک نہ دیکھے ہوں گے۔ میلان کا انتظار کیجئے۔“

حمید نے پائپ سلگایا اور فصاحت میں دھوئیں کے لہریے بکھیرتا ہوا کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ اس وقت موسم کافی خوشگوار ہو گیا تھا۔ دن کی تپش سے بچنے کے لئے کمروں میں بند ہو کر بٹھے والوں کے نزدیک اس وقت تاروں بھرا آسمان بڑی کشش رکھتا تھا اور وہ خود کو جنت ہی محسوس کر رہے تھے۔

حمید نے کچھ دیر بعد پائپ کی راکھ جھاڑ کر آئس کریم کا آرڈر دیا۔ اسی وقت مائیکروفون مائیں ارتعاش پیدا کرنے لگا۔ معلن کہہ رہا تھا ”مردہ رقصوں کی ٹیم آپ کو حیرت زدہ کر دے گی۔ اتنا تیز ایکشن آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا..... یاد رکھیے..... مردہ رقص..... جو اس سے پہلے اپنی جگہوں سے ہل بھی نہیں سکتے۔ رقص کی حالت میں آندھیوں اور طوفانوں کے منہ پھیر دینے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ایک بار پھر سنئے..... مردہ رقص.....!“

حمید نے بہت بُرا سامنہ بنایا۔ مائیکروفون خاموش ہو چکا تھا اور اب پھر سریلے قہقہوں کے ساتھ پہاڑی جھینگروں کی ”ریں ریں، ٹیں ٹیں“ شروع ہو گئی تھی۔ اُسے گھیا قسم کی اشتہار بازی سے بڑی نفرت تھی اور وہ اسے کم از کم پیراڈائز کے شایان شان نہیں سمجھتا تھا۔

کچھ دیر بعد آئس کریم آگئی اور ٹھیک اسی وقت اس کی نظر زویا پر پڑی۔ وہ اس کے قریب ہی سے گزر کر گئی تھی۔ حمید نے سوچا ممکن ہے اس نے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ بیٹھا آئس کریم کھاتا رہا۔

زویا نارنجی ساری میں بہت سچ رہی تھی۔ حمید نے اسے یوں ہی بے مقصد اور سببی سمجھی اس کی نظر حمید کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی لیکن اسی طرح جیسے اُسے بھی اس پر غصہ چکراتے دیکھا۔ شاید اسے کسی کی تلاش بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس نے حمید کو یہی بتایا تھا۔

اس کے علاوہ یہاں اور کسی سے اس کی جان پہچان نہیں ہے۔ حمید نے سوچا کہ وہ آئس کریم ختم کر کے ہی اٹھے گا۔ ایک بار اس نے یہ بھی غور کیا کہ زویا اسے دیکھ چکی ہے۔ پھر کیا وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی؟ یہ بھی اس کی دائرہ ناممکن ہی تھا۔ وہ تو ہمیشہ خود ہی لہک کر اس کی طرف آتی تھی۔

حمید نے آئس کریم ختم کی اور اٹھ گیا۔ زویا اب بھی بیٹھی نہیں تھی بلکہ ایک گوشہ میں ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی، جو کاغذ کے بڑے غبارے کو اڑانے کیلئے اسمیں آگ لگا رہے تھے۔ حمید اس کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن زویا اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ حمید سمجھا شاید یہ بھی کسی قسم کا غمزہ ہوگا۔ لیکن جب وہ بالکل ہی بے تعلقی ظاہر کرنا حمید نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”جی.....!“ وہ اس طرح چوکی جیسے اُسے وہاں اس کی موجودگی کا علم ہی نہ رہا ہو۔

”کیا بات ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”جی.....!“ اب اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ چند لمحے حمید کو بھٹی بھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ ”معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

حمید کو ہنسی آگئی اور اس نے کہا۔ ”بڑی اچھی ایکٹنگ کر لیتی ہیں آپ.....!“

”آپ ضرورت سے زیادہ بدتمیز معلوم ہوتے ہیں۔“ زویا نے آنکھیں نکالنے کہا۔ ”ہماری کب کی جان پہچان ہے۔“

اس لہجے پر حمید سچ مچ شرمندہ ہو گیا۔

”معاف کیجئے گا۔ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے کہا اور ایڑیوں پر گھوم گیا۔

غصہ کے مارے اس کا حال بُرا ہو رہا تھا۔ وہ پھر اپنی میز پر آ بیٹھا اور کچھ ایسے انداز میں باپ بھرنے لگا جیسے ریو اور میں کارٹوس چڑھا رہا ہو۔ زویا اب بھی وہیں کھڑی تھی لیکن اب سببی سمجھی اس کی نظر حمید کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی لیکن اسی طرح جیسے اُسے بھی اس پر غصہ

اچانک ایک کچیم کچیم آدی آ کر حمید کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ حمید نے سر اٹھا کر اسے جیکھی نظروں سے دیکھا۔

”کیا وہ کوئی لاوارث لڑکی ہے۔“ آنے والے نے کہا اور اس کی سرگوشی کسی سانپ کی ہمہ کار سے کم نہیں تھی۔

”کیا مطلب.....!“ حمید بھی کسی غصیلے بھڑیئے کی طرح غرایا۔

”اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ میں کئی دن سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“

حمید نے محسوس کیا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

”جاؤ اپنی راہ لو..... میرا دماغ نہ خراب کرو۔“

”اگر تم نے اسے چھیڑا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔“

حمید نے پھر اُسے گھور کر دیکھا۔ وہ ایک کافی مضبوط آدمی معلوم ہوتا تھا۔ قد حمید کے قد سے بھی کچھ نکلتا ہوا تھا اور کلائیوں کی ہڈیاں بہت چوڑی تھیں۔ پیشانی پر کئی جگہ چوٹ کے

”تم کیوں بکواس کر رہے ہو۔“ حمید باپ پھیک کر کھڑا ہو گیا۔

”اوہ..... تم کچھ میرا مقابلہ کرو گے۔“ اس نے تمسخر آمیز انداز میں کہا ہی تھا کہ حمید کا اٹنا ہاتھ اُس کے منہ پر پڑا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔

لیکن اس کا جوابی حملہ بڑا شدید تھا یہ اور بات ہے کہ اُسے میز پر ڈھیر ہو جانا پڑا۔ کیونکہ اس کے آگے بڑھتے ہی حمید نے میز میں ٹھوکر ماردی تھی۔ دوسری بار حمید نے اُسے بالوں سے

پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کے ہاتھ اٹھنے سے پہلے ہی ٹھوڑی پر ایک مکا جڑ دیا۔ وہ اُسے پہن سے خون رس رہا تھا۔
موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

”ہم تو پولیس کو ضرور اطلاع دیں گے۔“ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔

”لیکن میں اسے تسلیم نہیں کروں گا کہ پرس میری جیب سے نکالا گیا تھا۔“

”آپ عجیب آدمی ہیں۔“

”ہاں میں عجیب آدمی ہوں۔ براہ کرم مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔“

اب ان لوگوں نے حمید کو گھیر لیا اور دراز قد آدمی کی طرف ان کی توجہ ہٹ گئی۔ حمید نے

سوچا یہ نئی مصیبت آئی۔ لیکن اس کے اوسان خطا نہیں ہوئے وہ ترکی بہ ترکی انہیں جواب دیتا

”اس نے میری جیب سے پرس نکالا ہے۔“ حمید نے لکار کر کہا۔ ”وہ اس کے ہاں اور پھر جب ان لوگوں کو گرہ کٹ کا دھیان آیا تو اُس کی طرف مڑے۔

مگر..... اب وہ کہاں تھا؟ اس موقع کو مناسب سمجھ کر وہ پہلے ہی کھسک گیا تھا۔ لوگ اس

موجود ہے۔“

لوگوں نے دراز قد آدمی کے گرد گھیرا ڈال دیا اور دونوں میں ٹکرا رہی تھی۔ پھر دراز قد آدمی نے لگا۔

دوسروں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”آپ لوگ اس کی تلاشی کیوں نہیں لیتے۔ میرے پرس میں

ہٹ ہی جاتا پڑا۔ وہ حمید کو اسکی قانون شکنی پر برا بھلا کہتے ہوئے اپنی اپنی میزوں پر چلے گئے۔

زودیا قریب ہی کھڑی حمید کو گھور رہی تھی لیکن اس سے نظر ملتے ہی حمید نے دوسری طرف

آدمی اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ پھر بھلا یہ کہاں ممکن تھا کہ اس کی جیب سے حمید کا پرس

ہو جاتا۔ فریدی کے عتاب سے بچنے کا صرف یہی ایک طریقہ اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

پرس سے سچ جتنی سوچتے ہی نکلے اور اس میں حمید کا ایک نوٹو بھی موجود تھا۔

”پولیس کے حوالے کرو..... پولیس کے حوالے کرو۔ چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔

”نہیں بس اتنا ہی کافی ہے۔“ حمید بولا۔ ”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے

عدالتوں میں حاضری دیتا پھروں۔ آپ لوگ براہ کرم اسے جانے دیجئے۔“

دراز قد آدمی خاموش کھڑا متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکاتا رہا تھا۔ بالکل ایسا معلوم

تھا جیسے وہ پاگل کر دینے والی الجھنوں میں گرفتار ہو گیا ہو۔

حمید اپنا پرس سنبھال کر پیچھے ہٹ آیا۔ دراز قد آدمی کے چہرے پر کئی خراشیں

کروے۔“

سبھی سبھی اس کے ذہن میں اس آدمی کی نفرت انگیز تصویر بھی ابھرتی جس سے زویا سٹے پر جھڑا ہو گیا تھا۔ مگر ان دنوں وہ اس سے کیوں نہیں الجھا تھا جب وہ اور زویا گھنٹوں کی تفریح گاہوں میں نظر آیا کرتے تھے۔ وہ صرف انہیں کینہ توڑ نظروں سے دیکھنے ہی پر ان اتفاق کرتا تھا اور آج بج زویا نے اُسے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا تو وہ اس طرح رہا۔ کیا وہ دونوں ایک دوسرے سے کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے؟

کسی نہ کسی طرح اُسے نیند آگئی اور رات بھر گرہ کٹ اس کی جبین صاف کرتے رہے۔ بارہ رات بھر اسی واقعہ کے متعلق خواب دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں لاشعور کی کون سی گرہ اس واقعے پر متاثر ہوئی تھی۔

دوسری صبح تالاب میں نہاتے وقت وہ آدمی پھر نظر آیا لیکن حمید کو اسے پہچاننے میں بڑی داری پیش آئی۔ اُس نے اپنی کھٹی اور چڑھی ہوئی مونچھیں صاف کر دی تھیں۔ حمید نے سوچا کہ ان لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے اس نے ایسا کیا ہو جنہوں نے پچھلی رات سے ایک گرہ کٹ کے روپ میں دیکھا تھا۔

حمید بظاہر اُسے نظر انداز کر کے تالاب میں حیرتا رہا۔ لیکن حقیقتاً اس کی طرف سے غافل نہیں تھا وہ آدمی بھی غسل کر رہا تھا کئی بار وہ حیرتا ہوا حمید کے قریب سے بھی گزرا لیکن وہ خود می حمید سے بے تعلق سا نظر آ رہا تھا۔

کچھ لڑکیاں تالاب میں ڈائیو کر رہی تھیں چونکہ حمید کو اب کسی نئی دوست کی تلاش تھی اس لئے اس نے سوچا کہ اُسے بھی ڈائیونگ میں حصہ لینا چاہئے۔ لڑکیوں کے علاوہ کچھ مرد بھی ڈائیو کر رہے تھے۔

حمید نے دیکھا کہ ڈائیو کرنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو چھلانگ لگا کر فضا میں قلابازیاں کھاتا ہو غوطے لگا سکے۔

وہ میزبیلوں کے قریب آیا کچھ دیر تک گھاس پر بیٹھا رہا۔ پھر اوپر چڑھنے لگا۔ لوگوں کی نظروں اس طرف اٹھ گئیں کیونکہ ڈائیو کرنے والوں میں ایک نئے آدمی کا اضافہ ہو رہا تھا۔ حمید

”ہاں..... آں..... میں نے بھی تمہارا پر اس کی جیب سے برآمد ہوتے دیکھا“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا اور حمید کو گھورتا رہا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”تم مجھے کہیں اور کی میں بھی چین نہیں لینے دیتے۔“

”ارے واہ.....!“ حمید تنک کر بولا۔ ”کیا میں اپنی جیب صاف کر لیتا۔ ایسا شراذہ لعنت بھیجتا ہوں۔“

”تمہاری شرافت میں نے بغور دیکھی تھی۔“

”اوہ.....!“ حمید بغلیں جھانکنے لگا۔

”تم اب حد سے زیادہ لفنگے پن پر اتر آئے ہو۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی عورتوں کے لئے غنڈوں کی طرح لڑتے پھرو۔“

”پھر میں کیا کرتا..... وہ کم بخت تو جان کو آگیا تھا۔“

”میں نے تمہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔“

”اوہ..... تو یہ وہی آدمی تھا جس کا تذکرہ آپ نے کیا تھا.....؟“

فریدی کوئی جواب دیے بغیر جانے کے لئے مڑ گیا۔

حمید آہستہ آہستہ اپنا سر سہلاتا رہا اور زویا اب اُسے دوسری جگہ سے گھور رہی تھی۔

خونخوار بلخ

حمید رات گئے تک جاگتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی زندگی میں زویا جیسا جس نے خود ہی اس سے کنارہ کیا تھا۔ وہ بھی ایسے انداز میں جو حمید کے لئے قلعہ تھا..... کل تک یہی لڑکی ہوئی کی تفریح گاہوں میں خود اُسے تلاش کیا کرتی تھی..... مگر اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

”ہاں..... بڑے بالوں والی لومڑیاں اور سمور کا شکار میرا ذریعہ معاش ہے۔“

”اوہ..... آپ ہر اعتبار سے دلچسپ آدمی ہیں۔“

حمید نے ایک ویٹر کو روک کر کافی کیلئے کہا جو پلیٹ فارم پر ناشتے کی ٹرالی لئے پھر رہا تھا۔

”آپ کہاں سے آئی ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں تار جام سے آئی ہوں۔“

”آپ کیا کرتی ہیں؟“

”میں کچھ بھی نہیں کرتی۔ میرے پاپا نیشنل آئرن فیکٹری میں انجینئر ہیں۔“

”میرے پاپا بھی زندہ ہوتے تو مجھے بھی کچھ نہ کرنا پڑتا۔“

”اوہ..... یہ بات نہیں ہے۔ میں ابھی زیر تعلیم ہوں۔“

ویٹر نے کافی کی ٹرے ان کے سامنے رکھ دی اور حمید یہاں سے بھرنے لگا۔ دفعتاً اس کی

پائیں جانب اٹھ گئی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر زویا ایک چھتری کے نیچے بیٹھی انہیں گھور رہی

حمید پھر ٹرالی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”بس تھوڑی ہی دیر میں دھوپ تیز ہو جائے گی۔“ ڈالی کہہ رہی تھی۔ ”اور ہمیں کمروں

ابند ہونا پڑے گا۔“

”اگر آپ موسم کے متعلق گفتگو نہ کریں تو میں بے حد مشکور ہوں گا۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں.....؟“

”بس یونہی..... مجھے الجھن ہوتی ہے۔“

”واقعی موسم کے متعلق کسی قسم کی بھی گفتگو بور معلوم ہوتی ہے۔“ ڈالی ہنسنے لگی۔

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر زویا کس قسم کی لڑکی ہے۔

ڈالی کافی پیتی رہی اور حمید کی کافی ٹھنڈی بھی ہو گئی۔

”کیا آپ کو لٹل کافی کے عادی ہیں۔“ ڈالی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”اوہ.....“ حمید چونک کر کافی کی پیالی کی طرف دیکھنے لگا پھر ہنس کر بولا۔ ”براہیل کی

نے چھلانگ لگا کر ایک قلابازی کھائی اور تماشائی تالیاں بجانے لگے۔ حمید کسی مچھلی کی طرح

کی سطح پر ابھرا اور تالاب کا چکر لگاتا ہوا پھر سبزھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن اس بار ایک

نے بھی چھلانگ لگا کر فضا میں ایک قلابازی کھائی۔ پھر اُس لڑکی نے باقاعدہ طور پر اس

مقابلہ شروع کر دیا لیکن وہ تین قلابازیوں سے آگے نہ بڑھ سکی اور حمید نے پانچ قلابازیوں

بعد اعلان کر دیا کہ ”اتنی اونچائی سے پانچ قلابازیوں سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔“

وہ تالاب سے نکل کر اپنی چھتری کے نیچے آ لیٹا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی اس کی طرف

دکھائی دی جس نے اُس سے ڈائیونگ میں مقابلہ کیا تھا۔ حمید اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ بوجھ شائد ارہے۔“ اُس نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ یہ ایک بو

لڑکی تھی۔ متناسب الاعضاء اور بہت دلکش۔ اس کے بال سرخی مائل بھورے تھے اور آ

گہری نیلی تھیں۔

”مجھے زیادہ مشق نہیں ہے۔“ حمید نے خاکساری ظاہر کی۔

”میرے خدا.....!“ لڑکی تحیر آمیز تمسخر کے ساتھ بولی۔ ”زیادہ مشق کی صورت

آپ اڑتے پھریں گے۔“

حمید نے شرمانے کی ایکٹنگ شروع کر دی۔

”آپ کہاں سے آئے ہیں۔“ لڑکی نے پوچھا۔

”گھر سے..... آررر..... میرا مطلب ہے نصیر آباد سے۔“

”مجھے ڈالی پرنکس کہتے ہیں.....!“ لڑکی مسکرا کر بولی۔

”مم..... میں..... پرویز ہوں۔“ حمید ہکلا یا۔

انہوں نے معمول کے مطابق ہوٹل کے رجسٹر میں فرضی نام درج کرائے تھے۔

”کیا کرتے ہیں؟“

”مم..... میں..... شکاری ہوں۔“

”شکاری.....!“

کافی مجھے ہمیشہ خوابوں کے جزیرے میں پہنچا دیتی ہے۔“

”شکاری بھی خواب دیکھتے ہیں۔“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں..... ارے شکاری۔“ حمید ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”شکاریوں کے

تو.....!“

غیر ارادی طور پر حمید کی نظر زویا کی چھتری کی طرف اٹھ گئی اور وہ جملہ پورا

کیونکہ اس کی چھتری کے قریب وہی آدمی موجود تھا جس سے پچھلی رات حمید کا جھگڑا

لیکن وہ زویا کی طرف متوجہ نہیں تھا اور نہ ہی حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا

وہ دونوں ہی اس کے لئے اجنبی ہوں۔ مگر زویا کچھ گھرائی ہوئی سی نظر آ رہی تھی۔

”آپ.....!“ ڈالی نے اُسے مخاطب کیا۔ ”بات کرتے کرتے کچھ اور سوچنے لگے

”ہاں..... آں..... مجھے شکار گاہیں یاد آتی ہیں جہاں حد نظر تک برف ہی بڑ

ہے اور ہم اسکا تیز پر تیرتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی سفید بھیر یوں سے مقابلہ ہوتا ہے

قطبین کے سفید ریچھوں سے اودہ..... وہ کتنا حسین ماحول ہوتا ہے۔“

”قطبین.....!“ ڈالی نے حیرت سے دہرایا۔ ”آپ قطبین میں شکار کھیلتے ہیں۔“

”میں نے شاید جغرافیہ میں پڑھا تھا کہ قطبین کے ریچھ بڑے خطرناک ہوتے ہیں

”ارے کچھ بھی نہیں۔“ حمید نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ”میں نے ایک بار زندہ

کھال کھینچ لی تھی۔“

ڈالی ہنسنے لگی اور حمید نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ”آپ شاید اسے بکواس سمجھتی ہیں۔

”نہیں..... نہیں.....!“ ڈالی سنجیدگی اختیار کرتی ہوئی بولی۔ ”مجھے وہ واقعہ ضرور نا

”کون سا واقعہ؟“

”وہی کہ آپ نے زندہ ریچھ کی کھال کیسے کھینچی تھی۔“

”ہاں..... آں..... وہ واقعہ یوں ہے کہ ایک بار میں نے ساتھی شکاریوں کے

بڑے دعوے سے کہہ دیا کہ میں زندہ ریچھ کی کھال کھینچ سکتا ہوں۔ وہ لوگ اسے مذاق

بڑھ گئی۔ ایک لمبی شرط کے بعد میں نے انہیں یہ تماشہ دکھانے کا انتظام شروع کر دیا۔ ایک

قسم کے کارتوس بنائے جن میں گولی کی بجائے لمبی لمبی میخیں فٹ تھیں۔ میرا وہ دعویٰ سچ

مذاق ہی میں مل گیا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی باور کرنے پر تیار نہ تھا کہ میں کسی زندہ ریچھ کی

ال کھینچ لوں گا۔ اتفاق سے ایک دن ایک ریچھ مل ہی گیا جو برف کے ایک تودے پر بیٹھا

رہا تھا۔“

”ستار بجار ہا تھا..... ریچھ۔“ ڈالی ہنس پڑی۔

”اودہ..... ٹھہریے..... شاید میں بھول رہا ہوں۔ ہاں دیکھئے ستار نہیں وہ تودے پر بیٹھا

ہی رہا تھا۔ میں نے اس کی دم کا نشانہ لے کر فائر کر دیا اور رائفل سے گولی کی بجائے میخ

ل کر اس کی دم چھیدتی ہوئی برف میں اتر گئی۔ ریچھ نے حقہ پھینک کر اچھلنا شروع کر دیا۔

رہا وہ کہاں جاسکتا تھا۔ میں کوڑا نکال کر اس پر برسائے لگا۔ وہ خاموشی سے پٹتا رہا لیکن

ب بٹنے پٹنے گھبرا گیا تو اسے کھال چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔“

ڈالی ہنسنے لگی اور کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”مگر ریچھوں کی دم کہاں ہوتی ہے۔“

”نہ ہوتی ہوگی۔“ حمید لاپرواہی سے بولا۔ ”لیکن میں ہمیشہ دم دار ریچھوں کا شکار کرتا

وں۔ بغیر دم کے ریچھ میرے ساتھی مارتے ہیں۔“

”کتنی بڑی ہوتی ہے ریچھ کی دم“ ڈالی نے پوچھا۔

”کافی بڑی ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ خاندانی قسم کے ریچھوں کی دمیں کافی سے زیادہ بڑی

ہوتی ہیں۔“

حمید خاموش ہو گیا اور ڈالی کافی دیر تک ہنستی رہی۔

”آپ بڑے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اس پر بھی شبہ ہے کہ آپ کوئی

پٹیرور شکاری ہیں۔“

”کیا آپ کس شے کی بناء پر مجھے شکار ملتا بند ہو جائے گا۔“ حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”اُسے آپ تو ناراض ہو گئے۔“ ڈالی جلدی سے بولی۔ ”میں نے تو یونہی مذاق کہہ دیا تھا۔“

”خیر ہوگا۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا اور کافی کی پیالی ایک طرف ہٹا کر پار
تہا کو بھرنے لگا۔

زویا اب بھی وہیں تھی، لیکن وہ آدمی جا چکا تھا۔ اب حمید نے اس کے چہرے پر
کے آثار دیکھے۔

”کیا آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں۔“ دفعتاً ڈالی نے پوچھا۔

”کیوں؟“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”وہ آپ کو بار بار، اس انداز میں گھورتی ہے جیسے آپ نے اس کے ساتھ کوئی
ہو۔“ ڈالی نے منہ کر کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ حمید نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”یہ اپنے ویشی بیک میں ایک چھوٹا سا پستول رکھتی ہے۔“

”نہیں.....!“ حمید کے لہجے میں خیر تھا۔

”ہاں..... ہاں..... میں نے خود دیکھا تھا۔ تین چار دن پہلے کی بات ہے۔“

کے قریب جہاں بھورے رنگ کی بلی تیزتی رہتی ہے اس کے ہاتھ سے ویشی بیک گرا
شائد اسے کھول کر کوئی چیز نکال رہی تھی۔ وہ گرا اور اس کی چیزیں گھاس پر بکھر گئیں۔
ایک چھوٹا سا پستول بھی تھا۔“

”ممکن ہے وہ سگریٹ لائٹر رہا ہو۔ آج کل پستول کی ساخت کے سگریٹ لائٹر

”ہو سکتا ہے مگر یہ لڑکی ویسے بھی بے حد پُر اسرار معلوم ہوتی ہے۔“

”پُر اسرار..... پُر اسرار۔“ حمید اپنی پیشانی رگڑتا ہوا بولا۔ ”میں آج تک یہ نہ

یہ پُر اسرار کیا بلا ہے۔“

”اگر کوئی ریچھ کسی برف کے تودے پر بیٹھا ستار بجاتا یا حقہ پیتا ہوا پایا جائے

پُر اسرار ریچھ کہیں گے۔“ ڈالی نے کہا اور بیساختہ منہ پڑی۔

”آپ میرا مضحکہ اڑا رہی ہیں۔“

”اوہ..... آپ پھر بگڑ گئے۔ میں دراصل آپکو بتانا چاہتی تھی کہ پُر اسرار کسے کہتے ہیں۔“

”دیکھئے! میں ایک سیدھا سادھا شکاری ہوں۔ مجھے الفاظ کی الٹ پھیر نہیں آتی۔“

”اسی لئے تو وہ ریچھ ستار بجاتا رہا تھا۔“

”بڑی مصیبت ہے۔“ حمید برا سامنہ بنا کر بولا۔ ”کہئے تو کسی آدمی کی کھال کھینچ کر

وں۔ ریچھ تو یہاں نہیں ملے گا۔“

”مگر آدمی کی دم کہاں ہوتی ہے۔“

”کیا آپ نے فلسفہ لے رکھا ہے۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔

”فلسفے کو دم کی تلاش نہیں رہتی۔“ ڈالی سنجیدگی سے بولی۔

”حالانکہ فلسفی عموماً دم دار ہی ہوتے ہیں۔“

”بس تو پھر کسی فلسفی کی کھال کھینچ کر دکھا دیجئے۔“

”نہیں، یہ ناممکن ہے کیونکہ مجھے آپ پر رحم آتا ہے۔“ حمید نے کہا اور ڈالی جھینپی ہوئی

ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

زویا وہاں سے جا چکی تھی۔ حمید ایک بے نام سی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔

ڈالی حمید کو چھڑتی رہی۔ لیکن حمید کچھ خاموش سا ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ پہلی ہی

ت میں زویا خود اسے بھی پُر اسرار معلوم ہوئی تھی۔

اب وہ بھی اٹھنا چاہتا تھا لیکن ڈالی جمی گئی تھی۔

”مجھے بھی شکار کا بے حد شوق ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہر شریف عورت کو ہونا چاہئے۔“

”کیوں.....؟“

”شریف عورتیں شوہر کو گولی نہیں مارتیں لیکن اکثر مار دینے کو دل چاہتا ہے۔ لہذا اگر

ہرول کے بجائے ریچھوں پر ہاتھ صاف کیا جائے تو قانون کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”تو کیا آپ بھی.....!“ وہ بے ساختہ منہ پڑی اور بمشکل تمام کہہ سکی ”شوہر سے مایوس

بر 20

”سے بھی تھا اس لئے فریدی آندھی اور طوفان کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوا۔
”وہ مر گیا۔“ فریدی اسے گھورتا ہوا بولا۔

”کون.....؟“

”جس سے پہلی رات تمہارا جھگڑا ہوا تھا۔“

”میرادل دکھانے والے اسی طرح مر جاتے ہیں۔“ حمید بیوہ عورتوں کے سے انداز میں بولا۔
”کیواس مت کرو۔ تم نے خواہ مخواہ ایک الجھن میں ڈال دیا ہے۔“

”میں نے کیوں؟ اگر وہ مر گیا ہے تو یہ صرف میری بددعاؤں کا اثر ہو سکتا ہے۔ اور
ماؤں سے قانون کو کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر آپ پوری بات بھی تو بتائیے۔“

”اسے بھوری بلیج نے زخمی کر دیا تھا۔“

”ارے تو کیا وہ بھوری بلیج میری خالہ ہے۔“ حمید جھنجھلا گیا۔ پھر یک بیک چونک پڑا۔
”پھر.....!“

”وہ اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے گر کر مر گیا۔“

”کیا بلیج نے اُس کی گردن پکڑ لی تھی۔“

”نہیں پنڈلی میں کاٹا تھا۔“

”آپ شاید ابھی ابھی سو کر اٹھے ہیں۔“

”اُس نے شاید پچھلی رات والے جھگڑے کی بناء پر اپنی مونچھیں صاف کر دی تھیں۔“

”جھگڑا مونچھوں پر نہیں ہوا تھا۔“

”تم نہیں سمجھ سکتے کہ تم سے کون سی حماقت سرزد ہوئی ہے۔“ فریدی نے غصیلے لہجے میں

کہا۔ ”وہ بلیج کے کاٹنے سے نہیں مرا۔ کوئی نہیں مر سکتا۔“

”پھر یہ سب کچھ انواء ہوگی..... جائے آرام کیجئے۔ آج میری طبیعت خلاف معمول
میک نہیں ہے۔“

”اٹھو.....!“ فریدی نے تھکانہ لہجے میں کہا۔

ہو کر ریچھوں کا شکار کرتے ہیں۔“

”نہیں! اب میں ریچھوں سے مایوس ہو کر بیوی کے باپ کی تلاش میں ہوں۔“

”کیا..... آپ کی بیوی ساتھ نہیں ہیں۔“ ڈالی نے پوچھا۔

”آپ بہت موٹی عقل رکھتی ہیں۔ بغیر باپ کے بیوی کہاں سے پیدا کی جا سکی

آپ کے والد صاحب نیشنل فیکٹری کے منیجر ہیں نا.....!“

”آپ گدھے ہیں۔“ ڈالی نے چڑ کر کہا۔

”اگر گدھے ہیں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی تصور کروں گا۔“

”شٹ اپ.....!“ اُس نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا اور تالاب میں چھلانگ لگا

حمید اُسے تیرتا دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی اٹھا..... کپڑے پہنے اور وہاں سے چل پڑا۔

وہ حوض پڑتا تھا جہاں بھورے رنگ کی بلیج ہر وقت تیرتی ہوئی پائی جاتی تھی۔ حمید اس

کہانی کئی بار سن چکا تھا اور اس کی ہنسی بھی اڑا چکا تھا۔ ویسے لڑکیاں اس میں عام طور پر

دلچسپی لیتی تھیں۔ کہانی ہی ایسی تھی کہ وہ بلیج بلیٹوں کی نسل کی لیلیٰ کہی جاسکتی تھی، ہیر کو

تھی اور شاید سوہنی بھی۔ کبھی اس حوض میں بلیٹوں کا جوڑا تیرا کرتا تھا مگر ایک دن بلیج ا

نے ڈس لیا۔ پھر اس دن سے مادہ بلیج حوض سے باہر نکلتے نہیں دیکھی گئی۔ اگر کوئی ا

نکا لانے کی کوشش کرتا تو وہ چونچ پھیلا کر کاٹنے کو دوڑتی اور اس کی آنکھوں سے پانی بہنے ا

حوض کے قریب حمید کو زودیا پھر نظر آئی۔ لیکن حمید کو دیکھتے ہی وہ آگے بڑھ گئی۔

بے تحاشہ غصہ آیا لیکن وہ غصہ رفتار پر اترا۔ یعنی وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب۔

آگے نکل گیا۔

اسی دن تین بجے شام کی بات ہے۔ اچانک پیراڈائز میں سنسنی پھیل گئی اور اس

ذمہ دار بلیٹوں کی ”سوہنی“ تھی۔ حمید تک یہ واقعہ فریدی ہی کی زبانی پہنچا۔ کیونکہ صبح گئے

بعد سے اس کی طبیعت کچھ بھاری سی ہو گئی تھی اور وہ تالاب سے واپسی پر اب تک اپنے

ہی میں رہا تھا۔ ممکن ہے اُسے خبر ہی نہ ہوتی لیکن چونکہ اس واقعہ کا تھوڑا بہت تعلق ذ

”میں سر کے بل کھڑا نہ ہو جاؤں۔“ حمید تقریباً ناچتا ہوا بولا۔ ”کھڑے ہو جاؤ.....“
 ”تبدیل کرو۔ بیٹھ جاؤ..... کیا میں کپڑے تبدیل کئے بغیر نہیں بیٹھ سکتا۔“
 ”میں نے لباس تبدیل کرنے کو نہیں کہا تھا۔“ فریدی مسکرایا۔
 ”کھڑے ہو جاؤ..... کہنے کا انداز تو یہی تھا کہ کفن پہنو اور قبر میں چھلانگ لگا دو۔“
 اسے میں فون کی گھنٹی بجی۔ حمید نے ریسیور اٹھالیا۔ آپریٹر نے اطلاع دی کہ اسکی کال ہے۔
 ”کنکٹ کرو۔“ حمید نے کہا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں ایک نسوانی آواز آئی۔ ”ہیلو.....
 مجھے تمہارا شکر گزار ہونا چاہئے کہ تم نے اُس موذی سے مجھے نجات دلا دی..... مگر میرے
 میں اسے کیسے بھلا سکوں گی کہ ایک آدمی نے میرے لئے دوسرے کی جان لے لی تھی۔“
 ”کیا.....؟“ حمید ماؤتھ پیس میں دباڑا۔ لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

نبیلی شیشی

وہ ریسیور رکھ کر فریدی کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس
 ایک بیک پلٹ کر ریسیور اٹھایا۔
 ”ہیلو آپریٹر، یہ کال کہاں سے آئی تھی؟“
 ”اوہ..... یہ بتانا دشوار ہے جناب۔“
 ”کیا ہوٹل کے کسی کمرے سے۔“
 ”نہیں..... یہ کال یہاں کی نہیں ہو سکتی۔ شہر کی ہو سکتی ہے۔“
 ”تم سے غلطی تو نہیں ہوئی۔ یہ کال میری نہیں ہو سکتی۔“
 ”آپ روم نمبر ستاون ہی سے بول رہے ہیں نا۔“
 ”ہاں بھئی۔“

حمید نے ایک طویل سانس کے ساتھ بستر چھوڑ دیا۔ فریدی کہہ رہا تھا۔
 ”کسی کو بھی یقین نہیں ہے کہ اس کی موت بطخ کے کاٹنے سے واقع ہوئی ہوگی۔“
 پچھلی رات والے جھگڑے کا بھی حوالہ دے رہے ہیں اور انہیں اس پر حیرت ہے کہ
 والے نے اتنی شاندار موغیوں کیوں صاف کر دی تھیں۔“
 حمید لباس تبدیل کر رہا تھا۔ فریدی کے خاموش ہوتے ہی اُس نے کہا۔ ”مثلاً
 قبروں میں بھی قتل ہوں گے۔ شاعر نے شاید ہمارے ہی لئے کہا تھا کہ مر کر بھی چین
 کدھر جائیں گے۔“
 فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ بہت غور سے حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس
 ”میرا خیال ہے کہ اب اس لڑکی سے تمہارے تعلقات قریب قریب ختم ہو چکے ہیں۔“
 ”ہاں یہ غلط نہیں ہے۔ پچھلی شام جب میں نے اُسے مخاطب کرنے کی کوشش کی
 نے مجھے بچپانے سے انکار کر دیا۔“

”اوہ.....!“

”نور..... یہ حقیقت ہے کہ ہم اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب سے نکل جاتے؟“
 ”اس آدمی سے جھگڑا کس بات پر ہوا تھا.....؟“
 ”اسی کے متعلق..... لیکن میں کبھی اسے زویا کے ساتھ نہیں دیکھا، اور نہ ہی معلوم
 تھا کہ ان دونوں میں دور کی بھی جان پہچان ہو سکتی ہے۔ لیکن اس نے مجھ سے یہی کہا تھا
 زویا کے پیچھے نہ پڑوں۔“
 ”اس لڑکی کے متعلق تم کیا جانتے ہو۔“
 ”بس اتنا ہی کہ اس کا نام زویا ہے۔“
 ”کہاں سے آئی ہے؟“
 ”یہ اس نے نہیں بتایا۔ شاید میں نے یہ سب کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔“
 ”اچھا..... بیٹھ جاؤ.....!“ فریدی بھی بیٹھتا ہوا بولا۔

”تب تو یہ آپ ہی کی کال تھی۔ بولنے والے نے روم نمبر ستاون ہی مانگا تھا۔“
 ”تب پھر بولنے والی ہی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ حمید نے جھنجھلا کر ریسپورڈ رکھ دیا۔
 ”کیا بات ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔
 حمید نے اسے کال کے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آواز زویا کی نہیں ہو سکتی، مجھے یقین
 ”چلو..... میں نے بھی یقین کر لیا۔“ فریدی مسکرایا۔ ”اور تم نے یہ بھی اچھا کیا“
 سے اس سلسلے میں اتنی بحث کر ڈالی۔ اب وہ اس کال کو کبھی نہ بھلا سکے گا۔ کیا بولنے
 تمہیں نام لے کر مخاطب کیا تھا؟“

”جی ہاں..... یقیناً۔“ حمید کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”اس نے نام لیا تھا۔“
 ”یہ بڑی اچھی بات ہے۔“ فریدی بڑبڑایا۔ ”اگر تمہارے جھگڑے کی داستان پہ
 پہنچی تو مزہ آ جائے گا۔“

”اگر پھانسی پا جاؤں تو تواری کرادیجئے گا تاکہ پڑوسیوں کو بھی مزہ آ جائے۔“ حمید
 فریدی چند لمحوں کے بعد سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تم میری اجازت کے بغیر ایک منٹ
 بھی باہر نہیں جاؤ گے۔“
 ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں اس لڑکی زویا کو چیک کروں گا۔ اگر وہ کال اسی کی تھی تو اُسے اس کے
 طور پر شہر جانا پڑا ہوگا اور شہر سے اتنی جلدی واپسی ناممکن ہے۔“

فریدی یں چلا گیا اور حمید بور ہوتا رہا۔ ویسے وہ اس حادثے کے متعلق بھی سوچ رہا
 اس بطن کی چونچ زہریلی ہے۔ لیکن اگر یہ بات ہوتی تو کوئی عورت حمید کو اس کیس میں
 کی کوشش کیوں کرتی۔ بطن صرف انہی لوگوں پر حملہ کرتی تھی جو اسے پانی سے نکالنے
 کرتے تھے۔ کیا اس آدمی نے بھی اس قسم کی کوئی حرکت کی تھی۔ اسی سلسلے میں حمید کو
 آگیا کہ تالاب سے آتے وقت اسے زویا ملی تھی اور اس نے اسے بطن والے حوض ہی
 کھڑے دیکھا تھا۔ آخر وہ وہاں کیا کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ حمید چونک پڑا۔
 ”کون ہے؟ آ جاؤ۔“ حمید نے کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں ڈالی
 اڑھ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ حمید کرسی سے اٹھ گیا۔
 ”اوہ..... بیٹھو بیٹھو۔“ ڈالی نے کہا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ ایک کرسی پر ڈھیر
 ہوئی بولی۔ ”یہ کیا مصیبت ہے۔ آج ہی تو ہماری دوستی ہوئی تھی۔“
 ”کیا مطلب.....؟“

”میں بڑی مشکل سے آپ کا روم نمبر معلوم کر کے یہاں تک پہنچی ہوں۔ کیا آپ نے
 بطن کا واقعہ سنا۔“
 ”ہاں مجھے معلوم ہوا ہے اس نے کسی آدمی پر حملہ کیا تھا اور وہ آدمی اتنا چوہا تھا کہ اس
 بطن کی تاب نہ لا کر چل بسا۔“

ڈالی حمید کو گھورنے لگی اور حمید کو اس کی آنکھوں سے شبہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔
 ”مگر آپ نے ابھی اس نئی دوستی کا حوالہ کیوں دیا تھا۔“ حمید نے پھر کہا۔
 ”وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ پچھلی شام اس کا شکاری پرویز سے جھگڑا ہو گیا تھا۔“
 ”اس لئے شکاری پرویز نے بطن کا بھیس بدل کر اُسے ختم کر دیا۔“ حمید نے برا سامنا
 کیا۔ ”کیا لوگوں نے یہ نہیں بتایا کہ جھگڑے کے وقت اس کے چہرے پر گھٹنی موٹھیں تھیں۔“
 ”اب لاش سے موٹھیں بھی نثار دے گئی ہیں۔“

”ہاں..... ہاں..... وہ اس کے متعلق بھی کہہ رہے ہیں پولیس آگئی ہے۔“
 ”ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اس کی موت کسی بہت ہی سریع الاثر قسم کے زہر سے واقع ہوئی ہے۔“
 ”زہر.....؟“ حمید نے حیرت سے دہرایا۔
 ”ہاں..... اس کا سارا جسم نیلا پڑ گیا ہے۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد پائپ میں تمباکو بھرتا ہوا بولا۔ ”تو آپ یہ سمجھتی ہیں
 اس میں میرا ہی ہاتھ ہے۔“

”نہیں..... میں تو یہ نہیں سمجھتی۔ میں آپ کو اس کی اطلاع دینے آئی تھی۔“
 ”اچھا تو پھر مجھے اس حادثے سے اتنا بے تعلق سمجھتی ہیں کہ مجھے اسکی خبر ہی نہ ہونی چاہیے۔“
 ”میں خود بھی نہیں سمجھ سکتی کہ میں کیوں دوڑی آئی ہوں۔“
 حمید اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا اور اس نے پلکیں جھکا لیں۔ پھر آہستہ سے
 ”آج تقریباً دس بجے اس نے مجھ سے گفتگو کی تھی۔“

”کس نے.....؟“

”مرنے والے نے۔“

”اوہو..... کیا گفتگو ہوئی تھی؟“ حمید پر اشتیاق لہجے میں آگے جھک آیا۔

”اس نے یہی پوچھا تھا کہ کیا میں آپ کو بہت دنوں سے جانتی ہوں۔“

”پھر آپ نے کیا جواب دیا.....؟“

”یہی کہ ہم آج ہی ملے تھے۔“

”پھر.....؟“

”اس نے بہت بُرے لہجے میں کہا تھا کہ آپ ایک خطرناک آدمی ہیں۔“

حمید نے ہلکا سا ہتھکڑا لگا کر کہا۔ ”اور آپ اس کے باوجود بھی دوڑی آئیں۔“

”مجھے اسکی بکواس پر اب بھی یقین نہیں ہے۔ مگر اس سے آپکا جھگڑا کس بات پر؟“

”کیا ان گدھوں نے پولیس کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے میری جیب سے پرس نکالا؟“

”جی ہاں اس کا بھی تذکرہ تھا۔“

”تو اب مجھے پولیس کا خطر رہنا چاہیے۔“

”یقیناً.....!“

”تو بس پھر آپ فوراً یہاں سے چلی جائیے۔“

”کیوں.....؟“

”ورنہ شاید آپ بھی اس معاملے میں الجھائی جائیں۔“

”آپ کو پولیس سے خوف نہیں معلوم ہوتا۔“ ڈالی نے پوچھا۔
 ”مجھے صرف ان لڑکیوں سے خوف معلوم ہوتا ہے جو خود کو بیوقوف ظاہر کرنے کی کوشش

”ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب وہی لڑکیاں بتا سکیں گی۔“

ڈالی اُسے چند لمحے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”ڈاکٹر کا خیال ہے کہ زہر اُسی زخم

مارے جسم میں پھیلا ہے۔“

”میں ڈاکٹر نہیں ہوں کہ اس کے خیال کی تائید یا تردید کر سکوں گا۔“

”اگر آپ شے کے تحت گرفتار کر لئے گئے تو.....؟“

”کانی فائدہ ہوگا..... وہ رقم بچے گی جو اس مہنگے ہوٹل میں صرف ہونے والی ہے۔ اس

میں مفت سیزن گزار سکوں گا۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے رام گدھ ہی کے جیل میں رکھیں گے۔“

”آہا.....!“ ڈالی مسکرائی۔ ”تب تو میں یہاں ضرور ٹھہروں گی۔ میں دیکھوں گی کہ آپ

ماتے کس طرح نپٹتے ہیں۔“

”میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“ حمید نے خشک لہجے میں کہا۔

اس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ چلی جائے لیکن ڈالی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ حمید کو دراصل فریدی

یال تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ایسے میں فریدی آ گیا تو وہ اور زیادہ مشتعل ہو جائے گا۔

”آپ پولیس کو کیا بیان دیں گے؟“ ڈالی پھر بول پڑی۔

”بیان..... جو کچھ آپ بتائیں گی۔“

”اوہو..... شاید آپ سچ مچ نہیں چاہتے کہ میں یہاں ٹھہروں۔“

”اس میں آپ کی بھلائی مضمر ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ بھی پولیس کی لسٹ پر آ جائیں۔“

ڈالی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر اٹھتی ہوئی بولی۔ ”اچھی بات ہے۔ لیکن اگر آپ حراست

ماتے لئے گئے تو مجھے بے حد افسوس ہوگا۔“

”خیر ہم سے کیا غرض۔“

”چہ نہیں..... اب جاؤ۔“

حمید کا ٹیبل کے ساتھ چلنے لگا۔

”خراپ لوگ میرا بیان کیوں چاہتے ہیں۔“ حمید نے کانٹیل سے پوچھا۔

”چہ نہیں جناب! ڈی ایس پی صاحب جانیں۔“

حمید منبر کے کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں تین پولیس آفیسر موجود تھے۔ ایک ڈی ایس پی ”دوب انپکٹر۔“

ڈی ایس پی نے حمید کو نیچے سے اوپر تک گھور کر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”شریف رکھئے۔“

حمید کافی شریفانہ انداز میں اس کا شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

”آپ فیروز کو کب سے جانتے ہیں؟“ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

”کون فیروز.....!“ حمید نے حیرت ظاہر کی۔

”وہی جس سے پچھلی رات آپ کا جھگڑا ہوا تھا۔“

”اوہ..... وہ..... گرہ کٹ۔“

”آپ اُسے کب سے جانتے ہیں۔“

”اگر میں پہلے سے جانتا ہوتا تو میرے قریب ہی کیوں آتا۔“

”آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ اُس نے آپ کی جیب سے پرس نکالا تھا۔“

”جن لوگوں نے آپ کو اس کی اطلاع دی ہے کیا انہوں نے آپ کو نہیں بتایا۔“

”آپ کی ایسے آدمی کا نام لیجئے جو اس وقت وہاں موجود تھا۔“

”تمہا کی کو بھی نہیں پہچانتا اور پھر اس وقت مجھے اتنا ہوش کہاں تھا کہ میں حاضرین کی فہرست مرتب کرتا۔“

”تو آپ نشے میں تھے۔“

”میں اس ہمدردی کے لئے مشکور ہوں۔“ حمید نے طویل سانس لے کر کہا۔ وہ بڑھا کہ اس کی موجودگی میں فریدی کی واپسی ہو۔

ڈالی چلی گئی۔ حمید اب اس کے متعلق بھی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ وہ تو ایک لڑکی مواقع پر مرد بھی اُس سے کسی قسم کا تعلق ظاہر کرنے سے کتراتے۔ لیکن وہ اسے بتاتا کہ پولیس اس پر شبہ کر سکتی ہے، حالانکہ ان کی جان پہچان کی عمر آدھے گھنٹے سے زائد تھی۔ پھر بھی اس نے گویا سا لہا سال کے تعلقات کا ساتھ ادا کر دیا تھا۔

ڈالی کے جانے کے چندہ منٹ بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ حمید نے اٹھ کھولا۔ سامنے ایک باوردی کانٹیل موجود تھا۔

”پرویز صاحب۔“ اس نے پوچھا۔

حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ لیکن اس نے اپنے چہرے کے آثار پہلے ہی پیدا کر لئے تھے۔

”کیا آپ منبر کے کمرے تک تکلیف کر سکیں گے؟“

”کیوں.....؟“ حمید نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”ڈی ایس پی ٹی آپ سی گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔“

حمید کو علم تھا کہ آج کل ڈی ایس پی ٹی ماتر نہیں ہے۔ اُس کا یہاں سے ہوا تھا۔ حمید سوچنے لگا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ دفعتاً اُسے فریدی نظر آیا جو اسی طرف آ رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا۔ ”یہ خبر سچ ہی تھی کہ وہ آدمی مر گیا جس سے پچھلی رات نہما ہوا تھا۔“

”کیا بلیغی کے کاٹنے سے مراد ہے؟“

”ہاں..... پولیس شاید اس سلسلے میں تمہارا بیان چاہتی ہے۔“

”میرا بیان کیوں؟“

”چہ نہیں..... میں بھی بیان ہی دے کر آ رہا ہوں۔“

”نہیں..... میں غصے میں تھا۔“

”اور آپ کا غصہ آج تک برقرار رہا۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”کیا آپ کو علم ہے کہ وہ مر گیا؟“

”ہاں کچھ دیر پہلے میں نے سنا تھا۔“

”آپ کہاں تھے؟“

”اپنے کمرے میں۔“

”کس وقت سے کس وقت تک آپ اپنے کمرے میں رہے۔“

”تو بجے سے اس وقت تک۔“

”درمیان میں آپ باہر نہیں نکلے۔“

”نہیں۔“

”ہم آپ کے سامان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ حمید نے جواب دیا۔ ”کیا آپ کے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے؟“

”اوہ.....!“ ڈی ایس پی مسکرایا۔ ”آپ سمجھتے نہیں۔ یہ ایک ضمنی سی کارروائی ہے۔“

”کیسی بھی ہو۔ وارنٹ کے بغیر آپ میرے سامان میں ہاتھ بھی نہ لگا سکیں گے۔“

”قانون میں بھی جانتا ہوں۔“

”پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ قانون دانوں کے ساتھ ہم ذرہ برابر بھی رعا

نہیں کرتے۔“ ڈی ایس پی کی مسکراہٹ بدستور برقرار رہی۔

”نہیں..... مجھے اس کا علم نہیں تھا۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”اب ہو جائے گا۔“ ڈی ایس پی نے خشک لہجے میں کہا۔ ”ہم وارنٹ حاصل کئے

محض شے کے تحت آچکراست میں لے سکتے ہیں۔ کیونکہ انکی موت زہر کی وجہ سے واقع ہوئی ہے؟

”آہ..... تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے بظ کا بھیس بدل کر اس پر حملہ کیا ہوگا۔“

”مسٹر.....!“ ڈی ایس پی غرایا۔ ”ہوش میں آئیے۔ آپ اپنا بیان دے رہے ہیں اور

آپ کے خلاف عدالت میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔“

”میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے میں عدالت میں دہرانہ سکوں۔“

ڈی ایس پی نے ایک سب انسپکٹر کی طرف مڑ کر کہا۔ ”انہیں کو توالی لے جاؤ اور حراست

لھو۔“

”لیکن اس کے باوجود بھی تلاشی کے وارنٹ کے بغیر میرے سامان میں ہاتھ نہیں لگا سکیں

ر تلاشی کے وقت میری موجودگی ضروری ہوگی اور اس سے قبل میں تلاشی لینے والوں کی

لاشی لوں گا۔“

ٹھیک اسی وقت فریدی کمرے میں داخل ہوا۔

”میں آپ کے ساتھی کو حراست میں لے رہا ہوں۔“ ڈی ایس پی نے فریدی سے کہا۔

”جو آپ مناسب سمجھیں۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”یہ مجھے قانون پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”حالانکہ یہ قانون کی ابجد سے بھی نا بلند ہے۔“ فریدی مسکرایا۔

”تشریف رکھئے۔“ ڈی ایس پی نے اس سے کہا۔ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”میں

ان کے سامان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں کیا اعتراض ہے؟“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔

”تلاشی کا وارنٹ۔“

”کیوں ہے۔“ فریدی نے کہا۔ پھر ڈی ایس پی سے بولا۔ ”نہیں جناب آپ لیجئے۔

پ کوئی کام خلاف قانون کیوں کرنے لگے۔“

حمید کچھ دیر تک اس کے خلاف احتجاج کرتا رہا۔ پھر اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

تھوڑی دیر بعد تلاشیاں شروع ہو گئیں۔ فریدی کا سامان بھی الٹ پلٹ کر ڈالا گیا لیکن

اس کی بیان کے مطابق کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہو سکی۔ ویسے اس نے ان

”ہارجام میں کوئی نیشنل آرژن فیکٹری نہیں ہے۔“ فریدی بولا۔
 ”کیا؟“ حمید کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”حمید کہیں مجھے سچ سچ تم پر پابندیاں نہ لگانی پڑیں۔“

”آپ خفا کیوں ہوتے ہیں۔ دیکھئے نامیری بدولت آپ کے لئے تفریح مہیا ہوگئی۔ کیا بے شاعر کس نہیں ہے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ حمید پائپ کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا۔

”تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔“ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس شیشی میں کیا ہے۔“

”نہریے۔“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”یہ ابھی تک نہ معلوم ہو سکا کہ پٹخ نے حملہ کیسے کیا تھا۔“

”کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ وہ اُسے حوض سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”تب پھر کسی نے اس کا مشورہ دیا ہوگا۔“

”ضروری نہیں ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پٹخ کی چونچ پہلے ہی زہر آلود کردی گئی ہوگی۔“

”پھر اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔“

”کیا پٹخ اس صورت میں زندہ رہ سکتی ہے؟“ فریدی بولا۔

”پھر آخر..... یہ کیسے ہوا۔“

”کسی نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اگر اُس پر پٹخ حملہ نہ کرتی تب بھی وہ آج ختم ہی کر دیا

تا اور چونکہ پچھلی رات تم سے جھگڑا ہو چکا تھا اس لئے تم ہی اس کیس میں الجھائے جاتے لیکن

ماکی پشت پر جو کوئی بھی ہے کافی ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔ پہلے تمہارے لئے فون پر کال آئی

راں کے بعد یہ شیشی۔ کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ اس کمرے کی تلاشی کے بعد ہی ٹیلی فون

پائپر نے پولیس کو اپنی رپورٹ دے دی تھی اور یہ رپورٹ اسی کال کے متعلق تھی۔“

”نمبر خدا۔“ حمید اپنا سر سہلانے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”تو میں پھنس جاؤں گا۔“

”اب تم یوریشین لڑکی سے کترانے کی کوشش نہ کرنا۔“

”اب تو میں اسے دل کی ملکہ بناؤں گا..... مگر وہ لڑکی.....!“

دونوں پر پابندی ضرور عائد کر دی تھی کہ وہ اسکی اجازت کے بغیر رام گڈھ نہیں چھوڑ سکیں۔
 اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ آئندہ حالات پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر منحصر ہیں۔ اس
 بعد ہی وہ فیصلہ کر سکے گا کہ وہ دونوں کس پوزیشن میں ہیں۔

تقریباً آٹھ بجے رات کو پولیس والے ہیراڈائیز سے رخصت ہوئے۔

فریدی حمید کے کمرے میں موجود تھا اور اسے اس طرح گھور رہا تھا جیسے وہ کوئی عجیب
 پھر اُس نے جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور اُسے حمید کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔
 ”شیشی تمہاری ہے؟“

حمید اُسے ہاتھ میں لیکر دیکھتا رہا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی سیال تھا۔ شیشی نیلے رنگ کی

”نہیں.....!“ اس نے فریدی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لیکن یہ مجھے اسی کمرے میں ملی تھی۔ اسی کرسی کے نیچے۔“ فریدی نے ایک کر

طرف اشارہ کیا۔

حمید کسی سوچ میں پڑ گیا اور فریدی پھر بولا۔ ”لیکن تلاشی کے قبل ہی یہ میرے قبے

آچکی تھی۔“

حمید نے پھر اس کرسی کی طرف دیکھا۔ ڈالی اسی کرسی پر کافی دیر تک بیٹھی رہی تھی۔

”آخر یہ ہے کیا بلا.....؟“

”یہ سوچو کہ جب یہ تمہاری نہیں ہے تو اس کمرے میں کیسے آئی۔“

”آپ کے جانے کے بعد یہاں ایک لڑکی آئی تھی۔“ حمید پچکا پھٹ کے ساتھ بولا

”کون لڑکی.....؟“ فریدی غریبا۔

”ایک یوریشین..... ڈالی..... اس کا باپ ہارجام کی نیشنل آرژن فیکٹری کا منیجر ہے۔“

”نیشنل آرژن فیکٹری۔“ فریدی بڑبڑایا۔ پھر غصیلی آواز میں بولا۔ ”کہیں تم گ

نہیں کھا گئے۔“

”گھاس نصیب ہو جاتی تو میں خدا کا شکر بجالاتا۔ شام کی چائے تو ان گدھوں کی نذر

”کیا اب اور کوئی بھی ہے۔“ فریدی جھلا گیا۔

”وہ لڑکی جس کے لئے جھگڑا ہوا تھا۔“

”وہ تو اس یوریشین سے بھی زیادہ پراسرار معلوم ہوتی ہے۔ تمہارے لئے کال آ۔ بعد میں اسی کو چیک کرنے گیا تھا لیکن وہ اپنے کمرے میں موجود تھی۔“

اچانک کسی نے دروازے کو دھکا دیا اور وہ دونوں چونک پڑے۔ دروازہ اندر تھا۔ حمید نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

ڈالی سامنے کھڑی تھی۔ حمید پیچھے ہٹ آیا۔ وہ فریدی کو دیکھ کر ہنسی مگر پھر اندر آ گئی ”اچھا بھئی! میں تو اب چلا۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔

”اوہ..... کیا میں غل ہوئی ہوں۔“ ڈالی نے حمید سے پوچھا۔

”قطعی نہیں.....!“ فریدی مسکرایا۔ ”آپ تشریف رکھئے۔“

”یہ میرے ساتھی مسٹر سلیم ہیں۔“ حمید نے دونوں کا تعارف کرایا۔ ”اور آپ م پرکس ہیں۔“

”بڑی خوشی ہوئی۔“ فریدی قدرے جھک کر بولا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ تفریح گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس ٹریجڈی کے باوجود بھی پیراڈائیز کی رونق؛ فرق نہیں آیا تھا۔ تفریح گاہ حسب معمول قہقہوں سے گونج رہی تھی اور لاؤڈ اسپیکر پر اشتہر نشر ہو رہے تھے۔

فریدی اس میز پر جا بیٹھا جو حمید کے لئے مخصوص تھی۔ وہ دراصل زوییا کی تلاش میں دفعتاً اسے آٹھ بیماروں کی کرسیاں نظر آئیں جنہیں آٹھ آدمی دھکیلے ہوئے رقص لائے تھے۔ ان پر تین عورتیں اور پانچ مرد غلط حال پڑے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سالہا سال سے بیمار ہوں۔

ٹھیک اسی وقت لاؤڈ اسپیکر کے ہارن سے آواز آئی۔ ”یہ دیکھئے یہ آٹھ نیم مردہ ہیں۔ یہاں قیام کرنے والوں میں کچھ ڈاکٹر بھی ہوں گے۔ اگر وہ چاہیں تو ان کا طبی

رکے خود کو مطمئن کر سکتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس حالت کو پہنچے ہوئے لوگ چار قدم بھی میں چل سکتے لیکن یہ لوگ ایک ایک گلاس پٹرول پی کر آندھیوں کے منہ بھی موڑ دیں گے۔ کیا اکثر صاحبان براہ کرم تھوڑی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔

لوگ چاروں طرف سے اٹھنے لگے تھے۔ فریدی بھی اٹھا اور ان آٹھوں المویلڈ چیئرز پر گرد پینکڑوں آدمی نظر آرہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر سے پھر آواز آئی۔ ”براہ کرم اب اپنی میز پر ریف لے جائیے۔ انہیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی چلے۔“ صرف وہ ڈاکٹر صاحبان بٹھریں جو ان کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔“

بھیڑ ہٹنے میں بھی تقریباً پندرہ منٹ صرف ہو گئے۔ فریدی نے انہیں دیکھا۔ وہ سچ سچ ت زیادہ لاغر نظر آرہے تھے۔ عورتیں کم عمر بھی تھیں اور حسین بھی لیکن ضعف نے ان کی ساری ٹی جھین لی تھی اور وہ مردوں سے بھی بدتر نظر آ رہی تھیں۔

اب ان کی کرسیوں کے پاس چھ آدمی نظر آرہے تھے اور یہ لازمی طور پر ڈاکٹر تھے۔ وہ بس دیکھتے رہے اور پھر جیسے ہی وہ اپنی میزوں کی طرف مڑے تو لاؤڈ اسپیکر سے آواز آئی۔ کیا آپ حضرات مائیک پر تشریف لانے کی زحمت گوارا کریں گے تاکہ دوسرے لوگ بھی سامنے کے نتائج سے آگاہ ہو سکیں۔“

وہ لوگ جہاں تھے وہیں رک کر کچھ مشورہ کرنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک آدمی اس ریف چلا گیا جہاں مائیک تھا اور بقیہ لوگ اپنی میزوں کی طرف چلے آئے۔

تھوڑی دیر بعد لاؤڈ اسپیکر سے آواز آئی۔ ”ہم چھ ڈاکٹروں نے ان لوگوں کو بغور دیکھا ہے۔ یہ مختلف قسم کی بیماریوں سے نجات پائے ہوئے لوگ ہیں لیکن ابھی اتنے کمزور ہیں کہ اپنے اپنے میزوں سے چل بھی نہ سکیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ آخر وہ رقص کس طرح کریں گے۔ بحال ان کے اعصاب کی جو حالت ہے اس کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ رقص کرنے کی کوشش نا انہیں موت کے منہ میں لے جاسکتی ہے۔ ان کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے۔ ہم انہیں اس حالت میں رقص کرنے کی اجازت کبھی نہ دیں گے۔“

ی تھیں۔ وہ ناچتے رہے۔ رقص لحو بہ لحو تیز ہوتا رہا۔ دوسری طرف سازندوں کا بُرا حال تھا۔ ان کے چہرے سینے سے بھیگ گئے تھی اور وہ نرمی طرح ہانپ رہے تھے۔ خصوصاً ان کی حالت اتنی تھی جو منہ سے پھونکے جانے والے ساز بجا رہے تھے۔ پیانٹ کو اپنی انگلیاں ٹوٹی لی معلوم ہو رہی تھیں۔ وایلنٹ کے بازو شل ہو گئے تھے۔ رقص ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے بلکہ انہیں رقصوں کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔ بیس منٹ گزرنے کے بعد ایک سازندہ اپنی ری پینک کر کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔ پیانٹ نے ہاتھ روک لئے لیکن رقصوں کے پیر نہ تھے۔ اب وہ ایک رفتار پر جم گئے تھے۔ مگر یہ رفتار بھی شاید عام رقصوں کے بس کی نہیں تھی۔

آدھے گھنٹے تک رقص ہوتا رہا اور پھر اچانک رقصوں کے پیر رک گئے۔ آرکسٹرا بھی بوٹ ہو گیا۔ وہ ایک قطار میں کھڑے تھے اور ڈاکٹر ایک بار پھر ان کا معائنہ کر رہے تھے۔ ریڈی بھی ان میں شامل تھا۔ پتہ نہیں اُس بار اُس نے کیا رائے قائم کی تھی لیکن ڈاکٹروں کی رائے اسے بھی متفق ہونا پڑا کیونکہ ایک ڈاکٹر ہی کی حیثیت سے وہ ان رقصوں کے قریب بچ چکا تھا۔ ورنہ شاید صدیاں گزرتیں لیکن وہ ان کے قریب نہ جاسکتا۔ کیونکہ ہوٹل کا عملہ نام آدمیوں کو ان کے قریب جانے سے روک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد لاؤڈ سپیکر پھر چیخنے لگا۔ ”اب سنئے! ڈاکٹر کاظمی کیا فرماتے ہیں۔ ان حضرات نے رقص سے قبل بھی رقصوں کا طبی معائنہ کیا۔ اس وقت انکی رائے تھی کہ یہ لوگ اپنی جگہوں سے ہلنے کے قابل بھی نہیں ہیں لیکن اب سنئے ڈاکٹر صاحبان کیا فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر کاظمی جو کچھ بھی فرمائیں گے وہ بقیہ ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہوگا۔“ لاؤڈ سپیکر خاموش ہو گیا۔ رقص رقص گاہ سے جا چکے تھے لیکن ان کی انویلیڈ چیئرز وہیں خالی پڑی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنے پیروں سے چل کر گئے تھے۔

لاؤڈ سپیکر سے پھر آواز آئی۔ ”حضرات میں ڈاکٹر کاظمی آپ سے مخاطب ہوں۔ میں عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ بیسویں صدی میں بھی معجزات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ اب اگر کوئی دنیا کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی ان رقصوں میں ایک فیصد بھی نقاہت بھی ثابت کر دے تو میں زندگی بھر کی لئے خط غلامی رکھ دوں گا۔ یقیناً یہ اسی مشروب کا اثر معلوم ہوتا ہے جو رقص

ڈاکٹر کے بعد پھر معلن کی آواز آئی جو کہہ رہا تھا ”ڈاکٹر ز کا متفقہ فیصلہ ہے کہ رقص کرنے کے قابل نہیں ہیں اور یہ فیصلہ ان ڈاکٹروں کا ہے جو ملک کے بہترین دماغ کے جاچکے ہیں۔ اب آپ دیکھئے گا کہ وہ کس طرح رقص کرتے ہیں۔“ معلن کے آخری الفاظ رقص گاہ کے سکوت میں گم ہو گئے۔

دفعتاً ایک طرف سے ایک ٹرائی نمودار ہوئی جس پر ارغونی رنگ کے کسی مشروب کے گلاس رکھے ہوئے تھے اور ایک بار پھر لاؤڈ سپیکر گر جنے لگا۔ ”یہ دیکھئے..... ان بے جان مشینوں کا پٹرول آ گیا۔“

ٹرائی انویلیڈ چیئر کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نیم مردہ رقصوں کے ہونٹوں سے گلا دیئے گئے۔ شاید وہ اسے ہاتھوں سے گلاس پکڑنے کی بھی سکت نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے چشمہ ان میں گلاس خالی کر دیئے۔ فریدی بہت توجہ اور دلچسپی سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر آرکسٹرا موسیقی بکھیرنے لگا اور رقص گاہ میں چاروں طرف سے فوکس لائٹ لگی۔ پندرہ منٹ گزر گئے پھر جیسے موسیقی کلائمکس پر پہنچی ایک عورت انویلیڈ چیئر سے چھلانگ کر فرش پر آ گئی اور گھنگھر وں کی جھنکار دوں تک پھیلتی چلی گئی۔

پھر گھنگھر وں کی جھنکاروں کا طوفان آ گیا کیونکہ وہ سب پہلے دار کرسیوں سے کودتے اور حیرت انگیز رقص شروع ہو چکا تھا۔ جس کیلئے پچھلی رات سے اعلان ہوتے آ رہے فریدی نے ان ڈاکٹروں کو رقصوں کی طرف جاتے دیکھا جو کچھ دیر پہلے ان معائنہ کر چکے تھے۔ وہ بھی اٹھا۔ وہ ان رقصوں کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔

”کیا آپ بھی ڈاکٹر ہیں۔“ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”ہاں..... پہلے میں اسے مذاق سمجھا تھا۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

رقص سچ سچ طوفانی رقص کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ فریدی نے انہیں قریب سے دیکھا۔ اب ان کے چہروں پر اضطحال کی بجائے صحت مند سرخی تھی اور آنکھیں حیرت انگیز طور پر

سے پہلے ان لوگوں نے پیا تھا۔

کچھ دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر معلن کی آواز آئی۔ ”آپ نے غور فرمایا؟“
مردہ جسموں میں زندگی کی لہر کیسے دوڑ سکی۔ کیا یہ واقعی کوئی معجزہ تھا۔ مگر نہیں یہ معجزات کا
نہیں ہے بلکہ سائنسی دور ہے۔ جب بے جان مشینیں حرکت کر سکتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ
کو بنانے والا نقاہت کا شکار ہو کر چارپائی سے لگ جائے۔ اگر مشینوں کو پٹرول حرکت
لا سکتا ہے تو آدمی ایسی چیزیں بھی دریافت کر سکتا ہے جو مردہ جسموں کو حرکت میں لائے
مشروب جسے یہ رقص اپنا پٹرول کہتے ہیں دراصل اسی قسم کی ایک دریافت ہے اور اس در
کا سہرا ڈاکٹر اسفندیار کے سر ہے کون ایسا ہے جو اس پر اسرار ڈاکٹر کے نام سے واقف ہو
عظیم انسان نے عوام کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر بھی انسانیت کی کتنی خدمت کی ہے
اندازہ ہر ایک کو ہے، نہ جانے کتنی لاعلاج بیماریوں کا علاج اس عظیم آدمی نے اب تک در
کیا ہے۔ کیا ہم میں سے کوئی بھی اس سے انکار کر سکتا ہے۔ یہ مشروب اب تجرباتی دور۔
چکا ہے۔ عنقریب اسے آپ انرجین کے نام سے ہر دو فروش سے خرید سکیں گے۔“

”لا حول والافوتہ۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”تو یہ اشتہار تھا۔“

اکثر جگہوں سے قہقہے بلند ہوئے اور ایک طرف سے آواز آئی۔ ”اعلان کرنے والا
ٹانگ پکڑ کر یہاں کھینچ لاؤ۔“

اس طرح کے بہترے جملے سنے جاتے رہے اور پھر کچھ دیر بعد رمبا کے لئے
شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے حمید کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا لیکن اب وہ اسی لڑکی کے
اپنی میز کی طرف آتا دکھائی دیا جسے فریدی اس کے کمرے میں چھوڑ کر آیا تھا۔

فریدی بیٹھا رہا اور وہ دونوں بھی اسی میز پر آ گئے۔

”کل میں اس رقص کے اعلان کو اپریل فول سمجھا تھا۔“ حمید نے کہا۔

”میں اب بھی اسے اپریل فول ہی سمجھتا ہوں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”اف فوہ۔“ ڈالی ہنس پڑی۔ ”اشتہار بازی کا بالکس نیا اور نفسیاتی طریقہ اس انر

کون بھلا سکے گا۔ لوگ اس کے مارکٹ میں آتے آتے صبر کا دامن چھوڑ بیٹھیں گے۔“

”اس میں تو شک نہیں۔“ فریدی سر ہلا کر بولا۔ لیکن وہ ڈالی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

رقص شروع ہونے والا تھا لوگ اٹھ اٹھ کر پختہ فرش کی طرف جا رہے تھے۔

حمید اور ڈالی بھی اٹھے۔ فریدی وہیں بیٹھا رہا۔ اسے اب بھی زویا کی تلاش تھی مگر وہ
ابیں نظر نہ آئی۔

دفتر اس کی نظر اس آدمی پر پڑی جو ڈاکٹر کاظمی کے نام سے مائیکروفون پر رقصوں کے
خلق اپنی رائے ظاہر کرتا رہا تھا۔ فریدی یہ دیکھ کر اٹھا کہ ڈاکٹر کاظمی اپنی میز پر تنہا ہے۔

”اوہ..... تشریف رکھئے۔“ ڈاکٹر کاظمی نے جھپٹی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”آپ بھی تو
باید ہم لوگوں میں سے تھے۔“

”جی ہاں..... مجھے بھی یہ شرف حاصل ہوا تھا۔“ فریدی مسکرایا۔

”مجھے اپنی حماقت پر غصہ آ رہا ہے۔“ ڈاکٹر کاظمی نے کہا۔

”کیسی حماقت.....؟“

”ارے یہی! مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کسی قسم کا اشتہار ہوگا۔“

”لیکن ہماری رپورٹ غلط تو نہیں تھی۔“

”قطعاً نہیں..... وہ لوگ حیرت انگیز طور پر کمزور تھے۔ حیرت انگیز اس لئے کہہ رہا ہوں

کہ نقاہت کی اس اسٹیج پر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”کیا وہ ڈاکٹر کبھی منظر عام پر نہیں آیا۔“

”نہیں..... اور نہ ہی معلوم کیا جا سکا ہے کہ وہ رہتا کہاں ہے۔ مگر یہ بھی ایک نئی چیز

ہے۔ کم از کم اسفندیار سے اس کی توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ اپنی کسی ایجاد کو شہرت دینے کے لئے

کوئی ایسا گھٹیا طریقہ اختیار کرے گا۔“

”اسے آپ گھٹیا تو نہیں کہہ سکتے۔“ فریدی بولا۔ ”بڑی ذہانت سے یہ سب کچھ کیا گیا

تھا۔ میرا خیال ہے اگر صرف مائیکروفون پر کسی دوا کے خواص گنوائے جاتے تو شاید کوئی اس پر

بہنسی دور کی جہالت کا شکار ہونے والے ہو۔ ناچو..... ناچتے رہو..... ناچو..... ناچو.....! ”
 ساز چیتے چیتے تھک گئے۔ ایک پل کے لئے چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا اور اس کے
 مدھم مدھم قہقہے اور قہقاریاں..... ناچنے والے اپنی میزوں کی طرف واپس جا رہے تھے۔

”اچھا ڈاکٹر.....!“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔

”اوہ ہو۔“ ڈاکٹر کاظمی نے چونک کر کہا۔ ”شب بخیر..... جناب۔“

فریدی رقص گاہ سے نکل کر ڈاننگ ہال کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ زویا کے متعلق سوچ رہا تھا۔
 ڈاننگ ہال میں بھی وہ نہیں دکھائی دی۔ اب وہ اسکے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہ اوپری
 نزل پر تھا۔ لیکن دفعتاً وہ زینوں پر ہی نظر آگئی لیکن وہ فریدی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ فریدی
 الے پاؤں واپس مڑا اور نیچے پہنچ کر بائیں جانب والے نیم تاریک گوشے میں چلا گیا۔
 زویا اس سے بے خبر نیچے آئی اور صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے باہر نکل
 جانے پر فریدی بھی آگے بڑھا۔

اب وہ دلالان میں چل رہی تھی لیکن اس کا رخ نہ تو رقص گاہ کی طرف تھا اور نہ ڈاننگ
 ہال کی جانب بلکہ وہ اس حصے کی طرف جا رہی تھی جہاں مقامی گاہک اپنی کاریں پارک کیا
 کرتے تھے۔ فریدی کرائٹ کی باڑھ کی اوٹ سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ آج کے حادثے کے
 سلسلے میں اسے اس لڑکی کی پوزیشن بہت ہی اہم معلوم ہوئی تھی۔ وہی آدمی آج مار ڈالا گیا جو
 پچھلے رات اسی لڑکی کے لئے حمید سے لڑ گیا تھا اور خود فریدی نے پہلے بھی کئی بار یہ بات محسوس
 کی تھی کہ وہ آدمی اس سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھتا ہے۔

اندھیرا

وہ کاروں کے قریب رک گئی۔ دفعتاً ایک طرف سے ایک تاریک سایہ اس کی طرف بڑھا

دھیان دینے کی بھی زحمت گوارا نہ کرتا..... مگر اب..... کیا یہاں بیٹھا ہوا کوئی آدمی کبھی
 کو فرموش کر سکے گا۔

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر کاظمی سر ہلا کر بولا۔

”مگر ڈاکٹر..... یہ تو سوچنے کے لوگ کتنے عرصہ سے اس کی پیلٹی کرتے رہے
 گئے۔ لیکن ان کی نقاہت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اب بھی اس مشروب کے رین منت
 ”ہاں یہ چیز غور طلب ہے۔“ ڈاکٹر کاظمی نے تشویش کن لہجے میں کہا۔

موسیقی کی لہریں فضا میں منتشر ہوتی رہیں۔ رہا کا دور چلتا رہا۔ قطعی یہ نہیں معلوم
 کہ آج یہاں کوئی آدمی کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ سب یا تو پاگل تھے یا چوپائے۔
 ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے ہرنوں کے کسی جھنڈ پر کسی شکاری نے فار کیا ہو۔ ایک گرا اور
 بھاگ نکلے۔ پھر جہاں ان کے پیر تھے وہیں دوبارہ چرنا چگنا شروع کر دیا۔ اپنے نقصان
 بے نیاز..... بے پرواہ۔

ساز چیخ رہے تھے۔ پیر متحرک تھے بھدے اور بے ڈول پیر۔ سبک اور مڈول پنڈا
 لیکن وہ شاید جسم ہی جسم تھے۔ مشینوں کی طرح متحرک جسم لیکن..... دفعتاً ایسا معلوم ہوا
 ساز نے ”لیکن“ کہا ہو اور پھر دوسرے سازوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ ”میسوی صدی
 ناچو..... ناچتے رہو..... ایک آدمی کی موت پر مغموم ہو کر کیا کرو گے۔ ہو سکتا ہے کل
 بھی جانوروں کی طرح مر جاؤ۔ ہائیڈروجن بموں کے تجربات سے پھیلنے والی دوائیں تمہیں
 کر جائیں۔ تم سب ایک ایسی کشتی میں سوار ہو جو ڈوبنے والی ہے۔ پھر کسی دوسرے کے
 سوچ کر کیا کرو گے۔ اپنی اپنی فکر کرو۔ تم مستقبل سے مایوس ہو، اس لئے تمہاری نظروں
 چیز کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی۔ تم سب اس بہت بڑے دھماکے کے منتظر ہو جس سے
 کر کہیں نہ جاسکو گے..... ناچو..... ناچتے رہو..... کل زمین کے چیتھڑے اڑ جائیں گے
 پانی کے چشموں سے زہر ابلے گا..... ناچو..... مستقبل سے بے پرواہ ہو کر ناچو کیونکہ مستقبل
 ایک دھماکہ ہے جس کی پشت پر دنیا کی بہترین عقلیں ہوں گی مگر وہ خود عقل سے بے نیاز

اور دیکھتے ہی دیکھتے دو تین اور سائے تاروں بھرے آسان کے پیش منظر میں دکھائی دیے
”یہ کیا حرکت..... پیچھے ہٹو۔“ فریدی نے لڑکی کی آواز سنی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک کار میں دھکیل دیا گیا پھر جب تک فریدی
پہنچتا کار حرکت میں آگئی۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہ رہ گیا تھا کہ وہ اس
پہرے پر فائر کر کے اسے بیکار کر دیتا۔

مگر اس کی جیب میں ریوالور تھا کہاں۔ اس نے چاروں طرف دیکھا ایک جگہ اُ
موٹر سائیکل نظر آئی وہ اسی کو لے دوڑا۔ شاید کار والے بھی آگاہ ہو گئے تھے کہ ان کا تقا
جا رہا ہے، اس لئے انہوں نے عقبی روشنی گل کر دی تھی۔

اس وقت فریدی کے پاس ریوالور بھی نہیں تھا لیکن وہ بہر حال فریدی تھا اس
سب سے زیادہ چالاک اور دانش مند آدمی..... اگر اس کے پاس ریوالور ہوتا بھی تو وہ
کھیل کو اسی اسٹیج پر ختم کر دینے کی کوشش کرتا۔

موٹر سائیکل کار کا تعاقب کرتی رہی۔ ایک جگہ فریدی نے راستہ کاٹا۔ اُسے یقین
اس سڑک کے علاوہ اور کسی راستے پر کار نہ موڑ سکیں گے۔ رام گڈھ اور اس کے نواحی،
چپے چپے فریدی کا دیکھا ہوا تھا۔

موٹر سائیکل سڑک سے اتار کر ایک تنگ راستے پر دوڑاتا رہا۔ اس خطرناک را
سائیکل چلانا بھی اسی کا کام تھا اور پھر جب اس نے اُسے بائیں جانب والی چڑھائی
بالکل ایسا ہی معلوم ہوا جیسے اس نے موٹر سائیکل سمیت جست لگائی ہو۔

ایک بہت بڑی چٹان لڑھکتی ہوئی خثیب میں جا رہی تھی۔ یہی چٹان اس کی موت
بھی بن سکتی تھی۔ لیکن یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اس کے ستارے بھی اسی کی طرح حیرت انگ
چٹان اس وقت اپنی جگہ سے کھسکی تھی جب موٹر سائیکل کا پچھلا پیہر اس پر سے گذر چکا
ورنہ چشم زدن میں وہ خود بھی اسی چٹان کی طرح لڑھکتا ہوا سینکڑوں فٹ نیچے جا گرا ہوتا
مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو نہ تو اس کے سکون میں فرد

سائیکل کی رفتار ہی میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی۔
پھر ذرا ہی دیر بعد وہ پھر اس سڑک پر تھا اور کار شاید بہت پیچھے رہ گئی۔ اُس نے ادھر ہی
سائیکل موڑ دی جدھر سے کار آنے والی تھی۔

موٹر سائیکل کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی رہی اور پھر اسے تاریک خلاء میں کار کی ہیڈ
لٹ کی آڑی ترچھی نکیسریں نظر آئیں۔ کار ابھی خثیب میں تھی۔

پھر وہ سامنے آگئی۔ فریدی کی موٹر سائیکل سڑک پر چلتی رہی۔ کار سے ہارن دیا گیا اور
کی رفتار بھی کم ہو گئی۔

”گھا تو کاپل ٹوٹ گیا ہے۔“ فریدی بھرائی ہوئی آواز میں چینا۔ ”آگے راستہ نہیں ہے۔“
کار رک گئی اور موٹر سائیکل بائیں جانب والے پائیدار سے جا لگی۔ فریدی نے حتی الامکان
ش کی تھی کہ اس کا چہرہ تاریکی ہی میں رہے۔

”پل ٹوٹ گیا۔“ کسی نے متحیرانہ انداز میں دہرایا۔

اتنی میں فریدی کا ہاتھ کار کے اندر پہنچ چکا تھا۔ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کے
سے عجیب سی آواز نکلی اور کسی نے کہا۔ ”کیا بات ہے۔“

لیکن شاید جواب کے لئے اُسے کم از کم دو گھنٹے تک منتظر رہنا پڑتا۔ فریدی بیہوش
بانے والے آدمی کی جیب سے ریوالور نکال چکا تھا۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ سے ٹارچ نکال
روشنی کی اور ریوالور کا رخ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف کر دیا۔

وہ دو تھے۔ درمیان میں زویا بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کے منہ پر چڑے کا تمسہ چڑھا ہوا
اور وہ کسی بے بس پرندے کی طرح پلکیں جھپک رہی تھی۔

”اس کے منہ سے تمسہ ہٹاؤ۔“ فریدی نے تھکسانہ لہجے میں کہا۔

”تم کون ہو؟“ ایک آدمی اُسے گھورتا ہوا بولا۔

”جو کہا جا رہا ہے کرو۔“ فریدی کا لہجہ بہت سرد تھا۔ اُن لوگوں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا
جوانم رنگ پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔

”کیا تم نے اُسے مار ڈالا.....؟“ ایک نے خوفزدہ سی آواز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے وہ مر ہی گیا ہو۔ تم سے جو کہا جا رہا ہے کرو، ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہو سکتا۔“
دفعۃً ایک آدمی نے زیورالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ فریدی نے اس کی ناک پر نارچ رہا اور وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

دوسرے نے بڑی پھرتی سے زویا کے منہ پر سے چمڑے کا تسمہ ہٹانا شروع کر دیا۔
”اب تم نیچے اتر آؤ لڑکی۔“ فریدی نے اُسے مخاطب کیا۔

وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں فریا اس کی چیخ بھی سنی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے چیخ کر پوچھا لیکن جواب نہ دار۔ فریدی موٹر سائیکل گیا اور وہ سڑک پر جا گری۔ لیکن وہ اس کی پرواہ کئے بغیر دوسری طرف جھپٹا۔

پھر اچانک وہ دونوں آدمی اس پر ٹوٹ پڑے۔ زیورالور فریدی کے ہاتھ سے گر گیا۔ کشمکش کا فیصلہ ہونے میں دیر نہیں لگی۔ وہ دونوں بھی جلد ہی اپنے تیسرے ساتھی کی طرح وحشت نظر آنے لگے۔ فریدی انہیں سڑک پر ہی چھوڑ کر نارچ اور زیورالور تلاش کرنے لگا۔ لڑکی کا اس طرح چشم زدن میں غائب ہو جانا انتہائی حیرت انگیز تھا۔ کچھ دیر بعد ا کی روشنی کا دائرہ ادھر ادھر رہنے لگا۔

دفعۃً بائیں جانب والے نشیب میں اُسے ایک زمانہ سینڈل نظر آیا اور وہ نیچے اتر گیا۔ اس خیال نے اُسے مضطرب کر دیا کہ کہیں وہ نیچے نہ گر گئی ہو۔ ایسی صورت میں ہڈیاں بھی سلامت نہ رہتیں۔ یہ ڈھلان کچھ ایسی ہی تھی کہ ذرا سی لغزش آدمی کو موت یا جڑوں میں دھکیل سکتی تھی۔ وہ ڈھلان کے اختتام پر پہنچ کر رکا۔ لیکن زویا اُسے کہیں نظر نہ آئی وہ چاروں طرف نارچ کی روشنی ڈال رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو کر کسی نکل تو نہیں گئی مگر اس نشیب پر دوڑنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ پھر اس جگہ لوٹ آیا جہاں پڑا دیکھا تھا۔ وہ جھک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اس کا تسمہ باقاعدہ طور پر بکل میں پھنسا ہوا تھا۔

بندل کا تسمہ اتنا ڈھیلا کبھی نہیں رکھا جاتا کہ وہ پیر سے نکل جائے۔

تو پھر اُسے کچھ لوگ دوبارہ اٹھالے گئے ہیں؟ فریدی کے ذہن نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ لیکن اگر یہ حقیقت ہی تھی تو اب ان چٹانوں میں بھٹکتے پھرنا ایک فضول سا فعل ہوتا۔ اس نے سوچا کہ دوسری بار انخواء کرنیوالے بہت زیادہ محتاط ہو گئے ہوں گے۔ یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود بھی وہ کچھ دور تک بڑھتا چلا گیا۔ نارچ کی روشنی ادھر ادھر پکراتی پھر رہی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد اُس نے سوچا کہ اس طرح بھٹکنے سے کوئی فائدہ نہ گا۔ بہتر یہ ہے کہ اُن تینوں آدمیوں کو ہوش میں لا کر ان سے پوچھ گچھ کی جائے۔

پھر وہ سڑک کی طرف مڑا لیکن ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ موٹر سائیکل انارٹ ہونے کی آواز آئی..... وہ دوڑنے لگا۔ لیکن سڑک پر پہنچنے کے بعد اُسے ایک جھٹکے کے ساتھ رک جانا پڑا کیونکہ اب نہ تو وہاں موٹر سائیکل تھی اور نہ وہ کار۔ تینوں بیہوش آدمی بھی غائب تھے۔

فریدی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں آئیں گے۔ پیراڈائیز یہاں سے تقریباً سات میل دور تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر پیراڈائیز کی طرف چل پڑا۔ پیدل چلنا اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر تیس اور چالیس میل تک پیدل چل چکا تھا۔ بہر حال اس کا موڈ اس خیال سے خراب نہیں ہوا تھا کہ اسے پیدل واپس جانا پڑے گا بلکہ موڈ کی خرابی کی وجہ دراصل مہتر سائیکل کی گمشدگی تھی۔ یہ نہیں وہ کس بیچارے کی رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ بھی کسی دوسرے سے عارنا لایا ہو۔

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں نے گھاتو کا پل ٹوٹ جانے کی اطلاع کافی تشویش سے سنی تھی۔ لہذا انہیں گھاتو کے پل سے آگے ہی جانا رہا ہوگا۔ گھاتو کا پل یہاں سے فزیدہ میل دور تھا اور پھر اس سے ایک میل آگے چل کر شاہ پور کی چھاؤنی تھی۔ یہاں کنی فوجی آفیسر اُس کے شناسا تھے۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہاں چل کر تفتیش جاری رکھی جائے۔

ایسی جگہ مل گئی۔

یہ ایک کافی کشادہ دروازہ تھی اور اس پر ایک چٹان اس طرح جھکی ہوئی تھی جیسے وہ کوئی بیان ہو۔

فریدی نے ٹارچ کی روشنی میں اس کا مختصر سا جائزہ لیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ بارشوں میں چٹھانوں پر پھر رہی تھی۔ کبھی کبھی بادلوں کی گرج زلزلہ سا ڈال دیتی۔
دفعتاً فریدی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس درے میں داخل ہوا ہو۔ پھر اس نے پتھر پلے بن پر پڑنے والے بھاری قدموں کی آواز بھی سنی۔ وہ پیچھے ہٹا مگر بے سود کیونکہ آنے والے ٹارچ روشن کر لی تھی۔

”کیا کرتے ہو۔“ فریدی غرایا۔ ”آنکھوں پر روشنی نہ ڈالو۔“

”تم کون ہو؟“ آنے والے نے پوچھا۔

”انہائی احقانہ سوال ہے۔ میں کیوں بتانے لگا کہ میں کون ہوں۔“

”اتنی رات گئے یہاں کیوں؟“ آنے والے نے میساختہ پوچھا۔

”تمہارا دماغ تو نہیں الٹ گیا۔ تم پوچھنے والے کون ہو۔ کیا میں تمہارے گھر میں گھس آیا ہوں۔“

”اے..... ڈھنگ سے جواب دو جو کچھ پوچھا جائے۔“ آنے والے نے تیز آواز سے کہا۔

”کیوں تم کون ہو؟“ فریدی کا لہجہ چیلنج کرنے کا سا تھا۔

”میں کوئی بھی ہوں..... تمہیں میرے سوال کا جواب دینا پڑے گا۔“

”اچھا.....!“ فریدی مسکرایا۔ ”کرو سوالات لیکن وہ دس سے زیادہ نہ ہوں۔ میں اُن

ماتے صرف پانچ منتخب سوالات کی جواب دوں گا۔“

”تم یوں نہیں مانو گے۔“ اس آدمی نے کہا اور ٹارچ روشن کر لی۔ فریدی کو اس کے داہنے آنکھ میں ریواور نظر آیا۔

اس نے پھر کہا۔ ”اب بتاؤ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں آدمی ہوں اس لئے بارش میں نہیں بھگنا چاہتا۔“ فریدی نے جواب دیا۔

وہ گھاتو کے پل کی طرف چل پڑا۔ اُس کے جوتے بے آواز تھے۔ وہ بڑی تیز رفتار سے کام لے رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے ذہن میں بہترے سوال تھے۔

اتنا تو وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ زویا مرنے والے سے ناواقف نہیں تھی کیونکہ مرنے والا اُس کے لئے ایک بار حمید سے جھگڑا کر چکا تھا پھر حمید کو اس کیس میں الجھانے کی کوشش کی گئی کہ نامعلوم عورت کی کال اور وہ شیشی جو حمید کی نہیں تھی لیکن اس کمرے میں پائی گئی تھی۔ پھر لڑکی کا قصہ..... کیا وہی لوگ تھے جنہوں نے اس آدمی کو ختم کر دیا تھا۔ ممکن ہے..... وہی ہو اور انہوں نے یہ حرکت اس لئے کی ہو کہ پولیس ایک اچھے گواہ سے محروم ہو جائے۔

اب تک صد ہا ایسے کیس اس کی نظروں سے گزرے تھے جن میں مجرموں نے گواہوں یا تو مار ڈالنے کی کوشش کی تھی یا ان کا انکوار کر لیا تھا۔

فریدی چلتا رہا۔ اب زمین تاروں کی چھاؤں سے محروم ہو گئی تھی۔ کیونکہ کچھ دیر مغربی افق سے بادلوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُبھر کر چاروں طرف پھیلنے لگے تھے۔ ہوا میں زیادہ خنکی پیدا ہو گئی تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ بارش ضرور ہوگی۔

فریدی نے رفتار پہلے سے زیادہ تیز کر دی۔ وہ بارش ہونے سے قبل ہی شاہ پور کی چھاؤں میں پہنچ جانا چاہتا تھا اور پھر بارش ہو جانے پر گھاتو کا پل چُج چُج خطرناک ہو جانا فریدی جانتا تھا بعض اوقات پانی پل پر بھی بہنے لگتا تھا اور بہاؤ اتنا تیز ہوتا ہے کہ قدم جمانا دشوار ہو جاتا ہے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ اسے بار بار خلاء میں آنکھیں پھاڑنی پڑتی تھیں لیکن اس نے بار بھی ٹارچ نہیں روشن کی۔

اچانک دو چار بڑی بڑی بوندیں آئیں اور اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ اب وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ دوسرے جھوٹے کے ساتھ ہی بارش شروع ہو گئی اور اب اُسے کسی پناہ تلاش کے سلسلے میں ٹارچ روشن کرنی ہی پڑی۔

ایک بار پھر وہ بائیں جانب والی ڈھلان میں اتر رہا تھا وہ جانتا تھا کہ رام گڈ پہاڑیاں ایسے غاروں سے بھری پڑی ہیں جہاں وہ بارش سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اسے جا

”یہ ریوالور خالی نہیں ہے۔“ وہ آدمی غرایا۔

”یہ ریوالور ہے۔“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا۔

”آگ اگلنا بھی جانتا ہے۔“

”ذرا دیکھوں تو۔“ فریدی لہک کر بولا۔ ”میں نے آج تک ریوالور اپنے ہاتھ میں

کر نہیں دیکھا۔“

”بیچھے ہنو۔“ وہ آدمی دھاڑا۔

”یار..... کیوں خواہ مخواہ خفا ہوتے ہو۔ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ خواہ مخواہ جبر

ریوالور نکال کر مجھے دکھاؤ۔ اب اگر میں اپنے ہاتھ ہی میں لے کر دیکھ لوں گا تو اس میں کو

خرابی پیدا ہو جائے گی۔“

”اچھا تو میں فائر کرنے جا رہا ہوں۔“

”مگر جلدی واپس آ جانا۔ یہاں اکیلے دل گھبراتا ہے۔“ فریدی نے بڑی سادگی سے

اس نے سچ فائر کر دیا۔ گولی پتھر سے ٹکرا کر پٹی اور وہ خود بال بال بچا۔ لیکن دو

ہی لمحے ریوالور زمین پر تھا اور اس کا داہنا ہاتھ فریدی کی گرفت میں..... اور پھر وہ اس کے

ہی جھٹکے میں منہ کے بل زمین پر چلا آیا۔

”اب تمہیں میرے بیس سوالات کے جواب دینے پڑیں گے۔“ فریدی اس کی گر

پیر رکھتا ہوا بولا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ممکن نہ ہوا۔

”اب اسی طرح پڑے پڑے بتاؤ کہ تم کون ہو؟“

”مم..... میں..... سرکاری سرانرساں ہوں۔“ اس آدمی نے ہانپتے ہوئے غصیلی آواز میں

”تب تو میں تمہاری گردن توڑ ہی دوں گا۔“ فریدی اس کی گردن پر مزید دباؤ ڈا

بولا۔ ”تم میری ہی تلاش میں آئے ہو گے۔ لیکن میں پولیس والوں کو بخشتا نہیں جانتا۔“

”میں سرکاری سرانرساں نہیں ہوں۔“ وہ بوکھلا کر بولا۔

”میں لاکھ برس یقین نہیں کروں گا۔“ فریدی کا جواب تھا۔

”کیا تم دوسروں کی دولت میں حصہ لگانے والوں میں سے ہو۔“ اس آدمی نے پوچھا۔

”دوسروں کی دولت خود ہی میری منتظر رہتی ہے۔ تجوریاں میری آہٹ پر اپنے منہ کھول

تی ہیں۔“

”اوہو! تب تو مجھے چھوڑ دو۔ پیر ہٹاؤ نا..... میں بھی تمہارا ہی ہم پیشہ ہوں۔“

”میں کیسے یقین کر لوں..... اکثر سرانرساں ہماری صفوں پر گھس آتے ہیں اور ان کا

بہن کار بھی یہی ہوتا ہے جو تم نے اس وقت اختیار کیا ہے۔“

”نہیں دوست..... میں ثابت کر دوں گا کہ میں سرکاری سرانرساں نہیں ہوں۔“

فریدی نے اس کی گردن پر سے پیر ہٹالیا اور وہ بیٹھ کر اپنی گردن ملنے لگا۔ فریدی نارنج

باروشنی میں اُسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اُس نے سر اٹھا کر کہا۔ ”تم واقعی بہت

لہرے معلوم ہوتے ہو..... میں نے اتنا پھر تیرا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“

آگ

بارش کے پہلے ہی چھینٹوں نے رقص گاہ میں ابتری پھیلا دی تھی۔ پھر سنہلے سنہلے

وسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش اچانک ہوئی تھی۔ پہلے سے آثار نہیں تھے اور اگر آثار تھے

مٹی تو ایسے نہیں کہ رام گڈھ کے موسمی معمولات کے خلاف ہوتے۔ وہاں اکثر اسی طرح بادل

ٹھاکرتے تھے لیکن ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلکی ہلکی پھواروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

راڈوں میں شاید یہی پھواریں برف کے ذرات کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔

مگر اس وقت شاید فطرت بھی مذاق کے موڈ میں تھی۔ اب فطرت کے علاوہ اور کون اس

منکر سے لطف اندوز ہوتا..... لوگ بدحواسی میں ایک دوسرے پر گر رہے تھے اور سریلی چینیں

اس نے جھلاٹ میں فیجر کوفون کیا لیکن وہ آفس میں موجود نہیں تھا۔ کسی کلرک نے ریسیور کے بتایا کہ ایک کمرے میں چوری ہوگئی ہے۔ فیجر وہیں ہے۔

”میرے کمرے میں بھی چوری ہوگئی ہے۔“ حمید غرایا۔ ”فیجر کوفور ابھیجی۔“

پھر اس نے اپنے کمرے کا نمبر بتایا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد ہی تین آدمی اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ہوٹل کے باغیچے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان میں فیجر نہیں تھا۔ وہ اس سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔

”نہیں کوئی چیز چرائی نہیں گئی۔“ حمید نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ ہوٹل کس قدر غیر محفوظ ہے۔“

”پتہ نہیں کیا بات ہے جناب۔“ ایک آدمی بولا۔ ”مس ڈالی بھی کہتی ہیں کہ ان کے رے سے کوئی چیز چرائی نہیں گئی۔ لیکن سامان اسی طرح بکھرا پڑا ہے۔“

”کون مس ڈالی۔“ حمید اسے گھورنے لگا۔

”ایک یوریشین ہیں۔“ اس نے جواب دیا اور کمرے کا جو نمبر بتایا وہ ڈالی ہی کے کمرے کا تھا۔

حمید سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ ”میں اس کی رپورٹ پولیس کو دینا چاہتا ہوں۔“

”میں فون کرنے جا رہا ہوں۔“ ایک آدمی نے کہا اور باہر چلا گیا۔

پھر تھوڑی دیر بعد فیجر بھی آ گیا۔ وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

”تکیہ اس کا بھی پھاڑ دیا گیا ہے۔“ وہ تشویش کن لہجے میں بڑبڑایا۔ حمید کی تیز نظریں

ماکے چہرے پر پڑیں، بالکل اسی انداز میں جیسی وہی بیچارہ اس کا ذمہ دار ہو۔

”جی ہاں۔“ وہ حمید کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”بالکل ایسا ہی ایک واقعہ اور بھی ہوا ہے۔ ایک

انہ کے کمرے کی بھی یہی حالت نظر آتی ہے اور ان کا تکیہ بھی اسی طرح پھاڑ ڈالا گیا ہے۔“

”مگر میں صاحب نہیں ہوں کہ صبر کر لوں گا۔“

”کیا کوئی چیز غائب بھی ہے؟“

”نہیں۔“ حمید گردن جھٹک کر بولا۔

”ان کے کمرے سے بھی کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔“

شاید بادلوں کو بھی گدگداری تھیں کیونکہ بارش کا زور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”ظہریئے! حواس قائم رکھئے۔“ لاؤڈ سپیکر چیخنے لگا۔ ”اس طرح آپ چوٹ بھی کھا سکتے ہیں

”خدا غارت کرے۔“ ڈالی گرتے گرتے سنبھل کر بولی۔ حمید نے اسے اپنے

ہاتھ پر روک لیا تھا۔ ورنہ وہ منہ کے بل گرتی۔

”ہائیں..... بارش ہی تو ہے۔“ حمید نے کہا۔

”میں بھیگ رہی ہوں۔“

”اور میں بالکل خشک ہوں۔ واقعی یہ بہت برا ظلم ہے۔“

”تم عجیب آدمی ہو، چلو بھاگو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی۔

”ہرگز نہیں۔ مجھ سے اتنی غیر منطقی حرکت نہیں سرزد ہو سکے گی۔ پانی سے بچنے کے

ہاتھ منہ توڑ بیٹھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔“

”تم احمق ہو۔“ ڈالی نے کہا اور دوڑنے لگی۔ لیکن اس دوڑ میں حمید نے اس کا ساتھ

دیا۔ وہ بہت اطمینان سے بھیگتا ہوا کمرے میں آیا لیکن یہاں کی حالت دیکھ کر وہ یہ بھی

گیا کہ اس کے جسم میں بھیکے ہوئے کپڑے ہیں۔

پولیس کی تلاشی کے بعد اس نے بڑی دشواری سے اپنی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں

اب وہ اس سے بھی زیادہ ردی حالت میں نظر آئیں۔ کسی نے اس کی عدم موجودگی میں،

کمرے کو تہہ بوبالا کر کے رکھ دیا تھا۔ بستر فرش پر پڑا تھا۔ تکیہ پھاڑ ڈالا گیا تھا۔ سوٹ کپڑے

طرف پڑا تھا اور کپڑے کچھ یہاں تھے کچھ وہاں۔

سفر میں وہ چیک بک اور نقدی ہمیشہ جیبوں میں رکھا کرتا تھا۔ ورنہ ہو سکتا تھا

وقت اسے اور زیادہ غصہ آتا۔

غصہ تو تھا مگر صرف فریدی پر۔ آخر اس نے پولیس والوں سے اپنی اصلیت چھ

کیوں تھی۔ ممکن ہے یہ حرکت کسی مقامی سراغ رساں کی رہی ہو۔ وہ دونوں خود بھی ہزار

اس قسم کی بے ضابطہ تلاشیاں لے چکے تھے۔

”کیا یہ یہاں قیام کرنے کا انعام ہے۔“

”کیا عرض کروں جناب۔ ایسی وارداتیں تو کبھی نہیں ہوئیں۔“

دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ حمید نے بڑھ کر ریسور اٹھایا مگر شاید فون منیجر کے لئے تھا۔

حمید نے ریسور اس کی طرف بڑھا دیا۔

دوسری طرف کی گفتگو شاید ایسی ہی پریشان کن تھی کہ منیجر کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔

نے ریسور رکھ کر بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا مصیبت آگئی ہے۔“

”کیوں.....؟“ حیدر جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”ایک کار اور ایک موٹر سائیکل غائب ہے۔ اس نے رومال سے چہرے کا پینہ

کرتے ہوئے کہا۔ ”اے! ہائیں تو یہاں کبھی نہیں ہوئیں۔ اچھا جناب! میں ابھی پولیس

کرتا ہوں۔“

منیجر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کلرک بھی رخصت ہو گئے۔

حمید آرام کرسی کے ہتھکے سے ٹکڑے لہجے میں تمباکو بھرنے لگا۔ آتے وقت اس

فریدی کا کمرہ مقفل دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کا کمرہ بھی اسی حالت میں ہوگا۔

دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ حمید نے ریسور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے ڈالی بول رہی تھی۔

”ہیلو..... پرویز۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے کمرے میں کسی نے ابتری پھیلائی۔“

”ٹھیک سنا ہے۔“ حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”کیا تمہیں علم ہے کہ میرے کمرے کی بھی یہی حالت ہوئی ہے؟“

”ہاں منیجر نے بتایا تھا۔“

”کتنی عجیب بات ہے۔“

”ہاں اتنی ہی عجیب جتنی کہ تار جام کی نیشل آرٹن فیکٹری۔“

”کیا مطلب.....؟“

”کچھ بھی نہیں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ تمہارے پاپا کو تحفے میں کیا بھیجوں۔“

”یہ کیسی اوٹ پناگ باتیں شروع کر دیں تم نے۔“

”کچھ نہیں..... تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے نا۔ تم آج مجھے اس کی اطلاع دینے آئی تھیں

پولیس مجھ پر شبہ کر رہی ہے، حالانکہ پولیس میری جیب میں پڑی رہتی ہے۔“

”کیا تم نے زیادہ مقدار میں پی لی ہے تمہارا لہجہ.....!“

”ہاں..... میرے لہجے پر بہتوں کو پیار آتا ہے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ اس نے جھلا کر کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

حمید پاپ سلگانے لگا۔ اب وہ پولیس کے آئے بغیر پلنگ پر بستر بھی نہیں ڈال سکتا تھا۔

”کیا مصیبت ہے۔“ وہ برا سمانہ بنا کر بڑبڑایا۔ ”جہاں جاؤ شامت ہی گھیرتی ہے۔“

وہ کبھی کمرے میں ٹھٹھا اور کبھی راہداری میں نکل آتا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ فریدی کا

راہی کھول کر دیکھا جائے۔ اس نے ہب سے کتنی اتاری اور کمرہ کھول کر اندر آیا۔ اس کا

ازہ غلط نہیں تھا۔ یہاں بھی ویسی ہی ابتری نظر آئی۔ کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں تھی اور اس

کے پھاڑ ڈالا گیا تھا۔

اس نے کمرہ دوبارہ مقفل کیا اور اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد

میں بھی آگئی۔ اس کے ساتھ مقامی سی آئی ڈی کا ایک انسپکٹر بھی تھا۔ اس نے فریدی اور حمید

لے کرے دیکھے۔ اس سے پہلے شاید وہ ڈالی کے کمرے کا بھی جائزہ لے چکا تھا۔

”کیا اس لڑکی سے آپ کی پرانی جان پہچان ہے۔“ اس نے حمید سے پوچھا۔

”نہیں..... ہم آج ہی ملے تھے۔“

”آج تین بجے کس عورت نے آپ کا شکریہ ادا کیا تھا؟“

”میں نہیں جانتا۔“

”کیا آپ کو اس سے انکار ہے کہ فون پر کسی عورت نے آپ کا شکریہ ادا کیا تھا۔“

”قطعاً نہیں..... لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھی لہذا میں نے آپ ریٹر سے اس کے متعلق

پہچان لینے کی تھی۔“

”میں ایک بار پھر آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ سوچ سمجھ کر گفتگو کیجئے۔“
 ”شکریہ! میں پہلے سے کافی محتاط ہوں۔“ حمید نے جواب دیا۔
 ”یہاں سے ایک کار اور ایک موٹر سائیکل بھی غائب ہو گئی ہے۔“
 ”اور میرا ساتھی بھی غائب ہے۔“ حمید مسکرایا۔

”آپ.....!“ وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر حمید کو کھانچا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر بولا۔ ”کیا آپ سچ اپنی بے عزتی کے خواہاں ہیں۔ آپ نے کچھلی رات پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی تھی کہ اُس نے آپ کا پرس اڑا لیا تھا۔“
 ”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ برباد کیا جاسکے۔“

”پھر ہم اسے باور کر لینے پر تیار نہیں ہیں کہ اس نے آپ کی جیب کاٹی تھی۔“
 ”آپ کی مرضی۔ نہ میں نے اس کی شکایت کی تھی اور نہ اب آپ کو اس کا یقین دلانا ہوتا ہوں۔ لیکن ذرا یہ تو فرمائیے کہ وہ بلاوجہ میرے ہاتھ سے پٹ گیا تھا تو خود اس نے ہی رے ظاف پولیس کو رپٹ کیوں نہیں دی اور جناب کیا آپ اس پر بھی روشنی ڈال سکیں گے لاس نے اپنی شاندار مونچھیں کیوں صاف کرادی تھیں؟“

”اسکا جواب بھی آپ ہی دے سکیں گے۔“ انسپٹر ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
 ”اچھا تو سنئے میرا جواب۔ اس نے حتی الامکان اپنی ایک ایسی امتیازی خصوصیت ختم کر دی تھی جس کی بناء پر لوگ اُسے پہچاننے میں تامل کرتے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک گرہ کٹ لی شہیت سے اس پر انگلیاں اٹھیں۔ کیا سمجھے۔“

”لیکن وہ اتنا ڈھیٹ تھا کہ یہاں سے ملنا بھی نہیں چاہتا تھا۔“ انسپٹر مسکرایا۔
 ”اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”مسٹر پرویز..... آپ دلدل میں پھنس چکے ہیں۔“

”اس اطلاع کی لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“

”بھگڑا ایک لڑکی کے لئے ہوا تھا۔“

”لاش کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی ہے۔“ اس نے حمید کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے حمید کچھ نہ بولا۔ انسپٹر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ سانپ سے ہلاک ہوا ہے۔“

”اوہ.....!“ حمید نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”تو وہ سانپ تھا بلخ کے بھیس جی نہیں۔“ انسپٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”زہر اس زخم کے راستے جسم میں پہنچا تھا۔ کے کانٹے سے ہوا تھا۔“
 ”اچھا..... اب میں سمجھا۔ یعنی اس زخم پر کسی سانپ نے بھی طبع آزمائی کی تھی بد نصیب تھا پتہ چارہ مرنے والا۔“

”جی ہاں! بد نصیب ہی تھا کیونکہ کچھلی رات آپ نے بھی تو طبع آزمائی فرمائی تھی۔“
 ”لیکن اس وقت میں بلخ کے بھیس میں نہیں تھا۔“
 ”ساری زبان طراریاں دھری رہ جائیں گی۔“ انسپٹر غصیلی آواز میں بولا۔ ”اگر یہ ہو گیا کہ آپ بھی اس کے قریب تھے جب بلخ نے حملہ کیا تھا.....!“
 ”یہ ثابت ہونے سے پہلے میں رام گڈھ نہیں چھوڑوں گا۔ آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے۔ انسپٹر اُس کی ترکی بہ ترکی پر بُری طرح جھلس رہا تھا۔ دفعتاً اس نے پوچھا۔ ”آپ ساتھی کہاں ہیں؟“

”وہ نابالغ نہیں ہے کہ ہر وقت ان کی آمد و رفت سے باخبر رہنا میرے لئے ضرور ہے۔“
 ”آپ آخر آدمیوں کی طرح گفتگو کیوں نہیں کرتے۔“
 ”کیا میں ابھی تک پرندوں کی طرح چہچہاتا رہا ہوں۔“ حمید نے بڑی سادگی سے!
 ”بہت جلدی معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ پھر موجود تھا۔

”آپ کے ساتھی کب سے غائب ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”مجھے علم نہیں۔ میں اس کی دم کے پیچھے نہیں لگا رہتا۔“

”اگر یہ ثابت ہو گیا تو آپ سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔“
 ”مجھے بھی کافی خوشی ہوگی اگر یہ ثابت ہو سکا۔“ حمید نے انگڑائی لے کر لاپرواہی سے کہا۔
 ی کے پھندے کا تجربہ بھی سہی۔“

سب انسپٹر جھلا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نیجر آندھی اور طوفان کی طرح کمرے میں داخل
 وہ دونوں چونک کر اسی کی طرف مڑے۔

”آگ.....!“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ”مرنے والے کے کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔“
 ”کیا.....؟“ انسپٹر غرایا۔

”جی ہاں..... آپ نے تلاشی کے بعد شاید ایک کھڑکی کھلی چھوڑ دی تھی۔“

بازیابی

فریدی کا شکار اب بھی زمین پر بیٹھا اپنی گردن ٹٹول رہا تھا اور فریدی اس طرح کھڑا تھا
 اس نے کسی شریر بچے کے دو چار چپتیں جھاڑ دی ہوں۔

”پولیس کیوں ہے تمہارے پیچھے۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میں نے چارٹرڈ بینک میں ڈاکر ڈالا تھا۔ اس وقت بھی میری جیسٹیں نوٹوں سے بھری
 ہیں۔“

”کوہو!“ اس آدمی نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن تمہیں اب تک کوئی محفوظ جگہ نہیں مل سکی۔“
 ”میرے لئے کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔“

”تم اگر پسند کرو میں تمہیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں۔“

”سلاخوں کے پیچھے۔ کیوں؟“ فریدی نے قہقہہ لگایا۔ پھر یک بیک سنجیدہ ہو کر بولا۔
 ”کراٹھ رساں اس سال یہ میرا پندرہواں قتل ہوگا۔“

حمید تکیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا لیکن اس کے ہونٹ بند ہی رہے۔ انسپٹر کہہ رہا تو
 ”جھگڑے کے وقت آپ دونوں وہاں تنہا ہی تھے۔“

”پھر.....؟“

”ایک آدمی نے آپ دونوں کی گفتگو بھی سنی تھی۔“

”تب تو آپ اس لڑکی سے مل ہی چکے ہوں گے جس کے لئے جھگڑا ہوا تھا۔“

”ہاں! میں اس سے مل چکا ہوں۔“ انسپٹر نے کہا۔ لیکن حمید کو اس پر یقین نہیں آیا۔
 فریدی کا صحبت یافتہ تھا۔ اُسے کم از کم اتنا سلیقہ تو تھا ہی کہ وہ جھوٹ اور سچ میں امتیاز کر سکے۔
 ”اچھی بات ہے۔ تو آپ براہ کرم اس لڑکی سے مزید معلومات حاصل کیجئے۔ مجھے

آ رہی ہے۔“

انسپٹر چند لمحے خاموش کھڑا اُسے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”کیا وہ لڑکی ڈالی نہیں ہے؟“

”ہاں..... ڈالی لڑکی ہی ہے۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔ ”بلخ کا طبی معائنہ بھی

ہوا ہوگا۔“

”ہو چکا ہے..... وہ غیر معمولی نہیں ہے۔“

”تو اب میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کسی ایسے آدمی کو تلاش کریں جس نے اسے

چھیڑنے پر اکسایا ہو۔“

”میں کہہ چکا ہوں کہ بلخ غیر معمولی نہیں تھی۔“ انسپٹر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”میں کب کہتا ہوں کہ تھی۔ ظاہر ہے کہ جب بلخ نے اس کی پنڈلی کی کھال ادھڑا

تو دو چار آدمی ضرور دوڑ پڑے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ان میں کوئی ایسا بھی رہا ہو جس۔
 دیکھنے کے بہانے کو برا کا زہر.....!“

”اتنا میں بھی سوچ سکتا ہوں۔“ انسپٹر ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

”سوچ سکتے ہیں نا۔“ حمید نے جل کر کہا۔ ”لہذا اگر ان دو چار آدمیوں میں میرا

ہو تو مجھے بے تکلف حراست میں لے لیجئے ورنہ پھر مجھے سونے دیجئے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”تم یہاں سے زندہ نہیں جاسکتے۔“ فریدی کے لہجے میں سفاکی تھی۔

”میں سرکاری سراغ رساں نہیں ہوں۔“

”پچھلے سال بھی تم ہی جیسے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی تھی لیکن بیجاری پولیس اس

کی شناخت سے قاصر رہی تھی۔ میں عموماً چہرہ بگاڑ دیتا ہوں۔“

”میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں سرکاری سراغ رساں نہیں ہوں۔“

”کیا تم بزدل ہو؟“

”نہیں..... میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔“ اس آدمی نے حیرت سے کہا۔

”تم اسی صورت میں بچ سکتے ہو کہ جب مجھے مار ڈالو۔ اٹھو! میں الجھن پالنے کا

نہیں ہوں۔“

”ارے یار کیوں خواہ مخواہ مذاق کر رہے ہو۔“ وہ آدمی خوفزدہ سی ہنسی کے ساتھ بولا

”اچھا تو پھر کسی چوہے کی طرح مرنے کو تیار ہو جاؤ۔“

”ختم بھی کرو۔ یار میں تمہیں ایک محفوظ جگہ لے چلوں گا۔ مگر ٹھہرو..... مجھے ایسا

ہوتا ہے جیسے میں تمہیں کہیں دیکھ چکا ہوں۔“

”پیراڈائیز میں۔“ فریدی نے بڑی سادگی سے کہا۔

”اوہاں..... مم..... مگر.....!“ وہ ہٹکایا۔

”تو تم نے مجھے پہچان لیا۔“

”شکاری سلیم!“

”گڈ.....!“ فریدی چٹکی بجا کر بولا۔ ”اب چپ چاپ اس لڑکی کو میرے حوالے کر

”یہ ناممکن ہے۔ ہم نے بڑی محنت کی ہے۔ ویسے اگر تم دس ہزار روپے دے دو یہ تو بھی ہو سکتا

”ایسی رقیں صرف شریف آدمیوں سے وصول کی جاسکتی ہیں۔“ فریدی نے غٹکا

میں کہا۔

”جیب پھر..... اس کی واپسی بھی ممکن نہیں۔ ہمیں اس کام کیلئے دس ہزار ملنے والے ہیں۔“

”تم نے یہ کام کس کے لئے کیا ہے؟“

”ہم کام اور دام کے علاوہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔“ اس آدمی نے کہا۔

”لہذا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم کام لینے والوں کے متعلق ہر قسم کی معلومات فراہم کرتے پھریں۔“

”اوہ..... تو تم اس سے واقف بھی نہیں ہو۔“

”نہیں! جب ہم سے سودا ملے ہوا تھا تو وہ نقاب میں تھا۔“

”اور تم نے کچھ سمجھے بوجھے بغیر سودا ملے کر لیا۔“

”ہمیں اس سے کیا غرض کہ وہ کون ہے۔“

”ممکن ہے تمہیں پکڑنے کے لئے پولیس نے جال بچھایا ہو۔“

”نہیں یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس کے لہجے میں بے اعتمادی تھی۔

”خیر تم جہنم میں جاؤ۔ لڑکی کو چپ چاپ میرے حوالے کر دو۔ کچھ دیر پہلے میں تمہارے

آدمیوں کی مرمت کر چکا ہوں۔“

”اوہ..... تو وہ تم ہی تھے۔“

”بھولے نہ بنو..... شکاری سلیم کو تم جانتے ہو۔ لیکن.....!“ فریدی کہتے کہتے رک گیا۔

”بہت دنوں سے میں اس کے چکر میں ہوں۔ مگر تمہیں اس سے کوئی غرض نہ ہونی چاہئے۔“

”یہاں نے کہا۔“ مگر اُسے دوبارہ کس نے اٹھایا۔ کیا تم لوگ یہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔“

”ہم تعداد میں پندرہ ہیں۔“ اُس آدمی نے جواب دیا۔ ”یہاں جگہ جگہ کچھ آدمی پہلے ہی

لگا دیئے گئے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پر ان تینوں کی مدد کی جاسکے۔“

”اب تم اسے کہاں لے جاؤ گے۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کس طرح بتا دیا جائے۔ جب تمہارے ارادے نیک نہیں ہیں۔“

فریدی نے اُسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اُس کے ہاتھ اٹھنے سے پہلے اس کا گھونرہ

اس کے جڑ سے پڑا۔ پھر اُسے سنبھلنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ پے درپے دس بار گھونرے کھانے

کے بعد وہ لیٹ گیا۔ اُس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

”تم کیا چاہتے ہو۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”لڑکی.....!“ فریدی کا جواب تھا۔

”وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔“

”تم مجھے اس تک پہنچا دو۔ پھر میں دیکھ لوں گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”یا پھر ایک دوسرا

صورت ہے۔ تم مجھے وہاں لے چلو جہاں اُسے اس نامعلوم آدمی کے حوالے کرو گے۔“

”دونوں ہی صورتوں میں میرے ساتھی مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔“

”وہ لڑکی ابھی یہیں ہے؟“

”ہاں.....!“

”کہاں؟“

وہ کچھ نہ بولا۔ اس بار فریدی نے اس انداز میں پیر اٹھایا جیسے اس کے سر پر ٹوکڑ

کا ارادہ رکھتا ہو۔

”ٹھہرو.....!“ اُس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”وہ یہیں ہے۔ قریب ہی۔ ہم یہاں

تھے۔ میں لڑکی کو اٹھالایا تھا۔ جب سڑک پر کوئی نہ رہ گیا تو میرا ساتھی اُن تینوں کو گا

ڈال کر نکال لے گیا۔“

”موٹر سائیکل کیا ہوئی؟“

”وہ میرے پاس ہے۔“

”تو وہ لڑکی یہیں کہیں ہوگی۔“

”ہاں..... میں اُسے ایک غار میں چھوڑ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کی تلاش میں

”تمہارے گروہ کا سرغنہ کون ہے؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“

”تمہاری مرضی..... خیر اب تم مجھے اس لڑکی کے پاس لے چلو۔“

”تم میری زندگی کے خاتمے پر کیوں قائل ہو گئے ہو۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”دوسری صورت میں..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ویسے ممکن ہے کہ تم بچ جاؤ۔ تم اپنے

بندے سے کہہ سکتے ہو کہ جب اس نے تین آدمیوں کو بیکار کر دیا تھا تو ایک کی کیا حقیقت ہے۔“

بارش کا زور اب کم ہو گیا تھا۔ فریدی نے اُسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا لیکن اس بار اس

روپوڑا اٹھا کر جب میں ڈالنا نہیں بھولا۔ اس کی جامہ تلاشی لینے پر کچھ فالتو راؤنڈ بھی ہاتھ

لے۔ پھر اُس نے اُسے دھکے دے دے کر غار سے باہر نکالا۔

”مجھے لڑکی کے پاس لے چلو۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اسی پر تمہاری زندگی کا انحصار ہے۔“

کچھ دور چلنے کے بعد زخمی آدمی ایک غار میں مڑ گیا۔ فریدی کی ٹارچ روشن تھی۔ اس

دیکھا کہ ایک طرف پڑی گہری گہری سانس لے رہی تھی۔ وہیں موٹر سائیکل بھی موجود

تھی۔ شاید وہ بارش ہی کی وجہ سے رک گیا تھا ورنہ اسے بھی موٹر سائیکل پر نکال ہی لے گیا ہوتا۔

زویا کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں رومال ٹھونس دیا گیا تھا۔

”اُسے کھولو۔“ فریدی نے کہا۔

”دیکھو..... تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

”کیا تمہیں اس لڑکی کے سامنے پٹتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔ آدمی بنو۔“ فریدی نے کہا۔

مجبوراً اُسے زویا کو کھولنا ہی پڑا۔ وہ ہوش میں تھی۔

”سلیم صاحب۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

”ہاں..... اب تم محفوظ ہو۔ ذرا یہ ٹارچ لے کر یہاں کھڑی ہو جاؤ۔“ اس نے ٹارچ

زویا کی طرف بڑھادی۔

پھر وہ اُسی ڈور سے جس سے زویا کے ہاتھ پیر باندھے گئے تھے اس آدمی کو جکڑ رہا تھا۔

”تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے۔“ وہ غصیلی آواز میں بولا۔

”تم خاموشی اختیار نہ کرو گے تو مجبوراً مجھے تمہارا گلا گھونٹا پڑے گا اور سنو تم لوگ خود کو

مفلوظ نہ سمجھو۔ میں تم میں سے ایک ایک کو مار ڈالوں گا۔ ورنہ میرے لئے کل تک اس آدمی کے

متعلق مکمل معلومات بہم پہنچاؤ۔ یہ قصہ اس سٹیج پر ہرگز ختم نہیں ہو سکتا۔ مگر مجھے اس لڑکی بحفاظت تمام واپس لے جانا ہے۔“

وہ آدمی کچھ نہ بولا۔

بارش تھم گئی تھی اور اب فریدی زویا کو کیریز پر بٹھا کر رام گڈھ واپس جا رہا تھا۔ مگر ہوائیکل کی رفتار تیز نہیں تھی کیونکہ کیریز پر زویا بیٹھی ہوئی تھی۔ فریدی نے سوچا ممکن ہے موجودہ حالت میں موٹر سائیکل کی تیز رفتاری برداشت نہ کر سکے۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ ”تم وہاں اُن کاروں کے نزدیک کیوں گئی تھیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”مجھے کسی نامعلوم آدمی نے خط لکھا تھا۔ اُس میں تحریر تھا کہ میں آپ اور پرویز ہوشیار رہوں۔ ساتھ ہی اس نے لکھا تھا کہ اگر میں کاروں کے قریب پہنچ سکوں تو وہ مجھے بہت بڑے راز سے آگاہ کرے گا۔“

”اوہ..... تو کیا تمہیں بھی کسی راز کی جستجو تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ عجیب انداز میں بولی۔ ”میں صرف اپنا راز معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”مجھ سے کوئی راز وابستہ ہے، جو میرے لئے بھی راز ہے۔“

”کیا تم اس آدمی سے واقف تھیں جو آج بلیغ کا شکار ہو گیا تھا۔“

”جی ہاں۔“ وہ دردناک آواز میں بولی۔ ”یہ میرے سلسلے میں تیسری موت تھی۔“

”بھی تم پہیلیاں بھجوا رہی ہو۔“

”آپ یقین کیجئے۔ میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ اُسے علم تھا کہ میرے لئے دو آدمی سے پہلے موت کا شکار ہو چکے ہیں لہذا وہ میرا راز دریافت کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں دوست تھے۔ جب پرویز صاحب سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے تاکید کر دی کہ میں ہوشیار رہوں۔ لیکن میں اُن سے ملتی ہی رہی۔ آپ خود ہی سوچئے کہ آدمی کسی سے بغیر کیسے زندگی گزار سکتا ہے۔ کل اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نے پرویز صاحب سے

نہ کیا تو وہ پرویز صاحب کو قتل کر دے گا۔ لہذا کل شام کو پرویز صاحب کو میرے رویے بڑی تکلیف پہنچی۔ پھر اُن دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور آج.....!“

”کیا تم مجھے اس راز میں شریک کر سکو گی۔ بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے دوست کی سلسلے میں پولیس پرویز پر شبہ کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر پولیس کا شبہ رفع نہ ہو سکا تو بڑی مصیبت میں پھنس جائے گا۔“

”نہیں پرویز صاحب کا اس موت سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔“

”پھر اس کی پشت پر کون ہو سکتا ہے۔“

”یہی معر میں آج تک نہ حل کر سکی۔“

”مگر تمہارا راز کیا ہے؟“

”میں نہیں جانتی کہ میرے اخراجات کون پورے کرتا ہے۔“

”تمہارے والدین۔“

”اوہ..... میں نہیں جانتی کہ وہ کون تھے۔ کہاں تھے۔ کب تھے۔“

”ظاہر ہے کسی نہ کسی نے تمہاری پرورش ضرور کی ہوگی۔“

”وہ ایک گونگی عورت تھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میری ماں نہیں تھی۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ تمہاری ماں نہیں تھی۔“

”سارے پڑوس کہتے تھے۔“

”پھر آخر تم اس کے پاس کیسے پہنچی تھیں؟“

”نہ وہ خود بتا سکتی تھی اور نہ پڑوسی۔“

”اب وہ کہاں ہے۔“

”میں چھ سال کی تھی تب اس کا انتقال ہو گیا۔“

”پھر اس کی بعد تم کہاں رہی تھیں؟“

”ڈیٹل..... اسی گھر میں..... اس کی علالت کے دوران ہی میں ایک بوڑھا آدمی وہاں

آ گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس گوگی کا بھائی ہے۔“

”لیکن یہ نہیں بتایا کہ تم اس گوگی کو کہاں سے ملی تھیں۔“

”نہیں..... اس نے نہیں بتایا۔ لیکن وہ مجھے اُس گوگی کا بھائی نہیں معلوم ہوتا تھا۔“

”یہ کیوں؟“

”گوگی نچلے طبقے کی معلوم ہوتی تھی لیکن وہ بوڑھا ہر لحاظ سے بلند آدمی تھا۔ وہ دولہ

بھی تھا، ذی علم بھی تھا اور بہتری خوبیاں تھیں اُس میں۔ گوگی کی موت کے بعد اس نے تعلیم و تربیت کی لیکن وہ ہمیشہ میرے والدین کے متعلق گفتگو کرتا رہتا تھا۔ ہر وقت مجھے احساس میں مبتلا رکھتا تھا کہ میں ایک بے سہارا نامعلوم والدین کی بیٹی ہوں۔“

”وہ بوڑھا کہاں مل سکے گا؟“

”خدا جانے..... آج سے دو سال پہلے وہ ایک دن اچانک غائب ہو گیا اور پھر آج نہ معلوم ہوسکا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا۔“

”بڑی عجیب کہانی ہے۔“ فریدی نے حیرت سے کہا۔ چند لمحے خاموش رہا اور پھر: ”تمہارا مستقل قیام کہاں رہتا ہے۔“

”قائم آباد میں..... وہیں میں نے ہوش سنبھالا تھا اور وہیں اب بھی رہتی ہوں۔ مکان مختصر سا اور شکستہ حالت میں تھا۔ مگر اب اُسی زمین پر ایک شاندار عمارت موجود۔ عمارت اسی بوڑھے نے بنوائی تھی۔“

”اب تمہارے اخراجات کیسے چلتے ہیں؟“

”ہر ماہ پانچ سو روپے کا چیک مل جاتا ہے اور میں اسے کیش کرا لیتی ہوں لیکن جانتی کہ چیک کون بھیجتا ہے اس کے دستخط بھی سمجھ میں نہیں آتے۔“

”یہ تو بینک سے معلوم ہوسکتا ہے۔“

”لیکن مجھے نہیں معلوم ہوسکا۔ میں نے بہت کوشش کی ہے۔“

”میں معلوم کر لوں گا۔“

”میں زندگی بھر آپکی احسان مند رہوں گی۔ یہ الجھن میری لئے سوہان روح بن کر رہ گئی ہے۔“ فریدی کچھ نہ بولا۔ موٹر سائیکل سنانے کا سینہ مجروح کرتی رہی۔

رقاصوں کا نگران

دوسری صبح کا سورج کچھ پھیکا پھیکا سا تھا۔ حمید نے انگڑائی لے کر کھڑکی پر دونوں ہاتھ دے دیے۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے سے ابھر چکا تھا اور خلاء میں چاروں طرف شعاعوں کے بازو پھیل چکے تھے، مگر حمید کو آج کی صبح کچھ اداس سی لگ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے ایسا نہیں ہو رہا تھا جیسے کچھ بھول گیا ہو۔ کچھ کھو بیٹھا ہو۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے دو تین گہری لہری سانس لیں اور کھڑکی پر کہنیاں ٹیک کر جھک گیا۔

مقدار وہ سوچ رہا تھا۔ سطح سمندر سے کئی فٹ کی بلندی پر بھی ساتھ نہیں چھوڑتا..... اُگ..... بھاگتے رہو..... لیکن جس چیز سے بھاگو گے وہ ضرور تمہارا نقاب کرے گی۔

وہ اپنی زندگی کے معمولات سے اکتا کر رام گڈھ بھاگا تھا۔ مگر ان تھکا دینے والے معمولات نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ پھر غیر معمولی حالات میں کسی کی موت..... پھر وہی..... اور پھر؟ کیا یہ ضروری تھا کہ زویا ہی سے اس کی ملاقات ہوتی اور ایک آدمی اس کیلئے لاسے لڑ جاتا۔ پھر دوسرے دن اس کی موت کسی قسم کے زہر سے واقع ہو جاتی۔ یہ مقدار ہی تو لا۔ اگر اب اس جنجال سے روگردانی بھی چاہتا تو نہ کر سکتا۔ کیونکہ پولیس خود اس پر شبہ کر رہی تھی۔ بڑبڑانی اصلیت ظاہر کر کے رفع بھی کیا جاسکتا تھا مگر فریدی..... وہ قضائے مہتمم کی طرح سر پر وار تھا وہ ہرگز اس کے حق میں نہیں تھا کہ اپنی اصلیت ظاہر کر کے پولیس کا شبہ رفع کیا جائے۔

وہ ان خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا لیکن وہ ایک نہیں دو لڑکیوں کا معاملہ تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ڈالی کا تعلق مجرموں سے ضرور ہے ورنہ اُس کے کمرے میں ابتری پھیلانے کا کیا

وہ پھر خاموش ہو گئے۔ سراغ رساں فون پر کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ حمید اسے دیکھتا رہا۔
جلد ہی ریسیور رکھ کر ڈائینگ ہال سے چلا گیا۔

فریدی نے پچھلی رات کی داستان جھیر دی اور حمید حیرت سے آنکھیں پھاڑے سنتا رہا۔
”لیکن وہ اب کہاں ہے۔“ حمید نے اس کے خاموش ہوتے ہی مضطربانہ انداز میں پوچھا۔
”فلم اشار روجی کے یہاں۔ وہ بھی آج کل یہیں مقیم ہے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا
کہ زویا دوبارہ یہاں واپس آئے۔ روجی کا مکان ہی مجھے اس کے لئے محفوظ معلوم ہوا۔ میں
نے اُسے سمجھا دیا ہے کہ وہ اُسے میری اصلیت سے آگاہ نہ کرے۔“

”کیا میں روجی سے مل سکتا ہوں۔“

”نہیں..... ابھی نہیں۔“

کچھ دیر بعد حمید نے بھی پچھلی رات کے واقعات دہراتے ہوئے کہا۔ ”کسی نے مقتول
کے کمرے میں پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ بڑی مشکل سے آگ پر قابو پایا جاسکا۔
بے اس کے سامان کی ایک دھبی بھی صحیح و سلامت نہیں ملی۔“
”کاش میں اس کے سامان کی تلاشی لے سکا ہوتا۔“
”لیکن ہمارے کردوں پر کس نے ہاتھ صاف کیا۔“

”اگر ڈالی مجرموں کی ساتھی ہے تو یہ کسی سراغ رساں ہی کی حرکت ہوگی۔“ فریدی بولا۔
”اور اگر مجرموں نے ہمارے متعلق صحیح معلومات فراہم کرنے کیلئے یہ اقدام کیا تھا تو ڈالی ان کی
مانگی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ڈالی مشتبہ ہے۔ کیونکہ اس نے تمہیں اپنا پتہ غلط بتایا تھا اور تمہارے
کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ اُس شیشی میں کیا رہا ہوگا۔“

”زہر.....؟“ حمید نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”ہاں..... کوبرا کا زہر۔“

”کوبرا کا زہر۔“ حمید بیساختہ اچھل پڑا۔ پھر پوچھا۔ ”کیا آپ کو پوسٹ مارٹم کی
رپورٹ کا علم ہے؟“

مقصد تھا۔ یقینی طور پر یہ اسی لئے کیا گیا تھا کہ اس پر کسی قسم کا شبہ نہ کیا جاسکے۔ یا پھر اس
خلاف بھی شبہ برقرار ہی رکھنا چاہتے تھے۔ مقصد جو کچھ بھی رہا ہو۔ دوپہر کے کھانے کے
اس نے ڈائینگ ہال ہی کو ترجیح دی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ وہ اور فریدی ساتھ ہی ڈائ
ہال میں داخل ہوئے اور سامنے والے دروازے میں وہی سراغ رساں نظر آیا جو پچھلی رات
کو بور کرتا رہا تھا..... وہ تیر کی طرح اُن کی طرف آیا۔

”کیا آپ بتا سکیں گے کہ آپ پچھلی رات سے اب تک کہاں رہے تھے۔“ ار
فریدی سے پوچھا۔

”اوہ..... اچھا اچھا۔“ فریدی سر ہلا کر مسکرایا۔ ”ابھی تک ہم لوگوں کی طرف سے
نہیں ہوا۔“

”آپ براہ کرم میرے سوال کا جواب دیجئے۔“

”میں نے پچھلی رات نواب طاہر مرزا کے یہاں گزاری تھی۔“

”آپ ثابت کر سکیں گے۔“

”اگر آپ کو اُن کے ٹیلی فون نمبر نہ معلوم ہوں تو میں بتاؤں۔“ فریدی نے کہا۔
آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ آج کل ہر وقت گھر پر مل سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے حال
چوتھی شادی کی ہے۔“

”اچھی بات ہے۔“ سراغ رساں نے کہا۔ ”میں ابھی معلوم کئے لیتا ہوں۔“

وہ اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد حمید نے اُسے ٹیلی فون ڈائریکٹ
پلٹے دیکھا۔

”آپ کہاں تھے۔“ حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

”ابھی بتاتا ہوں ذرا ان حضرت کو دفع ہو جانے دو۔“

”ارے یہ جو تک ہے۔“

”آدمی سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔“

”نہیں.....؟“

”وہ کوبرا کے زہر سے ہلاک ہوا تھا۔“

”اوہ..... تو یہ حقیقت ہے کہ ہمیں پھنسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے آج ہی اس

کیمیائی تجربہ کر لیا ہے۔ کوبرا کا زہر۔“

فریدی کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”ہو سکتا ہے کسی سراغرساں ہی نے اسی زہر کیلئے“
تلاشی لی ہو۔ رہ گیا ڈالی کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے کہ سراغرساں نے اسے تمہارے ساتھ دیکھ لیا ہو
حمید کچھ نہ بولا۔ فریدی کی نظر فون پر تھی۔

”نواب طاہر مرزا کا کیا قصہ تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”مجھے یقین تھا کہ پائیس میری عدم موجودگی کے متعلق ضرور استفسار کرے گی لہذا
نے طاہر مرزا کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کر لیا۔“

”لیکن آخر آپ اتنے پاؤں کیوں تیل رہے ہیں۔ کیا آپ اپنی اصلیت ظاہر کرے

کام انجام نہیں دے سکتے۔“

”نہیں..... میں پولیس کو اپنے پیچھے لگائے رکھنا چاہتا ہوں۔ فی الحال مجرموں

دینے کے لئے یہی ایک طریقہ کار آدہ ہو سکتا ہے۔“

”زویا کا معاملہ عجیب ہے۔ اگر اس نے راست گفتاری سے کام لیا تو.....!“

”مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔ خیر تھوڑی دیر ٹھہرو۔ ہم کئی

حقیقت کے قریب پہنچ جائیں گے۔ میں نے قائم آباد کے حکمہ سراغ رسانی کو تار دیا۔

الائیڈز بینک کے اکاؤنٹ نمبر چار سو سترہ کے متعلق معلومات فراہم کرے۔“

حمید پھر کچھ کہنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔

”سائیکل کا کیا ہوا؟“

”پچھلی رات میں نے اسے کو توالی کے قریب چھوڑ دیا تھا۔ آج غالباً وہ اپنے ما

پاس پہنچ بھی گئی ہوگی۔“

”کتنا عجیب کیس ہے۔ یہ زویا مجھے پہلے ہی عجیب معلوم ہوئی تھی۔“

”لیکن اس کے اس طرح اغواء کئے جانے کا مسئلہ عجیب ہے۔ وہ اپنے کسی ایسے دشمن کو

ہیں جانتی جس سے اس قسم کا خدشہ ہو۔ ویسے اس کے لئے یہ بات حیرت انگیز ضرور ہے کہ جو

س سے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہے کسی نہ کسی طرح موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔“

”آہ.....!“ حمید کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”یہ کیس ہے۔ ایسے کیسوں کے لئے میں اپنی تفریح

زبان کر سکتا ہوں مگر آپ نے اس کو کیوں چھوڑ دیا تھا؟“

”مجبوراً چھوڑ دینا پڑا حمید صاحب۔“ فریدی بولا۔ ”زویا کو روحی کی کٹھی میں چھوڑ کر

ادارہ پھر ادھر ہی کی دوڑ لگائی تھی، لیکن اتنی دیر میں میدان صاف ہو چکا ہے۔ خیر فکر نہ کرو۔

اگر ہم اس ہوٹل ہی میں مقیم رہے تو جلد ہی ان لوگوں سے ملاقات ہوگی اور ہاں یہ حقیقت ہے

کہ زویا اپنے دشمنی یک میں اعشاریہ دو پانچ کا پوتول رکھتی ہے۔ ڈالی نے صحیح اطلاع دی

فی۔ یہ ڈالی میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“

”آپ کی سمجھ میں مشکل ہی سے آئے گی کیونکہ وہ جوان بھی ہے اور حسین بھی۔“

”تم اس پر اپنے شبہ کا اظہار نہ ہونے دینا۔“

”وہ تو ابھی چکا پچھلی رات۔“

”کیا مطلب.....!“

حمید نے اسے بتایا کہ کس طرح ڈالی سے فون پر جھڑپ ہوئی تھی اور اس نے اس پر یہ

بات واضح کر دی تھی کہ تار جام میں کوئی آئرن فیکٹری اس نام کی نہیں ہے جو اس نے اپنے

باپ سے منسوب کی تھی۔

”پرواہ نہ کرو۔ مگر اس کے بعد تم نے ڈالی کے رویہ میں تبدیلی پائی تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”کیوں نہیں..... آج وہ ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آئی۔“ حمید نے جواب دیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد حمید نے پوچھا۔ ”کیا زویا اس پستول کا لائسنس رکھتی ہے۔“

”ہاں..... اور اس کے لئے لائسنس جعفری نے حاصل کیا تھا۔“

”کون جعفری؟“

”وہی بلخ کا شکار۔ وہ قائم آباد کے متحول خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن زویا۔ بات میرے علاوہ اور کسی پر ظاہر نہیں کی۔“

دوپہر کے کھانے کے بعد حمید ڈالی کی تلاش میں نکلا۔ لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ اس کا مقفل تھا۔ وہ پھر ڈائینگ ہال میں واپس آ گیا۔ فریدی اب بھی یہیں موجود تھا۔

”قائم آباد سے اطلاع ملی ہے حمید صاحب۔ وہ اکاؤنٹ جس سے زویا کو ہر ماہ ادائے ادا کئے جاتے ہیں کسی ڈاکٹر ناصر کا ہے اب میں زویا سے معلوم کروں گا کہ وہ کسی ڈاکٹر سے واقف ہے یا نہیں۔“

پھر وہ اٹھ کر جانے لگا۔

”کہاں.....؟“

”کسی پبلک کال بوتھ سے زویا کو فون کروں گا۔“

وہ چلا گیا اور حمید اُن نیم مردہ آرٹسٹوں کو دیکھنے لگا جو پہلے دار کرسیوں پر ڈائینگ ہال لائے گئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر انہیں یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اپنے کردار کھانا کھا سکتے تھے مگر پھر خیال آیا کہ وہ تو اس طرح ایک دوا ”انرجین“ کی پبلیٹی کر رہے ہیں۔ آرٹسٹ کیساتھ ایک خبر گیری کرنیوالا بھی تھا۔ انکی کرسیاں وہی لوگ دھکیل کر یہاں لائے تھے کچھ دیر بعد حمید نے انہیں نیم مردہ آرٹسٹوں کو کھانا کھلاتے دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کھانا بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ ان آرٹسٹوں کے ساتھ ایک منتظم بھی تھا اور یہ خود بھی ایک شاہ آرٹسٹ ہی معلوم ہوتا تھا لیکن ان آرٹسٹوں کی طرح وہ نیم مردہ نہیں تھا۔ اس کا سینہ چوڑا تھا اور بازو پچھلیوں سے پُر تھے۔ عمر تیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ آرٹسٹوں کی خبر کرنے والے اسے ”ناگری صاحب“ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

اس وقت وہ بھی آرٹسٹوں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ حمید نے اُسے اپنے ساتھ بیٹھ دعوت دی، جو فوراً ہی شکریہ کے ساتھ قبول کر لی گئی۔ حمید کھانا کھا چکا تھا۔ ناگری نے بتایا

کھانا کھا چکا ہے۔ آخر بات کافی پر بھری۔ حمید نے کافی کے لئے آرڈر دیا۔ کچھ دیر تک حمید آرٹسٹوں اور اُس عجیب و غریب مشروب پر حیرت ظاہر کرتا رہا پھر بولا۔ ”مگر ایک بات سمجھ نہیں آتی کہ ان کی حالت اتنی ابتر کیوں رہتی ہے؟“

”اوہ دیکھئے نا جناب..... یہ لوگ دراصل انرجین کے اشتہار ہیں اور یہ مشروب بھی ذہنی اثرات کا حامل ہے۔ اس میں انرجین کے وہ اجزاء شامل نہیں کئے گئے جو مستقل طور صاب کے لئے صحت بخش ہوتے ہیں۔“

”کیا ان کی یہ کیفیت قدرتی ہے۔“

”نہیں جناب! انہیں ایسی ادویات دی جاتی ہیں جن سے اعصاب ہیجہ کمزور ہو جاتے ہیں۔“

”مگر یہ تو ظلم ہے اور شاید جرم بھی؟“

”لیکن خود وہ لوگ نہ اُسے جرم سمجھتے ہیں اور نہ ظلم۔ انہیں اس کے لئے بہت بڑے معاوضے دیئے جاتے ہیں اور ان کی زندگیوں کی بھی ضمانت دی گئی ہے۔ ایک معینہ مدت بعد انہیں انرجین کا مکمل نسخہ استعمال کرایا جائے گا اور یہ معمول پر آ جائیں گے۔ ہم نے اس لئے باقاعدہ طور پر وزارت صحت سے اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔“

”مجھے سخت حیرت ہے۔“

”ڈاکٹر اسفندیار کے لئے سب کچھ ممکن ہے جناب۔“

”میں نے یہ نام بہت سنا ہے لیکن کسی نے آج تک ڈاکٹر اسفندیار کو دیکھا بھی نہیں۔“

”یہ سعادت مجھے حاصل ہو چکی ہے جناب۔ ویسے حکومت کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کہ ڈاکٹر اسفندیار منظر عام پر کیوں نہیں آتے ہیں۔ اگر وہ منظر عام پر آنے لگیں تو اُن کا نشانہ کتنا برباد ہو۔ ایک جم غفیر ہر وقت اُن کی گرد رہے اور پھر وہ ملک و قوم کی خدمت نہ کر سکیں۔ اب تک کئی وباؤں کا کامیاب علاج دریافت کر چکے ہیں۔ اس لئے وزارت صحت انہیں ہر وقت ہر قسم کی مراعات دینے پر تیار رہتی ہے۔“

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور ناگری کافی ختم کر کے اٹھ گیا۔ اس کے جاتے ہی

پھر بات آگے نہیں بڑھی۔ حمید اب اس میں صرف اسی حد تک دلچسپی لے رہا تھا کہ وہ فریدی کی نظروں میں مشتبہ تھی لیکن وہ زویا کے متعلق ہر وقت سوچتا رہتا۔ کبھی کبھی خیال آتا کہ فریدی نے اس کے بیان کو سچ کیسے تسلیم کر لیا۔ ممکن ہے وہ بھی مجرمہ ہی ہو اور کسی مخالف رو سے اس کے گروہ کی ٹھن گئی ہو اور مرنے والے کا تعلق بھی زویا ہی کے گروہ سے ہو۔

اس سے پہلے بھی کئی بار وہ ایسے ہی حالات سے دوچار ہو چکا تھا۔ دو گروہوں میں جنگ دہی اور کمزور پڑنے والے گروہ کے کچھ آدمی پولیس کے ہاتھ لگ جاتے اور یہ لوگ پولیس پر ہتھیار کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ بے ضرر اور امن پسند شہری ہیں۔ لیکن وہ اس سے لاعلمی ہی ظاہر کرتے کہ وہ کس کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے دشمنوں کی نشان دہی کر دینے پر خود ان کی اصلیت ظاہر ہو جانے کا بھی خطرہ رہتا تھا۔

حمید سوچتا ہی رہا کیونکہ فریدی سے اس مسئلے پر بحث کرنا فضول ہی ہوتا۔ اس کی بات تو رکی لکیر ہوتی تھی۔ وہ زویا کے متعلق جو نظریہ رکھتا تھا اسے تبدیل کر دینا کم از کم حمید کے بس اور اگ نہیں تھا۔ وہ صبح سے شام تک فریدی کی بھاگ دوڑ دیکھتا رہتا لیکن نہ تو اس سے کچھ جہتا اور نہ ہی اس پر زور دیتا کہ وہ بھی اس کے ساتھ رام گڈھ کی خاک چھانے گا۔

جب سے بلخ والا کیس ہوا تھا اس نے ہوٹل سے باہر قدم نہیں نکالے تھے۔ حالانکہ فریدی نے اس قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔

ویسے حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھی کہ حمید کا موڈ ہی چوٹ ہو گیا تھا۔ وہ یہاں آؤ تو تفریح کی غرض سے لیکن اس کیس نے لفظ ”تفریح“ ہی کی مٹی پلید کر کے رکھ دی تھی۔

وہ شام کو بھی اپنے کمرے سے نہ نکلا۔ لیکن تقریباً سات بجے کسی نے اس کے دروازے پر کدک دی۔ آنے والا وہی تھا جن پر خار کھا کھا کر حمید بول کا درخت بن چکا تھا۔

فریدی نے کوٹ اتار کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور ایک آرام کرسی پر گر کر سرگراں لگانے لگا۔ پلہ پلہ تین کش لینے کے بعد اس نے حمید سے پوچھا۔ ”آج کا تفریحی پروگرام کیا ہے۔“

”کیپٹن حمید ہمالیہ سے بحر عرب میں چھلانگ لگائے گا۔“

فریدی ہال میں داخل ہوا۔

”کیا رہا.....؟“ حمید نے پوچھا۔

”وہ کہتی ہے کہ ناصر تو اسی بوڑھے کا نام تھا جو گوگنی عورت کی موت کے بعد اس کی کیری کرتا تھا لیکن وہ نہیں جانتی کہ وہ ڈاکٹر بھی تھا۔“

”یہ آخر ہے کیا چکر۔“ حمید اپنا سر سہلا کر بولا۔ لیکن فریدی خاموش ہی رہا۔

لاری کی چھت پر

مقامی سی آئی ڈی انسپٹر ابھی تک اسی چکر میں تھا کہ کسی طرح حمید کو ماخوذ کر لے اسے یہ ثابت کر دینے میں ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا کہ بلخ کے حملے کے وقت حمید حوض پاس ہی کہیں موجود تھا۔ حمید کو اسے چھیڑنے میں بڑا الحظ آتا۔

ڈالی اب بھی حمید کے گرد منڈلا رہی تھی۔ اس نے بڑے خلوص کے ساتھ اعتراض کر دہ اپنی اصلیت کے بارے میں اس سے جھوٹ بولی تھی۔

”میری عادت ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں اپنے متعلق کسی کو صحیح بات نہیں بتاتی۔“

”تب پھر تمہارا نام بھی سالی ہوگا۔“

”کیوں.....؟“

”سالی کو ڈالی میں تبدیل کر دینا مشکل کام نہیں ہے۔“

”نہیں میں نے اپنا نام غلط نہیں بتایا۔“

”لیکن تم ایک ایسے آدمی سے ملتی ہی کیوں ہو، جس کی نگرانی پولیس کر رہی ہے؟“

”تم مجھے بہت پراسرار معلوم ہوتے ہو۔“

”ہاں کسی حد تک۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”اونچے اڑ رہے ہو فرزند۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان لوگوں سے نہیں الجھنا چاہتا۔ مجھے تو دی چاہئے جس نے انہیں اغواء کے لئے تیار کیا تھا۔“

”لیکن اگر وہ انتقامی کارروائی کر بیٹھے تو.....؟ ظاہر ہے کہ آپ نے ان کا کھیل بگاڑا تھا۔“

”بہ ہو سکتا ہے میرا ہاتھ ان پر اٹھ جائے۔ لیکن اس سے پہلے ممکن نہیں۔“

”وہ دونوں عمارت سے باہر آ گئے اور اب وہ رقص گاہ کی طرف جارہے تھے۔“

”بس تم اس طرح چلتے رہو جیسے تمہیں اس بات کا علم نہیں۔“ فریدی نے کہا۔

حمید کچھ نہ بولا۔ ویسے وہ سوچ رہا تھا کہ یہ رات دھول دھپے کیلئے تو قطعی موزوں نہیں۔ آج دن بھر موسم بہت اچھا رہا تھا..... لہذا رات بھی خوشگوار تھی۔ پھر پیراڈائیز کا ماحول۔ وہ رقص گاہ پہنچ گئے۔ مائیکروفون سے ہلکی ہلکی موسیقی منتشر ہو رہی تھی لیکن ابھی آج آرام نہیں شروع ہوا تھا۔

موسیقی کا ریکارڈ ختم ہو جانے کے بعد معلن کی آواز آئی۔ ”بال سے پہلے آج پھر نیم راقص آپ کی خدمت میں ایک پروگرام پیش کریں گے۔ انجین کا ایک اور حیرت انگیز لٹم ملاحظہ فرمائیے۔ انجین جو بہت جلد آپ کی خدمت میں حاضر ہوگی۔ انجین جو آپ کو راقصوں سے حاصل ہو سکے گی۔ اس انجین کا کرشمہ.....!“

دفعتاً لاؤڈ سپیکر کی آواز خراب ہو گئی اور پھر معلن نے جو کچھ بھی کہا وہ کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا۔

”پہلی کا کتنا شاندار طریقہ ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”جہنم میں جھونکنے۔“ حمید چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”وہ لوگ کہاں ہیں؟“

”بیکل ہیں اور سبوں پر میری نظر ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ انجین کا نیا کرشمہ دیکھو۔“

حمید کچھ نہ بولا اور پائپ سلگا کر سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد نیم مردہ راقصوں کا پروگرام شروع ہو گیا۔ آج وہ ”محبت اور نفرت“ پر ایک رقص پیش کرنے والے تھے۔ آرکسٹرا موسیقی بکھیر رہا تھا۔ راقصوں پر چار جانب سے مختلف رنگوں کی روشنیاں پڑنے لگیں۔

”موڈ خراب ہے۔“ فریدی اس کی جھلاہٹ پر مسکرایا پھر آہستہ سے بولا۔ ”دور شاید آج کوئی دوسرا کارنامہ پیش کریں گے۔“

”خدا انہیں معاف کرے۔“ حمید برا سامنہ بنا کر بولا۔ ”کیونکہ وہ دوسروں کے تفریح مہیا کرتے ہیں۔“

”چلو اٹھو! یہاں بہت گھٹن ہے۔“

”کہیں جھونکتا ہے۔“

”نہیں! میں آج تمہاری بارات نکالوں گا۔“

وہ شاید اُسے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہتا تھا۔ طوعاً و کرہاً حمید اٹھا اور لباس کر کے کھڑے کھڑے اونگھنے لگا۔

”کیا تمہیں بھی انجین کا ایک ڈونڈ دیا جائے؟“ فریدی اسے دروازے کی طرف دھکیلتا ہوا

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ کسی اذیل گدھے کی طرح آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

”آج ہاتھوں میں کھلی ہو رہی ہے۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”آج وہ مجھے چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں اور ان کی تعداد تیرہ سے کم نہیں ہے۔“

”وہی جنہوں نے زویا کو اغواء کیا تھا۔“

”ہاں..... آں..... اُن کے علاوہ اور کون ہوگا۔“

”تو کیا وہ یہاں موجود ہیں۔“

”قطعی..... کیا تم اپنے پیچھے قدموں کی آواز سن رہے ہو..... نہیں..... مڑ کر

ضرورت نہیں ہے۔ بس چلتے رہو۔ فی الحال یہ صرف ایک آدمی ہے لیکن جیسے ہی ہم

پہنچیں گے تعداد بڑھ جائے گی۔“

”اچھا تو آپ اپنے کمرے میں جاییں میں ان سے سمجھ لوں گا۔ صرف آپ کسی

پہچان کر دیجئے۔“

”میری طرف سے شمال کا عظیم پہاڑی سلسلہ خفقتاً قبول فرمائیے۔“ حمید نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ رقصہ ہکا بکارہ گئی۔ شاید یہ مزاح اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ اس نے بہت بُرا سا نہ بٹایا اور سر کو پر غرور سا جھٹکا دے کر دوسری طرف مڑ گئی۔

حمید آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی میز کی طرف واپس جا رہا تھا لیکن دفعتاً اس کے قدم رک گئے اس نے فریدی کو دیکھا جو دو اجنبیوں کے بازوؤں کا سہارا لئے ایک طرف جا رہا تھا۔ انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے اس نے بہت زیادہ پی لی ہو۔

حمید اسے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ دونوں اجنبیوں سے بیر نفی پھانک کی طرف لے جا رہے تھے۔ یکایک حمید کو خیال آیا کہ فریدی نے یہاں آتے وقت چند نقاب کرنے والوں کا تذکرہ کیا تھا۔ تو پھر..... کیا وہ اس پر قابو پا گئے ہیں، لیکن یہ صرف دو آدمی ہیں..... صرف دو..... آدمی اور فریدی کو اس طرح لے جائیں؟ یقیناً انہوں نے کوئی خاص طریقہ اختیار کیا ہے۔ ممکن ہے اُسے کوئی چیز دھوکے سے دے دی گئی ہو۔ جس سے ذہن قابو میں نہ رہ جائے۔ پھر اسے یاد آیا کہ فریدی نے تعاقب کرنے والوں کی تعداد تیرہ بتائی تھی تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ دوسرے آدمی بھی یہیں موجود ہوں گے..... لیکن.....؟“

حمید نے مزید غور کرنا بیکار سمجھا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کا رخ باغات کی طرف ہو گیا۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جاتا ہے یا نہیں۔ ویسے وہ باغات سے گذرتا ہوا پھانک تک بھی پہنچ سکتا تھا اور شاید ان لوگوں کو پیچھے بھی چھوڑ سکتا تھا، جو فریدی کو پھانک کی طرف لے جا رہے تھے۔ حمید کی رفتار بہت تیز تھی۔ پھانک پر پہنچنے سے قبل ہی وہ مطمئن ہو گیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد اُسے وہ دونوں آدمی نظر آئے جو فریدی کو سہارا دیئے ہوئے کہیں لے جا رہے تھے۔

دفعتاً اس نے فریدی کو کہتے سنا۔ ”بھائی ذرا آہستہ..... مجھے دکھائی نہیں دیتا۔“ وہ دونوں اس پر کچھ بولے نہیں، البتہ حمید نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ چلنے لگے ہیں۔ ان

رقص شروع ہو گیا۔ دولڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔ وہ دونوں ہی اس سے محبت کرتی تھیں مگر لڑکا صرف ایک طرف مائل تھا۔ دونوں اسے اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کامیابی صرف ایک کو ہوتی ہے۔ کامیاب لڑکی رقص کرتی ہوئی لڑکے کو رقص گاہ سے نکال جاتی۔ پھر شکست خوردہ لڑکی تنہا رہ جاتی ہے۔ حقیقتاً اس کا رقص ماسٹر پیس تھا جس میں وہ لڑکے کے بعد غصے اور نفرت کا اظہار کرتی ہے اس پر آہستہ آہستہ وحشت سی طاری ہوتی جاتی۔ پھر یک بیک ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اس کا دماغ بالکل ہی الٹ گیا ہو۔ وہ فرش پر پڑے، پتھر چبانے لگتی ہے اس وقت اس پر چاروں طرف سے بہت ہی تیز قسم کی روشنیاں ڈالی جاتی۔ نزدیک و دور کے لوگ اسے پتھر چباتے دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً مائیکروفون سے آواز ”یہ ازجین کا دوسرا کرشمہ ملاحظہ فرمائیے جن صاحب کو بھی ان پتھروں کی اصلیت پر قریب سے دیکھ سکتے ہیں انہیں پرکھ سکتے ہیں۔“

رقص ختم ہو چکا تھا لیکن رقص کرنے والی اب بھی وہیں موجود تھی۔ وہ جاتی بھی کیونکہ ایک جم غفیر نے اسے گھیر لیا تھا..... لوگ اسے تحائف پیش کر رہے تھے۔ کچھ ان کا معائنہ کر رہے تھے جو کچھ دیر پہلے مصری کی ڈلیوں کی طرح چبائے گئے تھے۔ حمید بھیڑ میں شامل تھا لیکن فریدی نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی بھی زحمت نہیں گوارا کی تھی۔ ذرا ہی سی دیر میں رقاصہ کے آگے تحائف کے ڈھیر لگ گئے۔ کچھ لوگ اس گراف بھی چاہتے تھے۔

دو یا تین منٹ کے بعد مائیکروفون سے آواز آئی۔ ”اب براہ کرم آرٹسٹ کے ہٹ آئیے۔“

بھیڑ ہٹ گئی لیکن حمید چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔

”فرمائیے..... جناب۔“ رقاصہ نے حمید کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”ایک تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

”جلدی کیجئے..... میں اب تھکن سی محسوس کر رہی ہوں۔“

کارخ ادھر ہی تھا جہاں گاڑیاں پارک کی جاتی تھیں۔

حمید بھی خود رو جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اسی طرف بڑھنے لگا تھا۔ وہ لوگ ایک لاری قریب رک گئے۔ حمید جھاڑیوں سے نکل کر پارک کی ہوئی کاروں کے درمیان آ گیا۔ یہ ہی فریدی کو لاری میں بٹھایا گیا پانچ آدمی اور لاری کے قریب پہنچ گئے۔ اب وہ تو سات ہو گئے جب وہ بھی لاری میں بیٹھ چکے اور انجن اشارت کر دیا گیا تو حمید نے الٹی جڑ انگیز پھرتی دکھائی جو شاید فریدی کے لئے بھی غیر متوقع ہوتی۔ یعنی لاری کے حرکت میں آ سے پہلے ہی وہ اس کی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اوپر پہنچ جانے کے بعد غیر متوقع طور پر کسی نئی مصیبت سے دوچار ہو گیا ہو۔ وہ دائیں کروٹ لیٹا ہی تھا کہ کوئی خن چیز اس کے سینے میں آ گئی اور ساتھ ہی کسی نے سرگوشی کی۔ ”خبر دار..... اگر آواز نکلی تو دوسری طرف نکل جائے گی۔“

حمید دم بخود رہ گیا۔ اس نے جلدی میں اس لمبی اور سیاہ سی چیز پر دھیان ہی نہیں دیا جو پہلے ہی سے لاری کی چھت پر موجود تھی۔

لاری کی رفتار تیز ہو گئی اور حمید اپنے سینے پر ریوالتور کی نال کا دباؤ محسوس کرتا رہا۔ یہ خوشبو کتنی دلکش تھی جس کی مہک اس کے ذہن کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خوشبو اس کے لئے نئی نہ ہو۔ وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ لاری دوڑتی رہی لیکن شاید حمید کا ذہن سے بھی زیادہ تیز رفتاری پر مائل تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کتنے چالاک ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ اس سے لاری کی چھت ملاقات ہوگی۔ لہذا انہوں نے اس کے تعاقب کی بھی ضرورت نہیں محسوس کی تھی اور اب صرف ایک ہی آدمی اس کے لئے کافی تھا۔ حمید نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے! ”کیا تمہارے پاس ایک کمبل بھی ہوگا دوست..... میں سردی محسوس کر رہا ہوں۔“

”چپ پڑے رہو۔“ حمید کے سینے پر ریوالتور کا مزید دباؤ ڈالتے ہوئے کہا گیا۔ اگر آواز سرگوشی سے کچھ بلند تھی لیکن حمید کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا کیونکہ وہ کسی عورت کی

نہی۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے اسے دھوکا ہوا ہو، لہذا اسے چاہئے کہ ایک بار پھر اسے اسی راج بولنے پر مجبور کرے، اگر وہ کوئی عورت ہی ثابت ہوئی تو.....؟

”مگر میں سوچاؤں تو تمہیں اس پر اعتراض تو نہ ہوگا۔“ حمید نے کہا۔ ”مجھے نیند آرہی ہے۔“ ”چپ چاپ لیٹے رہو۔ کیا تم نے سنا نہیں۔“ اس بار پھر اس کی آواز سرگوشیوں کے ہچاک سے نکل آئی تھی۔

حمید نے معلوم کر کے کہ وہ کوئی عورت ہی ہے ایک طویل سانس لی اور پھر پے درپے ٹھنڈی سانس لیتا رہا۔ لیکن پستول یا ریوالتور اس کے سینے سے نہیں ہٹایا گیا۔

”تم کون سا سینٹ استعمال کرتی ہو؟“ حمید نے پوچھا۔

عورت کچھ نہ بولی۔ لیکن حمید کے سینے پر دباؤ کچھ اور بڑھ گیا۔

”کیا تم مجھے اپنی عمر بتانے کی زحمت گوارا کرو گی؟“

”کیوں؟“

”اگر عمر زیادہ ہوئی تو میں تمہارے ہاتھوں مرنے پر یہاں سے چھلانگ لگا کر جان دینے کو ترجیح دوں گا۔“

عورت نے ایک ہلکا سا قبضہ لگایا اور حمید بے ساختہ چونک پڑا۔ یہ ہنسی بھی جانی پہچانی ہوئی سی تھی۔

”ڈالی۔“ اس نے متحیرانہ انداز میں دہرایا اور ریوالتور کا دباؤ یک بیک بہت کم ہو گیا۔ حمید اتنی ہی تھا۔ اگر اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ دوسرے ہی لمحے میں ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے ریوالتور اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

”تم..... تم..... کون ہو۔“ عورت نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

”وہی پرانا غوطہ خور..... پرویز.....!“

عورت نے ایک طویل سانس لی۔

دوسری جھڑپ

”میر کیا تم دھوکا کھا گئے۔ کیا تمہیں پہلے ہی سے مجھ پر شبہ نہیں تھا؟“ ڈالی نے کہا۔
 ”اسی وقت سے جب تم نے اس لڑکی کے وینٹی بیک میں پستول کی موجودگی کا تذکرہ کیا
 میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مرنے والا تمہارے ہی ہاتھوں ختم ہوا تھا۔ پھر تم زہر کی شیشی میرے
 بے میں ڈال گئی تھیں، تاکہ میں.....!“

”تم نشے میں تو نہیں ہو۔“ ڈالی بول پڑی۔ ”یہ سب بکواس ہے۔ تم نے ابھی جو کچھ کہا
 اس میں ذرا برابر بھی سچائی نہیں ہے۔ میں آخر اسے زہر کیوں دینے لگی۔“

”اپنے مددگاروں کی خاطر۔“

”میرا کوئی مددگار نہیں ہے۔“

”پھر تم یہاں کیوں نظر آ رہی ہو۔“

”بس یونہی مجھے ایڈونچر کا شوق ہے۔“

”اگر میں تمہیں نیچے دھکیل دوں تو کیسی رہے؟“

”کک..... کیوں.....!“ ڈالی ہلکائی۔

”بس یونہی..... ایڈونچر کی خاطر۔ میں بھی ایڈونچر کا عاشق زار ہوں۔“

”تمہیں میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔ میرا خیال ہے کہ تم ان لوگوں سے تعلق نہیں رکھتے۔“

”پھر میرا تعلق تمہارے مددگاروں سے ہوگا۔“

ڈالی کچھ نہ بولی۔ لاری کی رفتار کم ہو گئی۔ حمید سوچنے لگا کہ کہیں نیچے والوں نے آواز نہ
 نہ لی ہو۔ ویسے لاری کا انجن تو اتنا شور مچا رہا تھا کہ ان کی آوازوں کے سن لئے جانے کا
 مکان نہیں تھا۔

حمید نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ بھائی نہ دیا لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ وہ
 آبادی میں نہیں ہیں۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ لاری کسی طرف مڑ رہی ہے۔ ویسے اگر وہ اٹھ کر
 بیٹھ سکتا تو اس کی ہیڈ لائٹس میں کم از کم یہ تو دیکھ ہی سکتا تھا کہ یہ سفر کس علاقے میں کیا جا رہا
 ہے۔ رام گلدھ اس کا بھی کئی بار کا دیکھا ہوا تھا۔

کچھ دیر تک دونوں ہی خاموش رہے پھر ڈالی نے کہا۔ ”تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”ظاہر ہے کہ تمہارے سات آدمی نیچے موجود ہیں۔“ حمید بولا۔

”تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ میں ان سے واقف نہیں ہوں۔“

”پھر کیا تم یہاں لیٹی موٹو پھیلیاں کھا رہی تھیں۔“

”نہیں..... میں نے چند آدمیوں کو آج گفتگو کرتے سنا تھا وہ یہاں سے کسی کو زہر

لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

”کیا تم انہیں پہلے سے جانتی تھیں؟“

”تمہیں اس سے کیا سروکار..... لیکن میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر حمید نے پوچھا۔ ”وہ کسے پکڑ کر لے جا رہے ہیں؟“

”میں یہ بھی نہیں جانتی..... مجھے تو ان کی قیام گاہ معلوم کرنی ہے۔“

”کیوں؟“

”تمہیں اس سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔“

”کیوں نہ ہونا چاہئے۔ کیا وہ ساتوں میرے ساتھی نہیں ہیں۔“

”نہیں.....!“ ڈالی کی آواز میں خوف تھا۔

”ہاں میری مکھن کی مورتی۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

”میرے بھی مددگار ہیں۔“ ڈالی کی کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

”ہوں گے۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔ ”بہتر ہے کہ تم انہیں اسی وقت بلا لو۔“

ہوسکتا ہے کہ تم کو کچھ دیر بعد کسی دیگ میں ڈالی کو بھون ڈالا جائے۔“

ڈالی کچھ نہ بولی، البتہ وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ حمید نے کہا۔ ”تم اب تک مجھے

دیتی رہی ہو۔“

لاری کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔ وہ شاید مڑنے ہی کے لئے آہستہ چلنے لگی تھی۔
 ”ہاں..... اب بتاؤ تم کیا کہہ رہی تھیں۔“ حمید دوبارہ لینتا ہوا بولا۔
 ”تم حقیقتاً کون ہو؟“

”حقیقتاً میں ڈیم فول ہوں اور اس فکر میں ہوں کہ کسی طرح پولیس کو مطمئن کر سکوں!
 سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا جغرافیہ کیا ہے۔“
 ”اگر تم ان لوگوں سے تعلق نہیں رکھتے تو یہاں نظر کیوں آ رہے ہو۔“ ڈالی نے حمید
 جملہ دہرایا۔

”ایڈوئچر، مائی سویٹ پی ہنی ڈیو مایلڈ اسموک۔“

”کبھی کبھی تم گفتگو کرنے لگتے ہو۔“

”پتہ نہیں کب کیسے آدمیوں کا ساتھ ہو جائے۔ اسی لئے میں بھانت بھانت کی بولی
 ماہر ہوں۔“

لاری کی رفتار پھر سست ہونے لگی تھی۔ بلاآ خروہ رک ہی گئی۔

پھر کھڑکی کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ حمید خاموش ہی رہا۔ ڈالی کو بھی جیسے
 سو نگہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد حمید نے سر اٹھایا۔ یہاں چاروں طرف جھاڑیوں اور گھنے درختوں کے
 بکھرے ہوئے تھے۔ ایک جگہ خشک لکڑیوں کے ڈھیر سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور
 وجہ سے کم از کم اتنی جگہ تو اچھی طرح روشن ہو گئی جہاں وہ ساتوں فریدی سمیت خاموش کھڑے
 تھے۔ فریدی اب ہوش میں نظر آ رہا تھا لیکن اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے
 ”ارے..... تو یہ تمہارا ساتھی تھا۔“ ڈالی نے ایک طویل سانس لی۔

لاری ایک گھنیرے درخت کے نیچے کھڑی کی گئی تھی جس کی شاخیں اس کی چھت پر
 ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ دونوں دیکھ لئے جانے کے احتمال سے بے پروا سر اٹھائے دیکھا
 تھے۔ دفعتاً ایک طرف جھاڑیوں سے ایک نقاب پوش نمودار ہوا۔

اسے دیکھ کر وہ ساتوں الگ ہٹ گئے۔ نقاب پوش فریدی کے سامنے کھڑا اسے گھورتا
 پھر بولا۔ ”زویا کہاں ہے؟“

”جہاں بھی ہو گی باخیریت ہو گی۔ تم مطمئن رہو۔“ فریدی نے مسکرا کر جواب دیا۔

”زویا..... زویا.....!“ ڈالی مضطربانہ انداز میں بڑبڑائی۔ ”یہ تو اسی لڑکی کا نام تھا۔“

”خاموش رہو۔“ حمید نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف نقاب پوش فریدی سے کہہ رہا تھا۔ ”اگر تم نے زویا کا پتہ نہ بتایا تو میں
 ہی اسی الاؤ میں بھون کر رکھ دوں گا۔“

”بر فیلے میدانوں میں جب ہم سفید بھیڑیوں کا شکار کرتے ہیں تو آگ ہمارے لئے
 نبت سے کم نہیں ہوتی۔“ فریدی کا جواب تھا۔

نقاب پوش نے ہاتھ اٹھایا۔ شاید وہ فریدی کے منہ پر تھپڑ مارنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن
 اسے ہی لمحے میں فریدی کے دونوں پیر اس کے سینے پر پڑے اور وہ دور جا پڑا۔

”میرے خدا۔“ ڈالی آہستہ سے بولی۔ ”کتنا پھر تیتلا ہے۔“

پھر ان ساتوں نے فریدی پر یلغار کر دی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے
 لیکن حمید ششدر رہ گیا کیونکہ وہ ابھی تک اس سے بے خبر تھا کہ فریدی صرف پیروں سے
 لڑ سکتا ہے۔ وہ اچھل اچھل کر انہیں لائیں رسید کر رہا تھا اور ان میں سے کوئی بھی ابھی تک
 ہاتھ بھی نہیں لگا پایا تھا۔ ڈالی نے حمید کو جھنجھوڑ کر کہا۔ ”تم یہاں پڑے کیا کر رہے ہو۔“
 ”عیش کر رہا ہوں۔ مزہ آ رہا ہے۔ ایسی لڑائیاں روز روز نہیں نظر آتیں۔ ذرا دیکھو
 شہر کو۔ ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود انہیں کس طرح ٹھیک کر رہا ہے۔“

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ وہ بیچارہ تنہا ہے۔ الاؤ میرا پستول مجھے دو۔ میں ان
 بکھلوں کی۔“

”ظہرو! جلدی نہ کرو۔“

”کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی خطرناک چوہن ہو سکتی ہے۔“

”ارے..... یہ بھی کوئی پچویشن ہے۔ بات تو تب تھی کہ یہ اس کے پیر بھی باندھ دیے۔“
 ”اوہ..... دیکھو..... اُس نقاب پوش نے ریوالور نکال لیا ہے۔“ ڈالی حمید کو جھجھو
 بولی۔ دوسرے ہی لمحے میں حمید کے ریوالور سے شعلہ نکلا اور نقاب پوش چیخ مار کر زمین پر
 گیا۔ گولی اس کے داہنے ہاتھ پر لگی تھی۔ پھر وہ سب بھی بوکھلا گئے جو فریدی پر قابو پا۔
 کوشش کر رہے تھے۔
 ”خبردار! کوئی بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے۔“ حمید دہاڑا۔ ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ
 وہ سب جہاں تھے، ہیں رک گئے۔“

”سلیم کے ہاتھ کھیل دو۔“ حمید نے پھر انہیں للکارا۔ ”جلدی کرو..... تم سب
 نظروں میں ہو۔ ایک کو بجھ، زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“
 نقاب پوش نے زمین سے اٹھنا چاہا لیکن حمید نے ایک ہوائی فائر بھی کر دیا۔ اُس
 دانست میں ہوائی فائر کیا تھا لیکن اتفاق سے گولی نقاب پوش کی فلت ہیٹ پر پڑی اور وہ
 کراؤ میں جا پڑی..... نقاب پوش کھڑا سر سہلا رہا تھا۔
 ”چلو..... جلدی کھولو.....!“ حمید پھر دہاڑا۔

”تم کون ہو۔“ نقاب پوش چیخ کر کہا۔ اُس کے داہنے ہاتھ سے خون ٹپک رہا تھا
 ”پیراڈائیز میں دو شکاریوں کے علاوہ تیسرا کون تھا۔“ حمید نے جواب دیا۔
 وہ اُن لوگوں کی طرف مڑ کر چنگھاڑنے لگا جو دوسرے شکاری کو اپنے ساتھ لگائے
 دفعتاً حمید نے فریدی کو نقاب پوش پر چھلانگ لگاتے دیکھا۔ اُسے اُس کے دونوں
 بھی آزاد نظر آئے۔ شاید اسی جدوجہد کے دوران میں رسی کی بندش ڈھیلی ہو گئی تھی اور
 ہاتھ کھول لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

حمید نے بھی لاری کی چھت سے چھلانگ لگائی۔ دوسری طرف نقاب پوش نے
 جھکائی دے کر ایک طرف بھاگ نکلا تھا۔ لیکن وہ ساتوں اب بھی وہیں کھڑے تھے
 نظریں حمید کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور پر تھیں۔ فریدی نقاب پوش کے پیچھے دڑا

”ڈالی۔“ حمید نے آواز دی۔ ”آؤ..... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“
 ”اس سے کیا فائدہ ہوگا۔“ اُن میں سے ایک آدمی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ تو
 ہی گیا۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔“
 ”وہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔ تم اس کی فکر مت کرو۔“ حمید نے جواب دیا۔
 ڈالی لاری کی چھت سے پہلے ہی اتر آئی تھی۔ حمید کے آواز دینے سے قریب آ گئی۔
 ”تم ذرا پستول لے کر ان پر نظر رکھو۔“ حمید نے اس کا پستول اُسے واپس کرتے ہوئے
 ”تاکہ میں انہیں پیک کر سکوں۔“

ڈالی نے پستول کا رخ اُن کی طرف کر دیا اور حمید ہر ایک کی ٹائی کھول کر اسی سے اُس
 ہاتھ باندھنے لگا۔ دس منٹ کے اندر ہی اندر اس نے ساتوں کے ہاتھ باندھ کر انہیں ذبح
 جانے والے مویشیوں کی طرح زمین پر گرادیا۔
 ”خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ پڑے رہو۔“ اس نے کہا اور اپنی جیب میں تمباکو
 پاؤچ ٹٹولنے لگا۔
 ”ہم..... بالکل.....!“ ایک آدمی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن حمید نے ٹھوکر مار کر اُسے
 بوٹ کر دیا۔

”اب ان کا کیا کرو گے؟“ ڈالی نے پوچھا۔
 ”کسی اونچی چٹان سے نیچے پھینک دیں گے۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا۔
 ”تم قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے۔“
 ”اٹھاؤ! تم اس طرح بول رہے ہو جیسے قانون کی نوا سی یا بھتیجی ہو۔“
 ”انہیں میرے حوالے کر دو۔“

”یا تمہیں ان کے حوالے کر دوں۔“
 ”میرا پستول اس وقت میرے ہاتھ میں ہے یہ نہ بھولو۔“
 ”کوہ.....!“ حمید نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

”اب ایک ایک کر کے انہیں اٹھاؤ اور لاری میں لے چلو۔“ ڈالی نے حکمانہ لہجے میں کہا۔
 ”ب..... بہت اچھا۔“ حمید خوفزدہ سی آواز میں ہکھلایا۔ ”لیکن پھر ایک بیک ڈالی کے
 پر سے دوسری طرف دیکھتا ہوا ہڈ مسرت لہجے میں چینا۔ ”پکڑ لیا نا.....!“
 ڈالی بے ساختہ ادھر مڑی لیکن دوسرے ہی لمحے میں حمید کا ہاتھ اس کے ریوالبورڈ
 ہاتھ پر پڑ چکا تھا۔

ڈالی کسی پھری ہوئی شیرنی کی طرح پلٹ پڑی۔ مگر پستول تو اب حمید کی جیب میں پہنچ چکا تھا
 ”راوی اس کہانی کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب کالے دیو نے نیلم پری کے ہاتھ
 پستول چھین لیا تو.....!“ حمید نے کہا۔ وہ کھانسنے لگا اور ساتھ ہی ڈالی کے حملے بھی روکنا کہا
 تھا۔ یہ کھیل چند منٹ تک جاری رہا پھر ڈالی تھک ہار کر پیچھے ہٹ گئی وہ مری طرح بانپ رہی تھی
 ”تمہیں پچھتانا پڑے گا۔“ وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔
 ”میں پچھتاوے کا عادی ہو چکا ہوں۔ کیونکہ مجھے دن میں سرکاری..... ار..... ملا
 یہ ہے کہ مجھے دن میں کئی بار پچھتانا پڑتا ہے..... آؤ..... قریب آؤ۔“ حمید اس کا ہاتھ پکڑ کر
 طرف کھینچتا ہوا بولا۔
 ”چھوڑ دو مجھے۔“

”اس رات کو یاد گار بنانے کیلئے ہم رہنا چاہیں گے۔ ریٹم ٹیم..... ریٹم..... ریٹم.....
 ٹیم..... ٹیم..... ٹی..... ٹم۔“ وہ اسے اپنی طرح کھینچ کر سچ مچ ناچنے لگا تھا۔
 ”ہٹو..... گدھے..... کمینے..... مجھے چھوڑ دو..... ورنہ۔“ ڈالی اس کی گرفت سے
 کے لئے چلتی رہی لیکن حمید ناچتا ہی رہا۔ یہی نہیں بلکہ وہ قیدیوں سے کہہ رہا تھا ”تم
 گاؤ..... گاؤ ورنہ تمہاری شکلیں ایسی کر دوں گا کہ برسوں پہچانے نہ جاسکو گے۔“
 ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ ڈالی دانت پیس کر بولی۔
 ”اگر تم یہی سمجھتی ہو تو تمہارا غصہ فضول ہے، حقیقتاً میرا دماغ الٹ گیا ہے اور اب نا
 چتے تمہیں لے کر کسی کھڈ میں کود جاؤں گا۔ تمہاری جیلی بن جائے اور میرا جام۔“

”ارے..... بچاؤ..... بچاؤ۔“ ایک بیک ڈالی بوکھلائے ہوئے انداز میں چیخنے لگی۔
 ”ارے..... بچاؤ..... بچاؤ۔“ حمید بھی بالکل اسی انداز میں چیخا اور پھر دفعتاً انہوں نے
 رلی زمین پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ جھاڑیاں سرسرائیں اور دوسرے ہی لمحے
 فریدی اُن کے سامنے کھڑا انہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
 حمید اسی طرح ناچتا رہا۔

”بچائیے..... مسٹر سلیم..... مجھے بچائیے۔“ ڈالی تقریباً روتی ہوئی بولی۔
 ”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ فریدی ان کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ حمید خاموشی سے ڈالی کو ادھر
 مڑھکتا پھر رہا تھا۔ فریدی نے زبردستی انہیں الگ کیا۔ حمید آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”میں
 ام لے رہا ہوں۔ یہ لڑکی انہیں کی ساتھی ہے۔“
 ”یہ سراسر بکواس ہے۔“ ڈالی نے کہا۔
 ”چلو.....!“ فریدی حمید کی گردن پکڑتا ہوا بولا۔ ”انہیں لاری میں لے چلو۔“
 حمید ایک ایک کو ٹھوکر مار کر اٹھانے لگا اور تھوڑی دیر بعد وہ سب لاری میں پہنچ گئے۔ حمید
 راستے کا اندازہ تھا لیکن خود اس نے گاڑی ڈرائیو کرنے کی پیش کش نہیں کی کیونکہ وہ ڈالی پر
 نظر رکھنا چاہتا تھا۔

فریدی ڈرائیو کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ حمید اور ڈالی قیدیوں کے ساتھ رہے۔ فریدی نے بتایا
 کہ وہ نقاب پوش کو پکڑنے میں ناکام رہا تھا۔
 حمید نے اُسے جرمن زبان میں ڈالی کے متعلق بتاتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ اتنی آسانی
 سے ان کے ہاتھ کیسے آگئے تھے۔“
 ”بس اتفاق۔“ وہ کافی جوش میں نے منگوائی تھی نشہ آور کردی گئی تھی اور یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا
 کہ تم اپنی بیانی بھرے بغیر اٹھ کر رقصہ کی طرف چلے گئے تھے۔ مگر تعجب ہے کہ انہوں نے
 نہیں بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔“
 دفعتاً فریدی نے پورے بریک لگا دیئے اور لاری ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ سامنے

فائر برہم ہوتے رہے تھے۔ حمید نے بھی اندازاً دو تین راؤنڈ چلائے۔ لیکن فریدی کے خیال کے مطابق وہ گولیاں ضائع کرنا ہی تھا۔ اچانک یکے بعد دیگرے دھماکے ہوئے اور لاری پچھلے ہیں کے بل سڑک پر گھسنے لگی۔ حملہ آوروں نے اُس کے دونوں پچھلے پہرے بیکار کر دیئے تھے۔

مجدور لاری روک دینی پڑی لیکن حمید باہر قدم بھی نہیں رکھ سکا تھا کہ اس پر کھانسیوں کا بارہ پڑ گیا۔ صرف وہی نہیں بلکہ لاری میں بیٹھے ہوئے سبھی آدمی بُری طرح کھانسنے لگے تھے۔ رضا میں ایک بوجھل سی مूर्قص کرتی پھر رہی تھی۔ ایسی بوجھل سے دم گھٹتا ہوا سانس ہو رہا۔ ڈالی کی گرفت حمید کے بازو پر سخت ہوتی گئی۔ شاید وہ کھانسنے کھانسنے تشنجی کیفیت کا شکار بنی تھی۔ حمید فریدی کو بھی کھانسنے سن رہا تھا۔

حمید کا سر چکرا رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر بعد اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ اپنے ذہن کو الٹ میں نہ رکھ سکے گا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہونے لگے۔ پھر فضا میں چکرانے والی بو کا احساس بھی فنا ہو گیا۔ اس کا جسم بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

پھر دوبارہ جب اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت واپس آئی تو وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکا کیونکہ اس کا سارا جسم رسی سے جکڑا ہوا تھا۔ وہ زبان بھی نہ ہلا سکا کیونکہ منہ میں حلق تک پڑا ٹھسا ہوا تھا اور سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ سفر هنوز جاری ہے۔ لیکن گاڑی میں اندھیرا تھا۔ ویسے بے معلوم ہی کیا جاسکتا تھا کہ گاڑی بہت زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی طرف جارہی ہے۔ حمید فریدی اور ڈالی کے متعلق سوچنے لگا۔ کیا وہ بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ اس نے کروٹ لینے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ چت پڑے رہنے سے اس کی پیٹھ بہت ٹھنڈ سے دھکنے لگی تھی۔ اس نے سوچا ممکن ہے وہ کسی لاری کی پتلی سی سیٹ پر پڑا ہو اور کوٹ لینے ہی نیچے جا گرے۔ رسی بُری طرح اس کے جسم میں چھ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کس طرح وہ بیہوش ہو گیا؟ اُسے وہ بدبو یاد آئی۔ غالباً وہ کسی قسم کی گیس تھی۔ جس کے ذریعہ انہیں بیہوش کیا گیا تھا۔

سڑک پر تین آدمی اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ انہیں بچا کر لاری نکال لے جانا ناممکن تھا۔

وہ کون تھی

حمید کا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گیا اور ریو اور سمیت باہر آیا۔ شاید فریدی کے تو ریو اور تھا ہی نہیں۔ اُس نے بڑی تیزی سے گاڑی کی تمام روشنیاں گل کر دیں۔

”تڑاک..... تڑاک..... تڑاک۔“ تین گولیاں لاری کے مختلف حصوں سے ٹکر حمید نے ڈالی کا پستول فریدی کو دیتے ہوئے کہا۔ ”سنجھائے۔“

”اوہ..... شکریہ..... مگر خواہ مخواہ گولیاں صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“ باہر سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ”ورنہ کوئی بھی زندہ نہ بچے۔“

”تم شوق سے فارنگ کرو۔“ فریدی نے جواب دیا۔ ”ہر کھڑکی پر تہرا اسی ایک موجود ہے۔“

”نہیں..... نہیں۔“ ساتوں قیدی بیک وقت چیخے اور فریدی نے ہتھیار لگایا۔

حمید نے محسوس کیا کہ ڈالی کانپ رہی ہے۔ اُس نے حمید کا بازو پکڑ لیا تھا۔

”بس دم نکلنے لگا۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔ ”ایڈونچر کے عاشقوں کے لئے راتقلیل نہیں اگلتیں۔“

”میں تو ہنس رہی تھی۔“ ڈالی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کیا تم سمجھتے تھے کہ میں رہی ہوں۔“

”ذرا زور سے ہنسو ڈیر تاکہ وہ گولیاں چلانے کی بجائے شاعری کرنے لگیں۔“

پھر کچھ گولیاں لاری سے ٹکرائیں اور قیدی پھر چیخنے لگے اور اسی اثناء میں لا حرکت میں آ گئی۔ مگر فریدی نے اس کی ہیڈ لائٹس نہیں روشن کی تھیں۔

وں کو کچا ہی چبا جائے گی۔

”یہ جو کچھ بھی ہوا ہے۔“ وہ گرج کر بولی۔ ”اس کی سو فیصدی ذمہ داری پرویز پر ہے۔“
”وہ کس طرح مائی بیٹھلائی؟“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”نٹ اپ..... تمیز سے گفتگو کرو۔“

”ظہر و.....!“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ پھر ڈالی سے کہنے لگا۔ ”میں نہیں سمجھا تم کیا کہنا
بتی ہو۔“

”میں نے پرویز سے کہا تھا کہ ان قیدیوں کو میرے حوالے کر دو۔ مگر یہ حضرت شرارت
ہو گئے۔“

”تم کیا کرتیں ان قیدیوں کو.....!“

”پولیس کے حوالے کر دیتی۔“

”یہ کام ہم بھی کر سکتے تھے؟“

”میرے کام کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔“ ڈالی نے کہا۔

”اُور..... ٹھیک.....!“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”اب میں سمجھ گیا۔ یہ انہیں آنکھ مار کر مار

ا۔ نہ کہیں جنازہ اٹھتا اور نہ کہیں مزار ہوتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔“

”پھر تم بدتمیزی کرنے لگے۔“ ڈالی غرائی۔

”یہی تو مصیبت ہے۔“ حمید فریدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”بھائی کی

لگی میں..... میں بدتمیزی نہیں کر سکتا ورنہ تم دیکھتیں۔“

”خاموش رہو۔“ فریدی نے ڈانٹا۔

”بھائی سلیم۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”مجھے بور نہ کرو۔ یہ ہماری زندگی کا آخری دن ہے۔

مکان ہے یا رات۔“

ڈالی انہوں نے کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔ آواز شاید برابر ہی کے کمرے سے آئی

لہذا دروازہ جو اُن دونوں کے درمیان حائل تھا مقفل تھا۔ فریدی نے آگے بڑھ کر اسے

کچھ دیر بعد پھر تکلیف کا احساس ہونے لگا اور اس کا ذہن پھر تاریکیوں میں ڈوب گیا۔
دوسری بار ہوش آنے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ اب وہ اپنی جگہ سے حرکت
بھی کر سکتا تھا اور ضرورت پڑنے پر فلمی گیت بھی گاسکتا تھا۔ کیونکہ نہ تو اب اس کا جسم رے
جکڑا ہوا تھا اور نہ ہی منہ میں کپڑا موجود تھا۔ کمرے میں ہلکی روشنی کا ایک بلب روشن تھا۔
فریدی اور ڈالی بھی نظر آئے۔ فریدی ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا سگار پی رہا تھا اور
ابھی بیہوش تھی۔ حمید بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کمرے میں فرنیچر قسم کی کوئی چیز نہیں تھی؟
دیواروں پر تصویروں کے متعدد فریم نظر آ رہے تھے۔

فریدی حمید کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور حمید ڈالی کی طرف دیکھ کر سر ہلانے لگا۔

”یہ کہاں آچھنے!“ حمید نے کچھ دیر بعد کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اب ہم اس آدمی کی قید میں ہیں جس نے زویا کو اغواء کر لیا تھا۔“

”اور مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ زویا کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

حمید نے ایک طویل سانس لیکر ڈالی کے چہرے پر نگاہ گاڑ دی۔ پھر فریدی سے

”کیا میں اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کروں۔“

”کیا ضرورت ہے۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔

”یعنی یہ یوں ہی بیہوش پڑی رہے؟“

”یہی مناسب ہے ورنہ تم میری کھوپڑی کام کرنے کے قابل نہ رہنے دو گے۔“

حمید اٹھ کر ڈالی کے پاس پہنچ گیا اور فریدی اسے غصیلی نظروں سے دیکھتا رہا۔

کچھ نہیں..... حمید نے اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔

فریدی سگار کے کش لیتا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے گھر ہی کے کسی کمرے

بیٹھا ہو۔ چہرے پر تشویش کا شائبہ تک نہیں تھا۔ آنکھوں سے لا پرواہی مترشح تھی۔

کچھ دیر بعد حمید ڈالی کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھ بیٹھی پھر کچھ دیر بعد ایسا معلوم ہونے لگا

وایں رہو۔“

”نرنا سراغ رساں۔“ حمید نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”ہم اس کمرے میں جانا چاہتے ہیں، کسی کو ہماری مدد کی ضرورت ہے لہذا اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کرو۔

رکاری سراغ رساں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔“

”اوہ..... ہمیر پن۔“ ڈالی نے بیساختہ کہا اور کنجی کے سراغ کی طرف دیکھنے لگی۔

”کوشش کرو۔“ فریدی نے ہمیر پن اُسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

ڈالی ہمیر پن لے کر قفل پر جھک پڑی۔ لیکن تقریباً پانچ منٹ تک کوشش کرنے کے بعد وہ بھی قفل کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

”چلو..... ادھر ہٹو..... ہمیر پن مجھے دو۔“

فریدی نے ہمیر پن لے کر حمید کی طرف بڑھا دیا اور حمید نے قفل کھولنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگائے۔

”اس طرح قفل کھول لینا چوروں اور اٹھائی گیسوں کا کام ہوتا ہے۔“ ڈالی بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑائی اور وہ دونوں ہنسنے لگے۔ پھر فریدی نے دروازہ کھولا۔ اُس کمرے میں نیلے رنگ کا بلب روشن تھا۔ فرنیچر معمولی قسم کی ایک میز، دو کرسیوں کا ایک شلف اور ایک بلیک پر مشتمل تھا۔ بلیک پر ایک بوڑھا آدمی سوتا نظر آیا۔ یہ کچھ بیمار سا معلوم ہو رہا تھا۔ فریدی نے ایک اچھتی ہوئی کانٹھ چاروں طرف ڈالی اور آہستہ آہستہ بلیک کی طرف بڑھنے لگا۔

دھنسا بوڑھا جاگ پڑا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن تینوں کو دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم کون ہو؟“

”چور.....؟“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”لیکن تم شور نہیں مچاؤ گے.....

بیکلی اور آخری وارننگ ہے۔“

”چور.....؟“ بوڑھے نے آہستہ سے دہرایا اور نہ جانے کیوں اس کے چہرے پر مسرت کی لہر نظر آنے لگی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور آہستہ سے بولا۔ ”بھائی چور مجھے یہاں سے کسی طرح

ہلانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر جھک کر وہ کنجی کے سراغ کو دیکھنے لگا۔“ طرف کمرہ ہی تھا اور آواز اسی کمرے سے آرہی تھی لیکن کراہنے والا کنجی کے سراغ سے فاصلہ آ سکا۔ فریدی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شاید اسے کسی چیز کی تلاش تھی۔

”کیا تم مجھے تھوڑی دیر کے لئے ہمیر پن دے سکتی ہو۔“ اس نے ڈالی سے پوچھا۔

”کیوں.....؟“ ڈالی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”پتہ نہیں کس گدھے نے تمہیں منگے سراغ رسانی کے لئے منتخب کیا تھا۔“

”کیا مطلب.....؟“ حمید یک بیک اچھل پڑا اور ڈالی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی۔

”آپ قائم آباد برانچ کی ایک سب انسپکٹر ہیں۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔

”مونا گراہمس.....!“

”اٹھا۔“ حمید بانٹھیں پھاڑ کر بولا۔ ”تب تو ان کے کباب بے حد لذیذ ہوں گے۔“

”ہمیر پن۔“ فریدی ڈالی کی طرف ہاتھ بڑھا کر خشک لہجے میں بولا۔

ڈالی نے سر سے ہمیر پن نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے کب سے جانتے ہو؟“

”اسی رات سے جب تم نے اپنے کاغذات پیراڈائیز کے پارک میں ایک جگہ چھپائے تھے۔ اس لئے چھپائے تھے کہ کہیں وہ رام گڑھ کے سراغ رسانوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔“

اس کارنامے میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھیں۔“

”کیسا کارنامہ.....؟“

”انجین۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”تم کون ہو۔“ ڈالی خوفزدہ آواز میں بولی۔

”شکاری..... تمہارے کاغذات میرے پاس محفوظ ہیں۔“

”تمہارے پاس کیوں؟“

”میں نے انہیں وہاں نہیں رہنے دیا تھا جہاں تم نے چھپایا تھا۔“

”تمہیں اس کے لئے بھگتنا پڑے گا۔ یہ قانوناً جرم ہے کہ تم کسی سرکاری سراغ رساں

نکال دو۔ اس کام کی منہ مانگی قیمت ادا کروں گا۔“

”اوہ..... تو کیا تمہیں کسی نے قید کر رکھا ہے؟“

”ہاں..... ایک احسان فراموش کتے نے۔ تم مجھے کسی طرح یہاں سے نکال دو۔ ویلے میرا خیال ہے کہ تمہیں یہاں کوئی قیمتی چیز نہ مل سکے گی۔ کیونکہ یہ صرف میرا قید خانہ ہے۔“

”یہ شاید پاگل ہے۔“ فریدی نے حید کی طرف مڑ کر کہا۔

”نہیں میں قطعی صحیح الدماغ ہوں۔“ بوڑھے کے لہجے میں احتجاج تھا۔

”اچھا تو تم یہی بتا دو کہ تم اس وقت کہاں ہو۔ کس شہر..... کس محلے میں اور اس عمارت کیا نام ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”عمارت یا محلے کا نام نہیں بتا سکتا۔ البتہ یہ قائم آباد ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔

فریدی نے ایک طویل سانس کھینچی اور پھر پوچھا ”تمہارا نام؟“

”ناصر..... لوگ مجھے ڈاکٹر ناصر کہتے ہیں۔“

”تمہیں کس نے قید کیا ہے؟“ ڈالی پوچھ بیٹھی۔

”اسے یہاں سے لے جاؤ۔“ فریدی نے حید سے کہا۔

”کیا؟ قطعی نہیں۔“ ڈالی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ ساری

جیل میں سزا دوں گی۔“

”ارے بس آؤ بھی۔“ حید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسی کمرے میں لے آیا جہاں

وہ کچھ دیر پہلے تھے۔

”تم لوگوں کے ساتھ ذرہ برابر بھی رعایت نہیں کی جائے گی۔“ ڈالی دانت پیس کر بول

”اس سے پہلے ہی میں تمہارے کباب لگاؤں گا۔ ہم دونوں شکاری آدم خور ہیں۔“

”تم اپنے ہاتھوں اپنی قبریں کھود رہے ہو۔“

”تب تو ہم کمال کر رہے ہیں۔ تم کوئی ایسی مثال نہیں پیش کر سکتیں جب کسی نے اپنا

کھودی ہو۔ ویسے تم خواہ مخواہ پور ہو رہی ہو۔“

حید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کسی نے بائیں جانب والا دروازہ کھولا۔

آنے والے چار آدمی تھے اور ان کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آرہے تھے۔ لیکن دو ازے ہی پر ٹھک گئے۔ شاید ان کی حیران آنکھیں فریدی کو تلاش کر رہی تھیں۔

”تیسرا کہاں ہے؟“ ان میں سے ایک نے گرج کر پوچھا۔

اور حید کو ایسا محسوس ہوا جیسے دوسرے کمرے میں مگر اسٹانا چھا گیا ہو۔ وہ سوچ رہا تھا کہ

مگر ڈالی اس دروازے کی طرف نہ دیکھنے لگے جسے کھول کر وہ دوسرے کمرے میں پہنچے

مگر ڈالی نے اس قسم کی کوئی حماقت سرزد نہیں کی۔ حید ان چاروں کو بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ

دیکھ رہا تھا کیونکہ یہ انہیں نیم مردہ رقاصوں میں سے تھے جنہیں وہ پیراڈائیز میں دیکھ چکا

ڈالی بھی کم متحیر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ دفعتاً ایک آدمی اور اندر آیا۔ یہ وہی منتظم ناگری تھا

کے ساتھ حید نے ایک بار پیراڈائیز میں کافی پی تھی۔

”اوہ..... مسٹر ناگری۔“ حید نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

”ہاں..... میں ہی ہوں۔“ ناگری خشک لہجے میں بولا۔ ”صبح ہونے سے پہلے ہی تم

لا..... آر..... وہ کہاں ہے۔“ ناگری چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر ہاتھ ہلا کر دہانڈا۔ ”وہ

اں ہے۔ ورنہ میں تمہاری دھجیاں اڑا دوں گا۔“

”مائی ڈیئر..... مسٹر ناگری یا جو کچھ بھی تمہارا نام ہو۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ انرجین

تین گلاس پی گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دھواں بن کر روشندانوں سے باہر نکل گیا۔“ حید نے

بالور ڈالی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”کیوں ڈارلنگ.....؟“

ڈالی جھلائی اور انتہائی غصے کے عالم میں اس نے ناگری سے کہا۔ ”وہ اُس کمرے میں ہے۔“

پہنچیں الفاظ تھے یا ناگری کیلئے بجلی کا ہنر۔ کیونکہ وہ بیساختہ اچھل کر دروازے سے جا لگا۔

زویا کا راز

ہاگری کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اپنے ریوالور اسے دے دو۔“

”پہلے تم اپنا نکالو۔“ حمید نے کہا۔

”میرے پاس نہیں ہے۔“

”میں تلاشی لئے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ تم اپنا داہنا ہاتھ استعمال رکھو گے کیونکہ وہ پہلے ہی زخمی ہو چکا ہے۔ لیکن بائیں ہاتھ کو کون روک سکے گا۔“

”تم میری جامہ تلاشی لے سکتے ہو۔“ ناگری نے کہا۔

حمید نے آگے بڑھ کر اُسے نیچے سے اوپر تک ٹٹولا اور پھر اس کے دوسرے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنے ریوالور اس کے حوالے کر دیئے۔ ڈالی خاموش کھڑی اپنا نچلا لے چلا رہی تھی۔

”انہوں نے ریوالور میرے حوالے کر دیئے ہیں۔“ حمید نے بلند آواز میں کہا۔

”دوسرے ہی لمحے میں دروازہ کھلا اور فریدی کمرے میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے اس کی ناگری کے داہنے ہاتھ پر پڑی جو بینڈیج سے ڈھکا ہوا تھا۔

”تو وہ نقاب پوش تم ہی تھے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”کام کی بات کرو۔“ ناگری خشک لہجے میں بولا۔ ”چیک لو گے یا کیش؟“

”کیسا چیک اور کیسا کیش۔“ فریدی نے حیرت ظاہر کی۔ ”میں بالکل نہیں سمجھا۔“

”کیا مطلب.....؟“ ناگری بوکھلا گیا۔ اس نے مضطربانہ انداز میں حمید کی طرف دیکھا۔

لانی دور ریوالور تو جیبوں میں ڈال لئے تھے اور دور ریوالور میں سے ایک کا رخ ناگری کی طرف کر دیا تھا اور دوسرے کا اس کے چاروں ساتھیوں کی طرف۔“

”دھوکا۔“ ناگری آہستہ سے بڑبڑایا۔

”مجبوری ہے دوست۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”اتفاق سے یہاں ایک سرکاری سراغ مال بھی موجود ہے۔ ورنہ میں اتنا اچھا بزنس کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اس سے ملو یہ ہیں

وہ اس طرح دروازے کو ہلا رہا تھا جیسے اُسے خبر ہی نہ ہو کہ وہ دوسری طرف سے ہلا کر دیا گیا ہے۔ دفعتاً وہ چیخنے لگا۔ ”اے..... باہر آؤ..... ورنہ میں ان دونوں کو جان مار دوں گا۔“

”میں اس بوڑھے کا گلا گھونٹ کر تمہارا کھیل ہی اس وقت ختم کر دوں گا۔“ دوسری طرف سے فریدی کی آواز آئی اور ناگری سناٹے میں آ گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا جسم سے خالی ہو گیا ہو۔

”تم کون ہو.....؟“ اس نے کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ایک شریف آدمی..... جس کی بسا اوقات کا ذریعہ تم جیسے کینے لوگ بن جاتے ہو..... زویا کیلئے کتنی رقم دے سکو گے۔ اس اسٹیج پر اگر ہمارا سودا ملے ہو جائے تو زیادہ بہتر رہے گا ناگری نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں اور طرح ہانپ رہا تھا جیسے بہت دیر تک دوڑتا رہا ہو۔

”تم اپنا اندازہ بتاؤ کہ مجھے اس سلسلے میں کتنی رقم صرف کرنی چاہئے۔“ اُس نے کچھ دیر

”پچیس ہزار سے کوڑی کم نہ لوں گا۔“

”یہ بہت زیادہ ہے..... اچھا چلو دس ہزار پر معاملہ کرلو۔“

”پچیس ہزار.....!“ فریدی نے جواب دیا۔ ”ورنہ دوسری صورت میں ہم شاید اس

بھی زیادہ کما سکیں۔“

”چلو..... منظور ہے باہر آؤ۔“

”یوں نہیں..... تم سب اپنے ریوالور میرے ساتھی کے حوالے کر دو۔ میں اپنا ڈیوٹی تو نہیں ہوا

”ریوالور تو نہیں دیئے جاسکتے۔“

”تب پھر مجبوری ہے۔ تم بھی صبر کرو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ان لوگوں نے ضرور پی رکھی ہے۔“ ناگری چاروں رقاصوں کی طرف اشارہ کر کے
 ”ان کے دماغ قابو میں نہیں ہیں۔ یہ صرف میرے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ اگر میں
 میں حکم دے دوں تو تمہاری بوٹیوں کا بھی پتہ نہ چلے۔“

”اچھا تو انہیں حکم دے دو۔ میں بھی دیکھ لوں کہ اس مشروب میں کتنا زور ہے۔“ فریدی
 نے لاپرواہی سے کہا اور حمید سے بولا۔ ”ریوالور جیب میں رکھ لو لیکن اس دروازے پر اڑے
 ہو کوئی باہر نہ جانے پائے اور اگر کوئی باہر سے اندر آنے کی کوشش کرے تو اسے بے دخل
 لولی مار دینا۔ نہیں مس گراہمس تم احتجاج کرنے کے لئے منہ نہ کھولو۔“

حمید دروازے کے پاس جم گیا۔ لیکن اس نے ریوالور جیب میں نہیں ڈالے تھے۔
 ہاں وہ چاروں فریدی پر آ پڑے۔ ناگری نے انہیں حملہ کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ فریدی نے
 ناکی کپٹیاں سہلانی شروع کر دیں۔ جس کپٹی پر بھی گھونٹہ پڑا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شاید دس ہی
 من میں وہ چاروں فرش پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔

”آؤ.....!“ فریدی ناگری کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تمہاری لئے بھی میدان صاف ہے۔“
 ”کیوں خواہ مخواہ بات بڑھا رہے ہو چلو..... ایک لاکھ لے لو۔“

”ایک کروڑ پر بھی معاملہ طے نہیں ہو سکتا۔“ فریدی بولا۔ ”کیونکہ تم قاتل ہو۔ زویا کے
 نیا دوستوں کا خون تمہاری گردن پر ہے اور ہاں..... ہاں..... ٹھہرو کیا تم مجھے ڈاکٹر اسفندیار کا
 پتہ بتا سکو گے۔“

”وہ کسی سے نہیں ملتے۔“

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ بوڑھے ناصر نے اپنی زبان بند کر رکھی ہوگی۔“

”یہ قاتل ہے۔“ دوسرے کمرے سے بوڑھا چیخا۔ ”ڈاکٹر اسفندیار کا قاتل ہے اور مجھے
 ان نے سالہا سال اپنی قید میں رکھا ہے۔ زویا اسفندیار کی لڑکی ہے۔ ایک بہت بڑی دولت
 کا مالک۔ یہ اس سے شادی کر کے قانونی طور پر اس دولت پر متصرف ہونا چاہتا تھا۔“

”اور..... اسی لئے تم نے اتنے دنوں تک انتظار کیا تھا۔“ فریدی ناگری کی طرف دیکھ کر

مس مونا گراہمس قائم آباد کی ایک سرکاری جاسوس۔ یہ دراصل تمہاری انرجین کی فکر میں
 لیکن اس کے ساتھ ہی زویا کا قصہ نکل آیا۔“

”اوہ..... اسے جہنم میں جھونکو۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی کہ یہ کہاں گئی۔ میں تمہیں
 لگاتا ہوں۔ زویا کا پتہ بتا دو۔“

”نہیں پہلے میں اسے انرجین کے متعلق بتاؤں گا۔“ فریدی نے ڈالی کی طرف دیکھ کر
 کہا۔ ”ہاں مس گراہمس! انرجین ایک نشہ آور مشروب ہے۔ جو دماغ ماذف کر کے جم
 بجلیاں سی بھر دیتا ہے۔ اس کی پیلٹی کھلے عام کی جاتی ہے لیکن اس کا بڑا س اسی طرح ہوتا
 جیسے کوکین وغیرہ کا بیوپار کیا جاتا ہے۔ لوگ نیم مردہ رقاصوں کے کمالات دیکھ کر ان کی مد
 متوجہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں ان سے اتنی زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی، جتنی کہ اس مشروب۔
 بہر حال وہ ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور اس مشروب کی سب سے بڑی پہچان یہ
 کہ آدمی اس کا عادی ہو جانے کے بعد اس کے بغیر منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔ اور اگر وہ خود
 کر کے اسے ہاتھ نہ لگائے تو کسی کام کا نہیں رہ جاتا۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ
 چاق و چوبند رکھنے کے لئے اس مشروب کا استعمال جاری رکھے۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ ناگری نے کہا۔ ”انرجین بہت جلد بازار میں آ جائے گی
 ہو سکتا ہے لیکن وہ تمہارے اس مشروب سے بالکل مختلف ہوگی۔“

”ختم کرو۔“ ناگری ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں زویا کی قیمت چچاس ہزار لگا رہا ہوں۔
 ”کیوں! تمہارا کیا خیال ہے۔“ فریدی نے ڈالی سے پوچھا۔

”آپ ہر حال میں قانون کی مدد کیجئے سلیم صاحب۔“ ڈالی نے کہا۔
 ”دیکھا.....!“ فریدی نے ناگری کو مخاطب کیا۔ ”اب بتاؤ میں کیا کروں۔“

”ارے واہ.....!“ حمید گردن جھٹک کر بولا۔ ”گویا میرے ہاتھ میں ریوالور نہیں پائے ہیں
 ”میرے لئے وہ پناخوں سے بھی کمتر ہیں۔“

”شاید تم نے انرجین پی رکھی ہے۔“

بولا۔ ”تم چاہتے تھے کہ زویا بالغ ہو جائے تو تم کسی طرح اس سے شادی کر لو۔ لہذا اگر جس دوست پر تمہیں شبہ ہوا اُسے تم نے قتل کر دیا۔ تمہاری خواہش تھی کہ تم اس سے (دو) آہستہ آہستہ اس کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جاؤ، لیکن تمہیں مایوسی ہی ہوئی۔ تم اسے اپنی متوجہ نہ کر سکے۔ تمہارا آخری شکار وہ آدمی تھا جس پر پلٹنے نے حملہ کیا تھا۔ یقیناً تم نے یا تم کسی آدمی نے پنڈلی کے زخم پر کوبرا کا زہر لگا دیا اور اسی زہر کی ایک شیشی پرویز کے کمرہ ڈلوادی۔ تمہیں شبہ ہوا تھا کہ زویا پرویز کی طرف بھی جھک رہی ہے۔ لہذا اس طرح ایک ہی حملے میں دو شکار لرنے چاہے۔ پرویز پر شبہ کیا جانا ضروری تھا کیونکہ ایک دونوں میں لڑائی ہو چکی تھی۔“

”یہ سب بکواس ہے۔“ ناگری نے ایک ہزبانی سا قہقہہ لگایا۔ ”تم کسی حالت ثابت کر سکو گے۔“

”میں ثابت کر دوں گا۔“ بوڑھے ناصر نے کہا۔ جواب اسی کمرے میں آچکا تھا۔ ”جاؤ لیٹو..... تم پاگل ہو گئے ہو..... دفع ہو جاؤ۔“ ناگری ہاتھ ہلا کر دھاڑا۔ ”نمک حرام کتے تو پاگل ہے! اُس کا قاتل جس نے تجھے خاک سے اٹھا کر آسمان دیا تھا۔ ڈاکٹر اسفندیار کی روح انتقام کیلئے تڑپ رہی ہے اور خدا کا انصاف دور نہیں ہے۔“ ”آپ آرام کیجئے ناصر صاحب۔“ فریدی نے کہا۔ ”آپ بیمار ہیں، تھوڑی سی ہم آپ کو کھلی ہوا میں لے چلیں گے۔“

پھر اس نے حمید سے کہا۔ ”ناگری کے ہاتھ باندھ دو اور مں گراہمس اب تم؟ چاہتی ہو کرو۔ تمہاری واپس تک ہم یہیں ٹھہریں گے۔“

دوسرے دن فریدی اور حمید قائم آباد کے سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر ناصر اسفندیار کی کہانی سن رہے تھے۔

”ڈاکٹر اسفندیار۔“ ناصر کہہ رہا تھا۔ ”ایک عظیم آدمی تھے۔ انہوں نے خود کو قوم وقف کر دیا تھا۔ نہ جانے کتنے لاعلاج امراض کے کامیاب علاج انہوں نے دریافت

20 برہمہ اعتقاد کرتے تھے اور میں نے کبھی ان کے اعتقاد کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ وہ بے حد فی آدی تھے۔ ان کی لیبارٹری ہی اُن کے لئے سب کچھ تھی۔ اکثر وہ وہیں سو رہتے تھے۔ مرافیت نے انہیں کسی حد تک پراسرار بھی بنادیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر وہ منظر عام پر نہ آئیں کام کرنے کا موقع نہیں ملے گا یہی وجہ ہے کہ لوگ صرف ان کا نام ہی سنتے رہے، نہ آشنا نہ ہو سکے۔ یہ ناگری ایک یتیم اور لاوارث لڑکا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی پرورش کی بالی تعلیم دلوائی تھی اور کوشش کی تھی کہ وہ ان کا دہاتا بازو بن سکے۔“

”میں اس لڑکی زویا کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اُسکی پرورش اتنے پراسرار طریقہ سے ہوئی۔ اُسے یہ کیوں نہ معلوم ہو سکا کہ وہ ڈاکٹر اسفندیار کی لڑکی تھی۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس پر بھی وہ ایک تجربہ کر رہے تھے۔“ ناصر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”دراصل اس پیدا ہونے ہی ڈاکٹر کی بیوی چل بسی تھی۔ اس سے پہلے ہی سے ڈاکٹر کسی ایسے بچے کی ماں تھے جسے اپنے والدین کے متعلق کچھ بھی علم نہ ہو۔ ہاں ٹھہریے..... ساتھ ہی یہ بھی کہ خود ڈاکٹر کی بیوی کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کا شوہر حقیقتاً کون ہے۔ وہ انہیں ڈاکٹر مبارک حشیت سے نہیں جانتی تھیں۔ یہ فخر صرف دو آدمیوں کو حاصل تھا۔ مجھے اور ناگری بہر حال ان کی بیوی صرف اتنا جانتی تھیں کہ ان کا شوہر ایک خاندانی رئیس ہیں اور اس نہ صرف ہیں جو انہیں تر کے میں ملی تھی۔“

”لیکن وہ ایک ایسا بچہ کیوں چاہتے تھے جسے اپنے والدین کے متعلق کچھ بھی نہ معلوم۔“ حمید نے پوچھا۔

”وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ایسے بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کیسے ہوتی ہے۔ ان صاحب پر اس احساس کا کیا اثر پڑتا ہے کہ وہ نامعلوم والدین کی اولاد ہیں۔ اس طرح وہ نسلیات میں کسی نئے باب کا اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ ہاں تو سب سے پہلے زویا کی پرورش ایک لڑکی عورت کے ذمہ ڈالی گئی جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ گوگی کے پڑوسی جانتے تھے کہ وہ اس لڑکی نہیں ہے۔ زویا نے ہوش سنبھالا تو یہی آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں کہ وہ گوگی

کی لڑکی نہیں ہے لیکن اُسے یہ بتانے سے قاصر تھی کہ وہ کس کی لڑکی ہے۔ گوگنی کی موت پر یہ ذمہ داری مجھ پر آ پڑی۔ میں نے زویا کو بتایا کہ میں گوگنی کا بھائی ہوں، لیکن مجھے بھی علم ہے کہ اس نے اُسے کہاں سے حاصل کیا تھا۔ اس دوران میں ڈاکٹر اسفندیار اس وقت جسمانی حالت کا مشاہدہ کرتے رہے تھے اور زویا کو میں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی مجھے اس کی صحت کا بے حد خیال رہتا ہے۔ اس لئے میں ہر ہفتہ اس کا طبی معائنہ کرتا ہوں۔ یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ڈاکٹر اسفندیار کو صرف تجربات کی دھن رہتی تھی اور انہوں نے اپنا سارا سرمایہ بھی میرے نام منتقل کر دیا تھا۔ میرے ہی دستخط پر بینکوں سے دین ہوتا تھا۔ ویسے ڈاکٹر نے زویا کے حق میں ایک وصیت نامہ بھی مرتب کیا تھا اور اس اعتراف پر میرے بھی دستخط تھے کہ یہ سارا سرمایہ ڈاکٹر اسفندیار کا ہے جو اس کی موت کی لڑکی زویا کے نام منتقل کر دیا جائیگا۔ وصیت نامہ ڈاکٹر کے قانونی مشیر کے پاس محفوظ ہے۔ لیکن تجربہ مکمل ہو جانے کے بعد بھی زویا کو اندھیرے میں کیوں رکھا گیا۔“ حمید نے ”اوہ..... واقعی یہ ایک بہت بڑی ٹریجڈی تھی۔ ڈاکٹر نے تجربہ مکمل ہو جانے کے بعد تھا کہ زویا پر سب کچھ ظاہر کر دے مگر ناگری نے انہیں یہ سمجھایا کہ زویا ان سے نفرت لگے گی۔ وہ سوچے گی کہ اس کا باپ کتنا ظالم ہے کہ محض ایک تجربے کی خاطر اسے بچہ اب تک ایک قسم کی بے بسی میں رکھا۔ یہ بات ڈاکٹر کے دل میں اتر گئی اور انہوں نے کر لیا کہ اب اُن کی موت کے بعد ہی زویا کو اپنی حقیقت کا علم ہو۔ اُسی وقت انہوں نے ناگری ہی کے مشورے پر وہ وصیت نامہ مرتب کیا تھا۔ وصیت نامہ مرتب ہو جانے کے بعد ناگری نے انہیں زہر دے دیا اور مجھے اپنا قیدی بنالیا۔ مجھ پر جبر کر کے وہ چیکوں پر دستخط اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح زویا کو اپنی طرف مائل کر لے۔ اگر وہ اس میں ہوجاتا تو پھر ڈاکٹر کی دولت اُسی کی ہوتی۔ ویسے بھی وہ ڈاکٹر کے ایجاد کردہ نشہ آور مشروب ناجائز تجارت سے کافی بڑی بڑی رقمیں بناتا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی وہ ایجادات دوسرے مقام تھیں لیکن اس نے انہیں غلط طریقہ پر رواج دینے کی کوشش کی۔“

ڈاکٹر ناصر نے بولتے بولتے تھک کر آنکھیں بند کر لیں اور وہ دونوں کچھ دیر بعد اٹھ ہسپتال کے پھاٹک پر ڈالی سے ٹدھ بیٹھ ہو گئی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ ”میں آپ دونوں سے بے حد شرمندہ ہوں۔“ اُس نے اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ابھی ابھی سپرنٹنڈنٹ سے معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ کون خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے بہت بد تمیزیاں کی ہیں۔“

”اوہ..... اس کی فکر نہ کرو۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”بہر حال یہ تمہارا کیس ہے۔ شام ریڈ ہوٹل میں آ کر مکمل رپورٹ لے جانا۔ ہاں ناگری کا کیا رہا۔“

”اس نے اعتراف جرم کر لیا ہے جناب۔ اب زویا کو تار دیا گیا ہے کہ وہ قائم آباد پہنچ جائے۔ لڑھکی پولیس سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ زویا کو یہاں تک پہنچنے میں مدد دی جائے۔“

حمید بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا اور اب اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

”آپ کو تو میں نے بہت کچھ کہا ہے کیپٹن۔“ ڈالی نے اُسے مخاطب کیا۔

”کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟“

”دچار دن اس پر غور کرنے کے بعد۔“ حمید نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

پھر ڈالی ہسپتال چلی گئی اور وہ سڑک پر آ گئے۔

”اب میں بُری طرح تنگ آ گیا ہوں، اپنے جھکے سے۔“ حمید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”کیا کہ اب کسی نئی لڑکی سے ملاقات ہونے پر سب سے پہلے یہ پوچھنا پڑے گا کہ اس کا تعلق کون سا رشتہ دار ہے تو نہیں ہے..... خدا کی مار.....؟“

ختم شد

جاسوسی دنیا نمبر 66

پراسرار موجد

”پراسرار موجد“ اپنے نام ہی کی طرح پراسرار ہے۔ اس کی سب سے اہم قیمت یہی ہے کہ ابتداء سے انتہا تک یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ مجرم کون ہے؟ اور ان کے برعکس اس میں کوئی گروہ نہیں ہے، بلکہ مجرم ایک ہی ہے! وہ اتنا ہوشیار ہے جب فریدی اس پر ہاتھ ڈالتا ہے تو ذہن کو یک بارگی جھٹکا لگتا ہے۔ ابن صفی کی دیگر نیوں میں بھی یہ خوبی پائی جاتی ہے مگر اس کہانی میں ایک نئے حسن کے ساتھ ہے۔ جاسوسی کہانیوں کے برعکس اس میں ”جسمانی مشقت“ کم ہے یعنی مار پیٹ گھونے اور دندان شکن سوال و جواب وغیرہ اس کے بجائے ذہنی ورزش سائینٹفک طریقہ نامت، کرید، چھان بین پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اسی بناء پر پراسرار موجد کی کہانی روزانہ زندگی میں ہونے والے بہت سے جرائم سے ملتی جلتی ہے۔

حمید اس بار بھی بہت چاک و چوبند نظر آتا ہے۔ ”بکراہیت“ کی تبلیغ اور برخوردار خاں کا ساتھ اس کے ذہن کی منجھد تھیں بھول دیتا ہے اور ہم بے اختیار قہقہہ لگانے لگے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ مجھے جو بات سب سے زیادہ پسند ہے وہ صوفیہ فوجی کا کردار ہے۔

ابن صفی عظیم ناول نگار ہونے کے ساتھ بہت بڑے ماہر نفسیات ہیں۔ انہوں نے روافضیاتی شہ پارے تخلیق کئے ہیں۔ ان کے نام کہاں تک گواؤں۔ یہاں صرف لیجئے کہ صوفیہ کا کردار ان کرداروں میں ایک درخشاں ستارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ”اس کی معصومیت اور اس کی گھبراہٹ“ باپ سے اس کی محبت ان انسانی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے جن سے انسانیت عبارت ہے۔ اس کی ماں کا کردار، جو ماضیاد ہے۔ بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔

(مکمل ناول)

”پہنوٹ کرو اور کرنل صاحب کے حکم کے مطابق یہاں پہنچ جاؤ..... نمبر ۳۲۱ سینٹ کالونی۔“

”دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ حمید نے ایک جھٹکے کے ساتھ ریسور کو کرڈیل اٹھائے ہوئے اپنے مقدر کو دو چار سلواتیں سنائیں اور..... اور پھر اب اس کے علاوہ چارہ اٹھا کہ وہ سینٹ جوزف کالونی کی طرف روانہ ہو جاتا۔ ویسے اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے سیدھا ”خاموش کالونی“ کی طرف دوڑتا چلا جائے۔ لیکن اس نے چپ چاپ موٹر سائیکل اٹھائی اور سینٹ جوزف کالونی کی طرف روانہ ہو گیا۔

لاش

کیپٹن حمید نے ٹائی کی گرہ درست کرنے کے بعد آئینے پر الوداعی نظر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اتوار کی صبح تھی اور فریدی بھی گھر پر موجود نہیں تھا۔ لہذا اس کی واپسی ہی کھسک جانا مناسب تھا۔

ایک قدم کمرے میں تھا اور دوسرا دروازے سے باہر کہ فون کی گھنٹی بجی۔ حمید جھلاہٹ میں سلیپر اٹھا کر فون کی طرف دوڑا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر کہیں وقت اُلو کی آواز سنائی دے، لمبی راستہ کاٹ جائے یا فون کی گھنٹی بج اٹھے تو اس کا مسئلہ نحوست۔ یعنی پھر کہیں جانے کا ارادہ ہرگز پورا نہیں ہو سکتا۔

”ہالو.....!“ وہ ریسور اٹھا کر ماوتھ پیس میں دھاڑا۔

”میں ریش ہوں..... حمید بھائی۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”تم لڑکا کے راون ہو..... خدا تمہیں غارت کرے۔“

”خواہ مخواہ مجھے تاؤ نہ دکھاؤ۔ میں نے کرنل صاحب کے حکم کے مطابق آپکونوں کا

”مگر کیوں کیا ہے۔“

”یہاں سینٹ جوزف کالونی میں ایک کیس ہو گیا ہے۔“

”یہ اتوار کو کیس کیوں ہوا کرتے ہیں۔ کیا کوئی مجھے بتائے گا۔“ حمید دانت پیس کر

حمید نے لفظ کیس پر سات بار لعنت بھیجی، لیکن موٹر سائیکل دوڑتی ہی رہی۔ کیس پر لعنت بھیجنے نہ تو موٹر سائیکل ہی رک سکتی تھی اور نہ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ جوزف کالونی کا راستہ بھول جاتا۔ آخر کار وہ وہاں پہنچ ہی گیا وہ مکان بھی تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوئی جس کا نمبر نمون پر بتایا گیا تھا۔ باہر چار کانٹیل موجود تھے۔ دو پولیس کاریں کھڑی تھیں اور تیسری لڑکی کی لگن تھی۔

کانٹیل اُسے دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئے اور وہ ایک کانٹیل کی رہنمائی میں موقعہ رات کی طرف روانہ ہو گیا۔ عمارت خاصی بڑی تھی اور ساز و سامان کے اعتبار سے اس کا کمین لگائی ہوئی حیثیت آدمی معلوم ہوتا تھا۔

وہ کئی راہداروں سے گزرتا ہوا ایسی جگہ پر پہنچا جہاں دو تین سب انسپکٹر موجود تھے ایک بڑے بڑے کیڑے بین عورت اور ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ وہ سب خاموش تھے۔

ایک سب انسپکٹر نے ایک کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

حمید اندر آیا لیکن کمرے کا منظر اتنا متاثر کن تھا کہ وہ سناٹے میں آ گیا۔ وہ سب دیکھ سکتا تھا لیکن خوبصورت لڑکیوں کی لاشیں اس سے نہیں دیکھی جاتی تھیں۔

اودہ لاش تو یقیناً دل ہلا دینے والی تھی۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال ہوگی۔ ایک نازک سی یوریشین لڑکی جس کے خدو خال موت کے بعد بھی ملاؤ ویز تھے۔ اس کی کنپٹی سے خون بہہ بہہ کر فرش پر پھیل گیا تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بھیا نک خواب دیکھ کر جاگ پڑی ہو اور اعصابی اختلال نے پلکیں جھپکانے سے باز رکھا ہو۔ داہنے ہاتھ کے قریب ایک ریوالور پڑا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں اور کسی قسم کی نہیں نظر آئی۔ ساری چیزیں قاعدے سے اپنی جگہوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ کمرہ غالباً خور کی حیثیت سے استعمال ہوتا رہا تھا۔ یہاں کے ساز و سامان سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔

حکمہ سراغ رسانی کے نوٹو گرافر پوشیدہ نشانات کے چکر میں تھے اور کرنل فریدی، شیشے سمیت ایک میز پر جھکا ہوا تھا۔ حمید کی آہٹ پر وہ چونک کر مڑا اور پھر میز پر جھک گیا۔ حمید لاش کے قریب آیا۔ جھک کر گولی کا زخم دیکھا اور پھر کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھ کر قتل.....! اس نے فریدی کے قریب پہنچ کر آہستہ سے پوچھا۔

”نی الحال خود کشی ہی سمجھو۔“

”یعنی قتل بھی ہو سکتا ہے۔“

”شاید.....!“ فریدی کی آنکھوں سے بے یقینی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ سید

ہو کر نوٹو گرافروں کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”اس میز پر بھی پاؤڈر ڈالو۔“

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کمرے کی شکل کی ایک چھوٹی سی مشین کا بٹن دبایا۔ ایک سوراخ سے بھورے رنگ کا غبار نکل کر میز کی سطح پر منتشر ہونے لگا۔ فریدی نے اُن اور مطمئن ہو کر سر کو خفیف سی جنبش دی۔ نوٹو گرافر میز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

فریدی نے حمید کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ دونوں ایک خالی کمرے میں باقی

”یہ.....!“ فریدی چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”پروفیسر نجی کا مکان ہے۔ کیا تم نے بھی یہی یہ نام سنا ہے۔“

”نہیں.....!“

”نہ سنا ہوگا۔ بہر حال یہ اپنی ایجادات کے خط کی بناء پر تھوڑی بہت شہرت بھی رکھتا۔ مرنے والی اس کی سیکرٹری تھی۔ آج صبح اس کی لاش نجی کی بیوی نے دریافت کی۔“

فریدی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ”واضح رہے کہ اس کی بیوی سے اس کے بات اچھے نہیں ہیں اور وہ اسکے ساتھ نہیں رہتی۔ آج صبح وہ اس سے جھگڑا کرنے لگی تھی۔“

”کس سے۔“

”پروفیسر سے..... اس نے باہر کا دروازہ کھلا پایا اور بے دریغ اندر گھسٹی چلی آئی۔ یہ حال اس کے شوہر کا مکان ہے۔ دونوں کے تعلقات خواہ کیسے ہی ہوں اس نے اندر کچھ اس کا سناٹا محسوس کیا جیسے یہاں کوئی موجود نہ ہو۔ وہ مختلف کمروں میں اپنے شوہر کی تلاش کرتی رہی تھی۔ اچانک اس کمرے میں اس نے لڑکی کی لاش دیکھی۔ اس کے بعد بھی اس نے پروفیسر نجی کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھا لیکن وہ کہیں نہ مل سکا۔“

”نوکر بھی موجود نہیں تھے۔“

”نہیں..... وہ تو اس وقت آئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ وہ صرف دن کو یہاں رہتے ہیں۔ رات کیلئے ان کی چھٹی ہوتی ہے اور وہ اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ پروفیسر کی بیوی نے یہیں سے فون پر اس حادثے کی اطلاع پولیس کو دی اور پھر اس وقت سے وہ یہیں ہے۔“

”وہ عورت تو نہیں، جو باہر ملی تھی۔“

”ہاں..... وہی!“

”وہ تو یوریشین ہے اور اس کے ساتھ ایک یوریشین لڑکی بھی تھی۔“

”وہ نجی کی بیوی ہے اور دوسری اس کی لڑکی۔ لڑکی نجی ہی سے ہے۔“

”اوہ.....! تو یہ نجی کوئی بوڑھا آدمی ہے۔“

”میں کیا بتا سکوں گی۔ یہ بات تو آپ کو نوکروں سے معلوم ہو سکتی ہے۔“
 ”آپ نے پوچھا۔“
 ”نہیں۔“

”آپ کو پوچھنا چاہئے تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کا یہ فعل غیر فطری نہ ہوتا۔“
 ”جی ہاں..... قطعی فطری ہوتا لیکن ایسے حالات میں احتیاط بھی ضروری ہے۔ میں زیادہ
 ڈر کرے پولیس کو اس بات کا موقع نہیں دینا چاہتی کہ وہ مجھ پر ہی شبہ کرنے لگے۔“
 ”آپ پر کیوں؟“ فریدی نے حیرت ظاہر کی۔

”دنیا جانتی ہے کہ ہماری ناچاقی کے اسباب کیا ہیں۔“
 ”پھر شاید میں دنیا میں نہیں ہوں۔“ فریدی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نظر آئی۔
 ”اوہ..... دیکھئے..... ہم دونوں کے صرف تعلقات خراب ہیں۔ ہم نے قانونی طور پر
 ملکی اختیار نہیں کی، لہذا میں پروویسر کے خلاف کچھ نہیں کہنا چاہتی۔“
 ”ایسے کسی موقع پر بھی آپ اپنی زبان بند رکھیں گی۔ مجھے حیرت ہے۔“
 ”اور کچھ نہ بولی۔ فریدی نے کہا۔“ فرض کیجئے! پولیس آپ پر شبہ کرنے لگے تو۔“
 ”میں کیا کر سکتی ہوں۔“ عورت نے مایوسانہ انداز میں کہا۔
 ”آپ نصیر آباد سے کیوں آئی تھیں۔“
 ”یہ ایک بالکل نجی معاملہ ہے لہذا.....!“

فریدی اس کے جواب کی طرف دھیان دیئے بغیر بولا۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ نجی صاحب
 لائیکر ٹری کو آپ شبہ کی نظر سے دیکھتی رہی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ پچھلی رات کو
 ہاں آئی ہوں..... اور..... پھر صبح بھی آئی ہوں۔“

عورت کے چہرے پر زردی پھیل گئی اور اس نے ہونٹوں پر زبان بھیرتے ہوئے کہا۔
 ”میں جانتی تھی ہماری ناچاقی کے اسباب سے پولیس بھی واقف ہوگی۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ
 ملانے اسے قتل نہیں کیا۔ میرے خدا قتل؟ میں کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”ہاں..... غالباً۔“
 ”کیا آپ ذاتی طور پر اسے نہیں جانتے۔“
 ”نہیں۔“

”وہ اس وقت کہاں ہے۔“
 ”ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا۔“
 ”اوہ.....!“ حمید ہونٹ سکڑ کر رہ گیا۔
 کچھ دیر خاموشی رہی پھر فریدی نے کہا۔ ”میں نے ابھی تک ٹھیک سے اس عورت کا
 نہیں لیا۔ تم اسے یہاں بلاؤ۔“

حمید اٹھ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھاری بھر کم یوریشین عورت کمرے میں داخل ہو
 ”تشریف رکھئے۔“ فریدی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
 عورت بیٹھ گئی۔ موٹاپے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی اور آنکھیں بھوکی با
 کی طرح چمک رہی تھیں۔

فریدی نے عورت سے پوچھا۔ ”کیا صاحبزادی بھی آپ کے ساتھ تھیں جب آپ
 لاش.....!“ وہ کہتے کہتے قصد آرک گیا۔
 ”نہیں جناب۔“ عورت اپنے چہرے پر رومال جھلتی ہوئی بولی۔ ”میں تنہا تھی۔ پولہ
 فون کر دینے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اب میں اس وقت تک یہاں سے مل بھی نہیں سکتی
 تک پولیس نہ آجائے۔ لہذا میں نے اُسے بھی فون کر کے یہیں بلا لیا۔“
 ”آپ کا قیام اور کہیں ہے۔“

”ہم ہوٹل ڈی فرانس میں مقیم ہیں۔“ عورت نے جواب دیا۔
 ”مستقل طور پر۔“

”جی نہیں! ہم پچھلی رات نصیر آباد سے آئے تھے۔ مستقل قیام وہیں ہے۔“
 ”اوہ..... اچھا..... کیا آپ بتا سکیں گی کہ نجی صاحب کہاں ہیں۔“

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو۔ کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں وہ ایک عورت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے۔ خود میری موجودگی میں نہ جانے کتنی عورتوں کے مراسم رہے اور ختم ہو گئے۔

”وہ اتنا ہی اکتا سکتا ہے کہ اپنی کسی داشتہ کو قتل کر دے۔“

”اس کا جواب تو وہی دے سکے گا۔“ عورت نے بیزاری سے کہا۔ ”میں کیا بتا سکتی ہوں۔“

”اچھا شکریہ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو پھر تکلیف دی جائے۔“ فریدی نے کہا اور حمید کی منہ بول گیا۔ لیکن عورت دروازے کے قریب بھی نہیں پہنچی تھی کہ وہ اسے روک کر بولا۔

پولیس کو اطلاع دیئے بغیر اس شہر سے باہر نہیں جا سکیں گی۔“

”کب تک۔“ عورت جھلا کر مڑی۔

”جب تک پولیس اس کی ضرورت سمجھے۔“

”میں یہاں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہر سکتی۔“

”جبوری ہے محترمہ۔“ فریدی نے کہا اور حمید سے بولا۔ ”کسی ایک نوکر کو بلاؤ۔“

عورت فرش پر پیر پختی ہوئی چلی گئی۔

”اس کی لڑکی کو کیوں نہ لاؤں۔“ حمید نے تجویز پیش کی۔

”جو میں کہہ رہا ہوں کرو۔“

حمید چپ چاپ باہر کو چلا آیا اور پھر ایک نوکر کے ساتھ واپسی ہوئی۔

فریدی نے اس سے اس کا نام پوچھا۔ ملازمت کی مدت معلوم کی اور پھر پروفیسر نجی کے سوال کر بیٹھا۔

”وہ تو دو ماہ سے یہاں نہیں ہیں جناب۔“

”کہاں ہیں۔“

”ہمیں پتہ نہیں..... مس صاحب کو معلوم ہوگا۔“

”کن کن صاحب۔“

وہ چند لمبے خاموش رہی پھر بولی۔ ”میرے تعلقات اسی بناء پر خراب ہو گئے ہیں کہ آوارہ عورتوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔ خوبصورت لڑکیاں رکھتا ہے۔ اب یہی لڑکی جو لڑکی گریجویٹ تھی۔ سائنسی تحقیقات کے سلسلے میں اس کی کیا مدد کر سکتی ہوگی۔“

”اوہ، تو آپ اسی لڑکی کے سلسلے میں پروفیسر سے جھگڑا کرنے آئی تھیں۔“

”یہ قطعی غلط ہے۔ میں اس سے یہ کہنے آئی تھی کہ اگر ہم ساتھ نہیں رہ سکتے تو پھر کچھ

طور پر ہی علیحدگی کیوں نہ ہو جائے۔“

”لیکن جب آپ یہاں آئیں تو سیکریٹری سے آپ کا جھگڑا ہو گیا۔“ فریدی نے کہا

”اوہ میرے خدا۔“ عورت آنکھیں بند کر کے اپنی پیشانی رگڑتی ہوئی بولی۔ ”کیا آج

کچھ مجھے پھانسی دلوانا چاہتے ہیں۔“

”جھگڑا نہیں ہوا تھا آپ کا اس سے۔“

”ہرگز نہیں..... میں نے پچھلی رات اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔ آپ ہوئی ڈیڑھ

سے معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم نے پچھلی رات وہیں گزاری تھی۔ البتہ میں بہت سویرے یہاں

لئے روانہ ہو گئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ پروفیسر سے ملاقات ہو جائے۔“

”یہ لڑکی ان کے پاس کب سے تھی۔“

”شاید پچھلے سال سے۔“

”کیا آپ کسی ایسے آدمی سے بھی واقف ہیں جو اس لڑکی کو کسی بناء پر قتل کر سکا ہو۔“

”یوں تو خود..... پروفیسر..... اوہ..... نہیں دیکھئے مسٹر۔ میری ذہنی حالت اس

ٹھیک نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہیں صاف صاف کہئے اس سے مجھے

پکڑنے میں مدد ملتی ہے۔ ضروری نہیں کہ پروفیسر نے اسے قتل ہی کر دیا ہو، لیکن

ہر زاویے سے اس کیس پر نظر ڈالنی پڑے گی۔“

”نہی.....! عورت نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔“

”وہی جن کی لاش.....!“ نوکر کی آواز بھرا گئی۔

”یہ سیکریٹری یہاں رات رہتی تھی۔“

”جی ہاں جناب! صاحب کی موجودگی میں سب کچھ مس صاحبہ کی نگرانی میں رہتا تھا۔“

”پچھلی رات تم کس وقت یہاں سے گئے تھے۔“

”نوبے۔“

”اس وقت سیکریٹری کیا کر رہی تھی۔“

”پیانو بجا رہی تھیں۔“

”اور کون تھا اس کے ساتھ۔“

”کوئی بھی نہیں..... وہ تنہا تھیں۔“

”اس کے مرہود دست بھی یہاں آتے رہے ہوں گے۔“

”میں نے آج تک کسی کو بھی نہیں دیکھا۔“ نوکر نے جواب دیا۔ ”وہ خود بھی بہت

جاتی تھیں۔“

”تم میں سے کس کو زیادہ پسند کرتی تھی۔“

”جی.....!“ نوکر ہٹکا کر رہ گیا۔ ”وہ فریدی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔“

”مطلب یہ کہ وہ کس پر سب سے زیادہ اعتماد کرتی تھی۔“

نوکر کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”یہ بتانا بہت دشوار ہے۔“

”پروفیسر نجی کس ملازم پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔“

”ارشاد پر جناب۔“

”کیا وہ یہاں موجود ہے۔“

”جی ہاں!“

”ارشاد کو بلاؤ۔“ فریدی نے حمید سے کہا اور نوکر سے بولا۔ ”تم جا سکتے ہو۔“

کچھ دیر بعد ارشاد وہاں موجود تھا۔

فریدی نے سب سے پہلے پروفیسر نجی ہی کے متعلق سوال کیا لیکن اس نے بھی وہی

بنا دیا جو اسے اس سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ یعنی تقریباً دو ماہ سے پروفیسر غائب تھا۔

”مجھے حیرت ہے کہ تم بھی پروفیسر کے متعلق واضح طور پر کچھ نہیں بتا سکتے۔ جبکہ تمہارے

میں سنا جاتا ہے کہ تم پروفیسر کے نجی معاملات میں بھی ذخیل ہو۔“

”یہ درست ہے جناب مگر انہوں نے مجھ سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ وہ کہاں

ہے ہیں۔“

”رواگی کے وقت تم موجود تھے۔“

”نہیں جناب! وہ رات کو کسی وقت گئے تھے دوسرے دن مجھے مس صاحب سے معلوم ہوا

صاحب کہیں باہر گئے ہیں، لیکن شاید مس صاحبہ کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں کے لئے

ہوئے ہیں۔“

”پچھلی رات تم کس وقت یہاں سے گئے تھے۔“

”میں سب کے بعد گیا تھا۔ وقت شاید..... شاید دس بج رہے ہوں گے۔“

”اچھا تو وہ تمہارے سامنے ہی گیا تھا۔“

”کون جناب۔“ نوکر نے حیرت سے پوچھا۔

”سیکریٹری کا دوست.....؟“

”نہیں جناب! میری موجودگی میں تو کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ مس صاحب تنہا تھیں۔“

”اچھی طرح یاد کرو۔“

”اچھی طرح یاد ہے جناب۔ میرا خیال ہے کہ کوئی ان کا دوست نہیں تھا یا پھر میں ہی کسی

ناؤکی سے واقف نہ ہوں گا جسے ان کا دوست کہہ سکیں۔“

”کیا وہ یہاں رات کو تنہا رہتی تھی۔“

”جی ہاں!“

”اب میں جو کچھ پوچھنے جا رہا ہوں اس کا جواب سوچ سمجھ کر دیتا۔“ فریدی نے اس کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا وہ صرف سکرٹری تھی۔“

نوکرنے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر پھر ہونٹ بند کر لئے اور فریدی بولا۔ ”ہاں اجمل!“

مگر وہ صرف سوچتا ہی رہا۔ زبان نہیں کھولی۔

”کتنی دیر تک سوچو گے۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔

”میں اس سوال کا کیا جواب دوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا..... حضور۔“

”کیا وہ صرف سب ریڑھی تھی۔“ فریدی نے پھر سوال کیا۔

”اس کا جواب: احب ہی دے سکیں گے۔“

”پولیس تمہیں جواب کے لئے مجبور بھی کر سکتی ہے۔“

”جی نہیں..... وہ صرف سیکریٹری نہیں تھیں۔“

”تمہیں اچھی طرح علم ہے۔“

”جی ہاں۔“

”کیا یروفسر کی روانگی سے قبل دونوں میں جھگڑا ہوا تھا۔“

”مجھے علم نہیں ہے جناب..... ویسے صاحب جھگڑالو آدمی نہیں ہیں اور نہ مگر

صاحب ہی کو غصے میں دیکھا ہے۔“

”یروفیسر کہاں ہے..... تم یہ بھی جانتے ہو؟“

”نہیں حضور مجھے علم نہیں ہے۔ ممکن ہے صاحب کے وکیل کو علم ہو۔“

”وکیل..... وکیل کون ہے۔“

”تنویر صدائی۔“

“.....”

”اٹھارہ گرین اسکوائر.....!“

حمید نے نوٹ بک میں پتہ نوٹ کر لیا۔

نمبر 20

فریدی نے کرسی کی پشت سے ٹک کر رگڑا لگایا اور نوکر کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”تم

”

پرفریڈی نے فردا فردا دوسرے نوکروں سے بھی سوالات کئے لیکن ان سے بھی کوئی نئی معلوم ہو سکی۔ وہ چند لمحے سگار کے کش لیتا رہا پھر حمید سے بولا۔ ”اگر یہاں ٹیلی فون

بیکری مل سکے تو تنویر صدانی کے نمبر تلاش کرو۔“

جد کمرے سے نکل آیا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری اُسے جلد ہی مل گئی لیکن تصویر صدائی کے نمبر

پھر حال وہ آدھے گھنٹے کی مسلسل جدوجہد کے بعد اس میں کامیاب ہو سکا۔ اس نے فریدی

طالع دی اور فریدی پھر لاش والے کمرے میں واپس آ گیا کیونکہ فون یہیں تھا۔ لاش اٹھوائی

میں نے لیکن فرس پر خون کے دھبے اب بھی باقی تھے۔ اس نے تنویر صمدانی کے نمبر ڈائیل

یہ کمال خود اسی نے ریسو کی فریدی نے پوچھا۔ ”آپ پروفیسر نجمی کے قانونی مشیر ہیں۔“

”جی ہاں..... آپ کون صاحب ہیں۔“

”میں محکمہ سراغ رسانی کا ایک آفیسر کرنل فریدی ہوں۔“

”اوہ..... کرنل صاحب..... فرمائیے..... فرمائیے۔“

”میں پروفیسر نجمی کی قیامگاہ سے بول رہا ہوں۔ یہاں اسکی سیکریٹری کی لاش پائی گئی ہے۔“

”نہیں.....!“ تنویر متحیرانہ انداز میں چیخا۔ ”سیکرٹری کی لاش۔“

”آپ فوراً یہاں تشریف لائے۔“ فریدی نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

”پھر تجسس آمیز نظرس حاروں طرف ڈال رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نظر کاغذ کے ایک ٹکڑے

لی جنس کا ایک گوشہ فون کے نیچے دما ہوا تھا۔ شاید دوسرے اس کاغذ کے ٹکڑے کو نظر انداز

سیتہ کیونکہ اس پر کچھ نمبر درج تھے۔ ممکن ہے فون کے ہی نمبر رہے ہوں۔ لیکن فریدی انہیں

انٹرویو سے دیکھ رہا تھا جسے وہ انہیں دیکھ کر کسی الجھن میں پڑ گیا ہو۔

بالآخر اس نے پھر ریسپور اٹھا لیا اور انکو آری کے نمبر ڈائیل کئے۔ دوسری طرف سے فوراً

”یقیناً..... یقیناً.....!“ وہ اس سے مصافحہ کرتا ہوا بولا۔ ”لیکن یہ واقعہ..... ڈوروتھی کی میرے خدا..... یقین نہیں آتا..... لاش کہاں ہے۔“

”ہیوادی گئی ہے۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”قتل.....!“ وہ فریدی کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔

”یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔“ فریدی نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے اسباب قدرتی ہوں گے کیونکہ اس کی کپٹی میں ایک سوراخ ہے اور فرش پر..... پاس ہی ایک ریوالتور پڑا ہوا ملا ہے۔“

”مگر اُسے کس نے قتل کیا۔“ تنویر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ بڑی نیک لڑکی تھی کرنل بہ، خاموش اور سنجیدہ۔ ایسی نہیں تھی کہ اسکے قتل کا محرک کسی کا اشتہامی جذبہ قرار دیا جاسکے۔“

”ہوسکتا ہے۔ اس نے خودکشی کی ہو۔“ فریدی بولا۔ ”مگر ٹھہریے! میں فی الحال اس میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مجھے تو دراصل پروفیسر نجمی کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔“

”اوہ.....!“ دفعتاً تنویر کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آنے لگے پھر اس نے لاپرواہانہ پھیر کر پوچھا۔ ”کس قسم کی معلومات.....!“

”وہ کہاں ہے! مجھے اس کا موجودہ پتہ چاہئے۔“

”اوہ..... پتہ..... دیکھئے..... میرے خدا مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ تنویر اسی طرح بڑبڑایا

خود سے مخاطب ہو۔

”ہاں..... یہ بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کو اس کا موجودہ پتہ معلوم ہو تو براہ کرم قانون

ادارے فرمائیے۔“

”میں بڑی الجھن میں پڑ گیا ہوں۔“ تنویر نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ وہ بڑی طرح زور سے نظر

لگا تھا۔

”کیوں آپ کیوں الجھن میں پڑ گئے۔“ فریدی اسے گھورنے لگا۔

”دیکھئے..... آپ جانتے ہیں کہ بزنس کا معاملہ کتنا نازک ہوتا ہے۔“

یہی جواب ملا۔ فریدی نے بتایا کہ وہ کون ہے۔ پھر اس نے کانڈ پر لکھے ہوئے نمبر دہرائے۔ ”مجھے ان نمبروں کے نمبر اور پتے درکار ہیں۔“

”آپ کس نمبر کے فون سے گفتگو کر رہے ہیں۔“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

فریدی نے نیچے جھک کر پروفیسر کے نمبر دیکھے اور آپریٹر کو بتاتا ہوا بولا۔ ”1“

”پندرہ منٹ ضرور صرف ہوں گے جناب۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کوئی بات نہیں۔“ فریدی نے کہا اور ریسورکر ٹیل میں رکھ دیا۔

”خدا کے لئے اُسے خودکشی ہی رہنے دیجئے۔“ حمید بڑبڑایا۔

”کیوں.....؟“

”اتنی خوبصورت لڑکی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔“

فریدی کوئی جواب دینے کی بجائے صرف برا سامنہ بنا کر رہ گیا۔

پندرہ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی اور فریدی نے ریسورکان سے لگاتے ہوئے کا

پنسل سنبھال لیا۔ اس نے بڑی تیزی سے پانچ نام اور پتے نوٹ کئے۔

موجد کی کہانی

ایک نوکر نے تنویر صدانی کی آمد کا اعلان کیا۔ وہ ایک دراز قد اور ڈبلا پتلا آدمی تھا۔

داڑھی مونچھوں سے بے نیاز اور سرائے کے چھلکے کی طرح شفاف تھا۔ صرف نچلے

ثیب میں تھوڑے سے بال تھے۔ جنہیں بڑی احتیاط سے گدی پر جمایا گیا تھا۔

”غالباً ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔“ فریدی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے

مسکرا کر کہا۔

”میں صرف قانون جانتا ہوں۔ بزنس کے نازک مسائل سے مجھے کوئی دلچسپی ہے۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔

”پانچ منٹ.....!“ تنویر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”مجھے صرف پانچ منٹ دیجئے سوچنے کے لئے“ آپ دس منٹ تک سوچئے لیکن میں آپ کے صرف اسی فیصلے کی قدر کر سکوں گا آپ ہر حال میں قانون کی مدد کریں گے۔“

”میں قانون اور اس کی اہمیت سے واقف ہوں۔“ اس کے لہجے میں بھی تلخی کی جھلک پائی گئی۔

حمید نے براہِ سامنے بنایا اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فریدی نے اشارے سے اسے روک دیا تنویر نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا اور آہستہ سے بولا۔ ”واقعی مجھے بتا دینا چاہئے؟ حالات ایسے ہوں تو.....!“ وہ پھر کچھ سوچنے لگا۔

حمید کو پھر اس پر غصہ آ گیا۔ اسے اس کی یہ حرکت کھل رہی تھی کہ وہ خواہ مخواہ اس کی طول دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

”آپ وقت برباد کر رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”ٹھہریئے جناب!“ تنویر آہستہ سے بولا۔ ”میں جس پوزیشن میں ہوں وہ.....!“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔ فریدی اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو جھجکا کے آثار تھے اور نہ الجھن کے۔ اس نے حمید کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی زبان بالکل بند رکھے۔ وہ تھوڑی دیر سر جھکائے کھڑا رہا پھر فریدی کی طرف دیکھ کر ایک طویل سانس لی بولا۔ ”نجی صاحب کی ہدایت تھی کہ ان کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ وہ کچھ دن گھر سے رہنا چاہتے ہیں..... کیوں؟ یہ میں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔“

”وہ ہے کہاں؟“ فریدی نے پوچھا۔

”دیکھیے ٹھہریئے میں بتاتا ہوں۔“ تنویر اس انداز میں دیکھنے لگا جیسے بیٹھنے کے لئے مناسب جگہ تلاش کر رہا ہو..... یہ واردات ہی والا کمرہ تھا۔

”آئیے میرے ساتھ۔“ فریدی نے کہا۔ ”آپ بہت زیادہ تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔“ ”ہی ہاں..... میں کئی دنوں سے طویل ہوں۔“

”اسی کمرے میں آئے جہاں فریدی نے نجی کی بیوی وغیرہ سے گفتگو کی تھی۔ تنویر بیٹھ گیا۔ حمید پاؤں سے تمباکو نکال کر پائپ میں بھرنے لگا۔

تنویر نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”ان کے خطوط روپ نمبر سے آتے ہیں جنکے جواب میں روپ کے پوسٹ ماسٹر کے توسط سے بھیجواتا ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ انکا قیام کہاں ہے۔“ ”آتی رازداری۔“ فریدی نے حیرت سے کہا۔ ”پھر خط و کتابت ہی کرنیکی کیا ضرورت ہے۔“ ”میرا خیال ہے کہ وہ مجبوراً خط و کتابت کرتے ہیں ورنہ شاید مجھے بھی اطلاع نہ ہوتی کہ انے کس لئے روپوشی اختیار کی ہے۔“

”مجبوری کیسی.....!“

”وہ اپنے ساتھ زیادہ رقم نہیں رکھ سکتے لہذا ان کے چیک میرے پاس آتے ہیں اور میں کیش کر کے رقم روپ نمبر کے پوسٹ ماسٹر کے توسط سے انہیں بھیج دیتا ہوں۔“

”اوہ..... مگر انہوں نے روپوشی کیوں اختیار کی ہے۔“

”یہی تو ایک مصیبت ہے۔“ تنویر ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ ”ان کی ہدایت ہے کہ ان کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔“

”خدا ارے اپنی ہی حد تک رکھے گا۔“ اس نے حمید کی طرف دیکھتے ہوئے فریدی سے کہا۔ ”آپ بہت دیر کر رہے ہیں۔“ فریدی بولا۔

”آپ جانتے ہی ہوں گے کہ نجی صاحب موجود ہیں۔ اب تک انہوں نے بہتری چھوٹی لیا ایجادات کی ہیں۔ آج کل بھی وہ ایک نئی ایجاد..... کی فکر میں ہیں لیکن.....!“

”خدا کے لئے مجھے“ لیکنوں“ کی تعداد پہلے سے نوٹ کر دیجئے۔“ حمید بول پڑا۔

فریدی نے اُسے گھور کر دیکھا۔

”میں مجبور ہوں۔ اس سلسلے میں میری زبان نہیں کھلتی۔“ تنویر نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

”براہ کرم گفتگو کو مختصر کیجئے۔“ اس بار فریدی نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا۔

”آپ نے کیپٹن برجس قدر کا نام سنا ہوگا۔“ تو اس کے لہجے سے متاثر ہو کر بولا۔ ”میں مجبوراً آپ کو سب کچھ بتا رہا ہوں۔ ورنہ یہ میرے ایک موکل کا راز ہے۔ میرا اگر آپ ہوتے تو آپ کا بھی یہی رویہ ہوتا۔ ہاں تو یہ برجس بھی بہترین چھوٹی موٹی چیز موجد ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے پروفیسر نجمی اور کیپٹن برجس قدر مشترکہ طور پر کام تھے۔ لیکن ایک بار برجس قدر نے بے ایمانی کی اس نے پروفیسر کی ایجاد چوری کر لی۔ پینٹ کرائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طویل جھگڑے کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ لیکن قدر نے پروفیسر کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک بار وہ تنہا ایک مشین کے سلسلے میں کچھ نئے کر رہے تھے۔ مشین کا ڈھانچہ مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن ایک رات پروفیسر کی وہ مشین چرائی پھر کچھ ہی دن بعد تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ اسے برجس قدر کے نام سے پینٹ سنا گیا اور پھر جلد ہی وہ بازار میں فروخت کے لئے بھی آ گئی۔ اب آپ خود ہی فیملہ ایسا مظلوم ایسے اوقات میں روپوشی کے علاوہ اور کس چیز کا سہارا لے گا۔“

”پروفیسر نے اس کے خلاف قانونی کارروائی کیوں نہیں کی۔“ حمید نے کہا۔

”قانونی کارروائی کیونکر ممکن تھی جب کہ..... ہاں سنئے۔ پروفیسر نے چوری کا درج کرادی تھی۔ انہوں نے اپنی مشین کے متعلق جو تفصیل دی تھی اس کے اعتبار سے دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ برجس قدر کی مشین کچھ تبدیلیوں کے ساتھ آئی تھی۔ ڈھانچہ تو بالکل ہی بدل گئی تھی۔“

”فریدی چند لمبے وکیل کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”مسٹر صدیقی..... کیا کی بیوی کا گذارہ آپ ہی کی وساطت سے ادا کیا جا رہا ہے۔“

”جی ہاں..... قطعی.....!“

”کیا وہ اس دوران میں آپ سے ملتی تھی۔“

”نہیں شاید پچھلے سال ان سے ملاقات ہوئی تھی۔“

”آپ کو یہ بھی نہ معلوم ہوگا کہ لاش کی اطلاع بھی مسز نجمی ہی نے پولیس کو دی تھی۔“

”ہاں.....!“ صدیقی نے ایک بیک کھڑا ہو گیا۔ ان کا منہ کھل گیا تھا۔ ”کک..... کک.....!“

”شریف رکھئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”آپ کو ان کی موجودگی پر اتنی حیرت کیوں ہے۔“

صدیقی ہلکا ہوا بیٹھ گیا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

”حیرت!“ وکیل بڑی طرح نزوس نظر آنے لگا تھا۔ ”حیرت..... دراصل اس بات پر انہوں نے لاش کی اطلاع کیسے دی..... کک..... کیا..... وہ یہاں اس گھر میں آئی.....“

”ہاں اس کا بیان ہے کہ وہ پچھلی رات کو یہاں آئی۔ رات بھر ہوٹل ڈی فرانس میں قیام کیا۔ وہ اس گھر میں آئی۔ وہ نجمی سے ملنے آئی تھی۔“

”اوہ..... اچھا.....!“ وکیل کے چہرے پر تشویش کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ وہ بولا۔ ”وہ..... میرا مطلب یہ ہے کہ میری موجودگی میں دونوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ہرے سے دور رہیں گے۔ اسکے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا، جو کچھ معلوم تھا وہ بتا چکا ہوں۔“

”نیر..... میں آپ کو مجبور نہیں کرتا لیکن براہ کرم پروفیسر نجمی کو بذریعہ تار مطلع کیجئے کہ ان کی موجودگی ضروری ہے۔ اشد ضروری۔“

”میں مطلع کر دوں گا۔“

صدیقی اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی فریدی اور حمید بھی اٹھے۔ انہیں باہر جانے کے لئے اس کے سامنے سے گزرتا پڑا جس میں واردات ہوئی تھی۔

”ایک منٹ اور مسٹر صدیقی۔“ فریدی نے اُسے کمرے کے دروازے کے سامنے روکتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس لڑکی کی خودکشی کی بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔“

وکیل چونک کر رک گیا۔

”خودکشی..... وہ آہستہ سے بولا۔ ”اگر ہو بھی تو مجھے کیا علم ہو سکتا ہے۔“

”نیر خیال ہے کہ آپ اس لڑکی کو قریب سے جانتے تھے۔“

”وہیے پروفیسر تو اس بات کا خواہش مند ہوگا کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔“
 ”ہرگز نہیں..... مسز نجمی ایک بیماری ہے۔ کون پسند کریگا کہ کوئی بیماری اس سے چمٹی رہے۔“
 ”ایک منٹ.....!“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”کیا مسز نجمی کو سیکریٹری پر بھی غصہ آ سکتا ہے۔“
 ”کیوں نہیں۔ یقیناً آ سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پروفیسر محض خوبصورت سیکریٹریوں کی
 سے اس میں دلچسپی نہیں لیتے اور وہ کئی بار کھلے ہوئے الفاظ میں پروفیسر پر آوارگی اور
 ان کا الزام لگا چکی ہے۔“

”آپ کی دانست میں پروفیسر کیسے سیکریٹر کا آدمی ہے۔“
 ”جیسے دنیا کے سب آدمی ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر آدمی کی رال خوبصورت عورتوں کے
 لپٹی رہتی ہے۔“

”جب پھر میں دنیا ہی میں نہ ہوں گا۔“ حمید اپنی نبض ٹٹولتا ہوا بولا۔
 ”یہ ایک عام بات ہے کیپٹن۔ ویسے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ دنیا میں ایسے آدمی نہ
 ہاں نہیں عورت سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔“

”چلے ٹھیک ہے..... ہاں تو پھر۔“ فریدی نے کہا۔
 ”پروفیسر کو بھی خوبصورت عورتوں سے دلچسپی ہے۔ مجھے اس کا علم ہے لیکن سیکریٹری سے
 بے تعلقات تھے اس کا علم مجھے نہیں ہے۔“

”بہر حال مسز نجمی سیکریٹریوں کو ہمیشہ بُری نظروں سے دیکھتی رہی ہے اور یہ بھی کہتی رہی
 ہاں کہ آخروہ مرد سیکریٹری کیوں نہیں رکھتے۔“

”سیکریٹری اس گھر کی مختار کل تھی؟“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں..... وہ اسی پر سارا گھر چھوڑ گئے تھے۔“

”معم موجودگی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ کیا پروفیسر کی موجودگی میں بھی اسے گھریلو

ملاقات میں دخل رہتا تھا۔“

”اس کے متعلق تو ملازمین ہی بہتر بتا سکیں گے۔“

”اسی حد تک کہ میں نجمی صاحب کا قانونی مشیر ہوں اور وہ نجمی صاحب کی سیکریٹری تھی۔“
 ”آپ اس کے کسی دوست سے بھی واقف ہیں۔“

”نہیں! میرا خیال ہے کہ وہ کوئی دوست نہیں رکھتی تھی۔ نجمی صاحب.....!“
 ”آپ جملہ پورا نہیں کرتے، مجھے بڑی شکایت ہے۔“ حمید پھر بول پڑا۔
 ”جی کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں، دراصل اس حادثے نے مجھے حواس باختہ کر دیا ہے
 ”نہ صرف حادثے نے بلکہ کچھ انہونی باتوں نے بھی۔“ فریدی اس کی طرف دیکھتا ہوا
 ”میں نہیں سمجھا۔“

”یہی کہ مسز نجمی صبح یہاں آئی تھی اور اس نے لاش کے بارے میں پولیس کو مطلع کیا
 ”جج..... جی ہاں۔“

”پھر آپ.....!“ فریدی کہتے کہتے رک گیا۔ وہ صمدانی کو گھور رہا تھا۔
 صمدانی چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”یہاں مجھے مسز تنویر کی موجودگی الجھن
 رہی ہے۔“

”کیوں.....؟ اوہ..... آپ نقاہت محسوس کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم بڑا
 کریں۔“ فریدی نے کہا اور پھر اسی کمرے کی طرف مڑ گیا جہاں سے کچھ دیر قبل اٹھا تھا۔
 وہ پھر وہیں آ بیٹھے۔ تنویر صمدانی کچھ توقف کے ساتھ بولا۔ ”وہ ایک انتہائی غصہ
 ہے۔ غصے کی حالت میں وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے۔ ایک بار اس نے غصے ہی
 میں پروفیسر نجمی پر گوشت کاٹنے کی چھری پھینک ماری تھی اور پروفیسر بال بال بچے تھے۔
 ”شکریہ۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”اب آپ کام کی باتیں کر رہے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے۔ مگر میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ سیکریٹری کی قاتل وہی ہیں۔“
 ”ضروری نہیں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”پروفیسر خود بھی اس سے بہت زیادہ خائف رہتے تھے۔ وہ بہت چالاک عورت
 طور پر علیحدگی کیلئے تیار نہیں ہوتی اور برابر جیتی رہتی ہے کہ گذارے کی رقم میں اضافہ کیا جائے

ایک خالی میز پر بیٹھ کر کھانا ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ان سے زیادہ دور نہیں تھا۔
 دھنسا سزنجی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہمیں آجائے نا۔“
 حمید اٹھا اور شکریہ ادا کر کے اس کی میز پر جم گیا۔
 ”کیا آپ لُچ کر چکے ہیں۔“ سزنجی نے پوچھا۔
 ”جی ہاں شکریہ۔“ حمید نے نکٹھیوں سے اس کی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جواب
 لپٹی نہیں لے رہی تھی۔
 ”دیکھئے مسٹر.....!“ اچانک سزنجی نے آگے جھک کر غیر متوقع طور پر کہا۔ آپ ا۔
 خواہ خواہ اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کر رہے ہیں۔“

”کیوں.....؟“

”مجھ پر قتل کا شبہ کر کے ثبوت کے لئے جھک مارا وقت کی بربادی ہی ہے جبکہ تین بجے
 پرو فیسر ہی گھر میں موجود تھا۔“
 ”کیا مطلب.....؟“

”میرے پاس اس کے لئے کافی ثبوت ہے کہ پرو فیسر سزنجی تین بجے گھر آیا تھا۔“
 حمید تحیرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ اس کی لڑکی میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

قتل یا خودکشی

”مئی..... پلیز.....!“ اس کی لڑکی بڑبڑائی لیکن سزنجی اس کی طرف دھیان دیئے بغیر
 کھتی رہی۔ ”مکان کی پشت پر ایک دیسی عیسائی عورت رہتی ہے اس نے پرو فیسر کو پچھلی رات
 ٹکڑا کر ڈال دیا۔“ عمارت میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔“
 ”کیا وہ تین بجے پرو فیسر کا انتظار کر رہی تھی۔“ حمید نے کہا۔

فریدی نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں اور حمید اکتا اکتا
 سا نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً تو یہ صدمہ ان کی خود ہی بولا۔ ”میں نے سزنجی کے متعلق جو کچھ بتایا ہے اُس
 ذرا برا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ غصے کی حالت میں اس سے دیوانوں کی سی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔
 ”ہوں.....!“ فریدی بہت غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اُس
 ہوئے کہا۔ ”اچھا مسٹر صدمہ انی آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے حتی الامکان میری مدد کی
 اور مجھے توقع ہے کہ آپ آئندہ بھی میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ براہ کرم پرو فیسر کو جلد از جلد حالاً
 سے مطلع کر کے یہاں بلوائے۔“
 ”میں آج ہی انہیں تار دوں گا۔“ تو یہ نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد فریدی اور حمید واپس ہو رہے تھے۔ تو یہ جا چکا تھا۔ کار کی رفتار زیادہ
 نہیں تھی۔ البتہ حمید ہزاروں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جرائم اور مجرموں کو گالیاں دے رہا تھا۔
 فریدی خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی بکواس سن ہی نہ رہا؛
 پھر حمید خود بخود ہی آزاد ہو گیا۔ فریدی نے سول ہسپتال کے قریب کار روکی اور یہ کہہ
 اتر گیا۔ ”تم گھر جاؤ..... میں ابھی آ رہا ہوں۔“

لیکن حمید نے سوچا کہ وہ گھر کیوں جائے۔ ہوٹل ڈی فرانس کیوں نہ جائے۔؟
 پرو فیسر سزنجی کی بیوی اپنی لڑکی کے ساتھ مقیم تھی۔ اگر وہ تنہا مقیم ہوتی تو حمید اُسے معاف کر
 مگر ایسی صورت میں جبکہ وہ ایک خوبصورت لڑکی کی ماں تھی۔ حمید اس پر قاتلہ ہونے کا
 کر کے اس کی لڑکی کی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکتا تھا۔

اس نے کار اسٹارٹ کی اور گھر جانے کی بجائے ہوٹل ڈی فرانس پہنچ گیا۔ آدمی تو
 قدر کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اگر تقدیر گھر پہنچانے کی بجائے کسی خوبصورت لڑکی کی طرف
 دے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔

سزنجی شاید اسے دور ہی سے پہچان گئی تھی۔ کیونکہ اسے دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر سلو
 پڑ گئیں۔ وہ دونوں ماں بیٹی حمید کو ڈائینگ ہال میں دوپہر کے کھانے کی میز پر نظر آئیں۔

ت میں ہوٹل سے چلا جانا چاہتا تھا۔ وہ باہر نکل کر دوسری طرف سے ہوٹل کی اوپر والی
بڑھا گیا۔ اوپر کی گیلری میں بھی کچھ کیمین تھے جن میں سے کسی ایک میں بیٹھ کر وہ ان
پر غولی نظر رکھ سکتا تھا۔

چل قدم کر کے لڑکی اٹھ گئی۔ لیکن مسز منجی بدستور بیٹھی رہی۔ حمید سوچنے لگا کہ وہ وہیں بیٹھے
کے پیچھے جائے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اسے وہیں بیٹھنا چاہئے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے لڑکی کو واپس آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا
ب تھا۔

وہ میز کے قریب آئی۔ مسز منجی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے اس کے ہاتھ سے
لے لیا۔ شاید وہ تنہا کہیں جانے کے لئے تیار تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اٹھی اور ڈائینگ ہال
اگر نکل گئی۔ لڑکی وہیں کھڑی چاروں طرف دیکھتی رہی۔ پھر حمید نے کیمین کے پردے سے
اگر اسے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔

بچے آنے پر اس نے کہا۔ ”فرمائیے..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“
”میرے ساتھ آئیے۔“ وہ تیزی سے ایک طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ حمید اس کے ساتھ
لگا وہ اسے اس کمرے میں لائی جہاں ان کا قیام تھا۔

”میں نے آپ کو..... اس لئے..... روکا تھا۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی اور
ڈٹ ہو گئی۔ حمید خاموش رہا۔ لڑکی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”مئی بہت غصہ ور ہیں۔ غصے کی
ت میں ان کی عقل سلب ہو جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھتیں کہ وہ کیا کر رہی ہیں یا کیا کہہ رہی
ہیں۔ پاپا سے ان کی لڑائی ہے اور وہ ہمیشہ ان پر خار کھاتی رہی ہیں اس لئے ابھی انہوں نے جو
نوٹ لکھا ہے آپ اس پر یقین نہ کیجئے گا۔“

”آپ کو پاپا سے ہمدردی ہے۔“

”کیوں نہ ہو! کیا دنیا کے کسی آدمی کو اپنے باپ سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔“

”پھر آپ ان سے علیحدہ کیوں ہو گئی ہیں۔“

”میں نہیں سمجھی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

”مطلب یہ کہ وہ تین بجے رات کو کیا کر رہی تھی کہ پروفیسر اسے اس طرح نظر آیا۔“

”یہ آپ اسی سے پوچھئے گا۔“ مسز منجی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”اس کا نام

لاڈیل ہے۔ ہمارے مکان کی پشت پر اس کا چھوٹا سا مکان ہے۔“

”خیر ہم اسے بھی چیک کریں گے۔“ حمید نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مسز

سر جھکائے کھاتی رہی۔ دفعتاً لڑکی نے حمید کو کچھ اشارہ کیا لیکن حمید نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا

چاہتی ہے۔ اس نے دوبارہ استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس بار اس کی کچھ

آگیا کہ وہ کچھ کہنے کے لئے اسے وہاں روکنا چاہتی ہے۔ حمید پھر مسز منجی کی طرف دیکھنے

جواب بھی اسی طرح سر جھکائے کھا رہی تھی۔

”اس اطلاع پر میں آپ کا مشکور ہوں مسز منجی..... میں دیکھ لوں گا کہ آپ کا بیان کم

تک صحیح ہے۔“

”مسز لاڈیل سے ضرور ملے۔“

”اوہ..... ہاں ایک بات اور..... پروفیسر کا قانونی مشیر صدائی کیا آدی ہے۔“

اٹھتے اٹھتے رک گیا۔

”میں سوال کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”مطلب یہ کہ کیا وہ قابل اعتماد آدمی ہے۔“

”اوہ..... تو کیا وہ آپ لوگوں کو میرے خلاف بہکانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔“

”نہیں! ابھی تک ہم اس سے ملے بھی نہیں۔“ حمید نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ میرے خلاف زہر اگلنے کی کوشش کرے کیونکہ وہ صرف مشیر قانون

نہیں بلکہ پروفیسر کا دوست بھی ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتا رہا ہے کہ ہم دونوں میں

طور پر علیحدگی ہو جائے۔“

”اچھی بات ہے۔ میں اسے بھی دیکھ لوں گا۔“ حمید نے کہا اور اٹھ گیا..... بظاہر

”یہی برسبیل تذکرہ..... کس نے بتائی تھی یہ میں نہ بتا سکوں گا۔“
 لڑکی سوچنے لگی۔ پھر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نہیں یہ غلط ہے کسی نے آپ کو
 اپرگٹنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً وہ اس قتل کومی کے سر منڈھنا چاہتا ہے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔“

”کیوں نہیں..... جب وہ غصے میں پایا پر چھری پھینک سکتی ہے تو غصے کی ہی حالت میں
 بڑی کو بھی قتل کر سکتی ہیں۔“

”آپ واقعی بے حد ذہین ہیں لیکن ہم ان لائون پر نہیں سوچ رہے ہیں آپ کی می تو
 رات آپ کے اٹھ ہی رہی تھیں۔ صرف اس بناء پر انہیں قاتل تو نہیں قرار دیا جاسکتا کہ وہ
 رہیں۔ دنیا کے بہترے آدمی بہت زیادہ غصہ ور ہیں۔ لیکن وہ قتل تو نہیں کرتے پھرتے۔ میں

ناتفاقا اُدھر آ نکلا تھا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس سلسلے میں آپ لوگوں سے گفتگو کی جائے۔“
 لڑکی خاموش ہو گئی۔ اس وقت اسے لڑکی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن وہ
 انہیں لگا سا وہ کس قسم کی لڑکی ہے۔

لڑکی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”آخر پایا اس طرح کسی کو اطلاع دیئے بغیر کہاں غائب ہو گئے ہیں۔“
 ”پتہ نہیں۔“ حمید بولا۔ پھر اس نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ”آپ میرا فون نمبر نوٹ
 لے لیں۔“

لڑکی نے فون نمبر نوٹ کر لیا اور حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”اب اجازت دیجئے۔“
 لڑکی کے چہرے سے تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر حمید سے مصافحہ کیا لیکن
 اسے تک چھوڑنے نہیں آئی۔ حمید نے اس کی آنکھوں میں الجھنیں دیکھی تھیں۔

ہٹل سے نکل کر اس نے ایک دو فروش کی دوکان سے فریدی کو فون کیا۔

سب سے پہلے اس نے سول ہسپتال ہی کے نمبر ڈائل کئے۔ فریدی اب بھی وہیں تھا
 حمید کو کچھ دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ پھر فریدی کی آواز سنائی دی۔

”آپ ابھی تک یہیں ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”میں علیحدہ نہیں ہوئی اس کی تمام تر ذمہ داری می پر ہے۔ میں ان سے بہت ڈرتی ہوں
 اس لئے مجھے وہی کرنا پڑتا ہے جو وہ کہتی ہیں۔ انہوں نے علیحدگی اختیار کی اور مجھے بھی اس
 ساتھ گھسیٹ لے گئیں۔“

”تو انہوں نے مزلا ذیل کی جو کہانی سنائی ہے اسے میں غلط سمجھوں۔“

”ممکن ہے مزلا ذیل کو دھوکہ ہوا ہو۔ وہ کوئی اور ہوئے وہ پایا سمجھ بیٹھی ہو۔“

”کیا مزلا ذیل آپ کی می کی گہری دوست ہے۔“

”مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ ویسے میں اتنا جانتی ہوں کہ می دیسی عورتوں سے بہت نفرت
 کرتی ہے۔ مزلا ذیل دیسی عورت ہے۔ لہذا میری دانست میں اس سے دوستی کا سوال
 پیدا نہیں ہوتا۔“

”شکریہ۔“ حمید نے سہارا کر کہا۔ ”آپ بہت ذہین معلوم ہوتی ہیں۔“

”کیوں.....؟“

”یہ آپ کا انداز گفتگو کہتا ہے ہم لوگوں کو اپنے سوالات کے اتنے واضح جواب نہ
 ملتے۔ دیکھئے سوالات کو سمجھنا اور مناسب جواب دینا بھی بڑا مشکل فن ہے۔ اسی لئے میں آپ
 بہت زیادہ ذہین سمجھنے پر مجبور ہوں۔ اس کے برخلاف آپ کی می..... مگر ہاں وہ غصہ ور ہیں
 جواب دیتے وقت انہیں غصہ آ جاتا ہے اس لئے ان کے جوابات واضح نہیں ہوتے۔“

”جی ہاں..... یہی بات ہے۔ انہیں بہت شدت سے غصہ آتا ہے۔“

”اب اس سے زیادہ شدت اور کیا ہوگی کہ ایک بار انہوں نے نجی صاحب پر چھری
 ماری تھی۔“ حمید نے کہا اور لڑکی دفعتاً زرد ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور
 نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بدقت کہا۔ ”کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے۔“

”مگر یہ اطلاع ایک بہت ہی معتبر آدمی سے ملی تھی۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”یہ..... یہ..... آخر کس نے یہ بات کس سلسلے میں آپ کو بتائی تھی۔“ لڑکی نے کہا۔

کے چہرے کی زردی بدستور قائم تھی۔

”ہاں میں کوشش کر رہا ہوں کہ پوسٹ مارٹم جلد ہو جائے۔ کیوں کیا بات ہے۔“
 ”پچھلی رات پروفیسر تقریباً تین بجے اپنے مکان کی پشت پر دیکھا گیا ہے۔“
 ”یہ خبر کہاں سے لائے۔“

”پروفیسر کے مکان کی پشت پر کوئی مسز لاڈیل رہتی ہے اس نے دیکھا تھا۔“
 ”بھئی یہ اطلاع کس سے ملی ہے۔“

”پروفیسر کی بیوی سے، مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ہوٹل ڈی فرانس میں مقیم ہے بس اس ملاقات ہو گئی۔“

”ہاں! اگر وہ تنہا ہوتی تو شاید اس قسم کا اتفاق کبھی نہ ہوتا۔“ فریدی نے طنزیہ لہجے میں
 ”مسز لاڈیل کو میں چیک کروں۔“

”نہیں میں اسے چیک کر لوں گا۔ تم فنگر پرنٹ سیکشن کو دیکھو۔ مجھے بہت جلد رپورٹ چاہیے۔“
 ”اچھی بات ہے، لیکن اب آپ کو کہاں فون کیا جائے۔“

”تم دیکھا کو فون کر کے اس سے معلوم کر سکو گے، میں اسے اپنے متعلق اطلاع دیتا ہوں!“
 ”یہ خدمت آپ نے کسی مرد کے سپرد کیوں نہیں کی۔“

لیکن فریدی نے اس کا جواب دیئے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

حمید دوا فروش کی دوکان سے نکل کر آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ فریدی کا مقصد شا
 تھا کہ حمید فنگر پرنٹ سیکشن والوں کے سر پر سوار ہو کر جلد از جلد رپورٹ تیار کرائے۔
 رپورٹ مل گئی لیکن ساتھ ہی حمید کی بانجھیں بھی کھل گئیں کیونکہ یہ سو فیصدی خودکشی
 کیس تھا۔ ریوالور کے دستے پر مرنے والی بی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔

اس نے فون پر دیکھا کہ نمبر ڈائل کئے۔

”ہیلو.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”آف وی آواز ہے..... بالکل وی آواز ہے۔“ حمید نے آواز بدل کر کہا۔

”کون ہے۔“ دیکھا غرائی۔

”ڈاکٹر ٹیل.....!“ حمید نے قہقہہ لگایا۔

”ایک شعر سن لو..... تم اچھی خاصی اردو جانتی ہو۔“

ہزار جان گرامی فدا بہ ایں نسبت

کہ اپنی ذات سے میرا پتہ دیا تو نے

”جو اس مت کرو۔ کرٹل صاحب تھری سیکس ایٹ ناٹ پر ملیں گے۔“

”آج شام کو کہیں ملو۔ میں نے قوم کی بد نصیبی پر ایک تقریر تیار کی ہے۔“

دیکھانے دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا۔ حمید نے اس کے بتائے ہوئے نمبر
 کئے۔

”کرٹل فریدی..... پلیز.....!“ حمید نے کال ریسیو کرنے والے سے کہا۔

”ہولڈ آن کیجئے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد کہا گیا۔ وہ تائمن
 بس ایٹ پر ملیں گے۔

اب حمید نے ان نمبروں پر رنگ کیا۔ لیکن یہاں سے بھی ایک تیسرا نمبر بتا دیا گیا۔ آخر
 زبان پانچ مختلف نمبروں پر رنگ کرنے کے بعد فریدی سے رابطہ قائم ہو سکا۔

حمید نے اُسے فنگر پرنٹ سیکشن کی رپورٹ سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”بس اب واپس آجائیے۔ کھیل ختم ہو گیا۔“

”کھیل تو اب شروع ہوا ہے فرزند۔“ فریدی نے جواب دیا۔ ”میں اب گھر ہی آ رہا
 وہیں چلو۔“

حمید نے سلسلہ منقطع کر کے گھر کی راہ لی۔ اس کے ذہن میں فریدی کا جملہ کھیل تو اب
 نا ہوا ہے۔ بار بار گونج رہا تھا۔ کبھی اس کے ہونٹ سکڑتے اور کبھی وہ دانت پیمیلکتا۔ وہ

ٹارہا تھا کہ اب ایک بات زبان سے نکل گئی ہے خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے وہ بات پتھر
 الیکٹرک کی طرح اٹل رہے گی۔ اگر وہ خودکشی ہی کا کیس ہوگا تب بھی اسے کھینچنا کر قتل کے

لہجہ چلایا جائے گا۔

مگر پتھر کراس نے لباس تبدیل کیا اور ریڈیو کھول کر فرانسیسی موسیقی سے دل بہلانے لگا۔

”جی کہ اگر اس نے نجی کی واپسی کے بعد خودکشی کی ہوگی تو اس سے نجی پر کیا اثر پڑے گا۔“
 ”کچھ نہیں سوائے اس کے کہ ایسی صورت میں نجی کو خودکشی کے اسباب پر روشنی ڈالنی
 اور اگر اس سے پہلے ہی خودکشی کر چکی تھی تو نجی نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی۔“
 ”نہریے۔“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”آخر آپ نے لاڈیل کے بیان پر یقین کیسے
 لگے ہیں کہ مسز نجی نے اسے اس غلط بیانی کے لئے تیار کیا ہو۔“

”میں کب کہتا ہوں کہ ایسا نہ ہوا ہوگا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے پروفیسر کو چھانسی
 کا تہیہ کر لیا ہے۔“

”میں کہتا ہوں کہ اس قصے کو ختم کیجئے۔ ضروری نہیں کہ یہ قتل ہی ہو۔ آپ کبھی سیدھے
 پہلے ہی نہیں سکتے۔“

”میں یہ بھی نہیں کہتا کہ یہ قتل ہی کا کیس ہے۔ مگر کیا خودکشی کے اسباب کا پتہ لگانا
 فرائض سے خارج ہے۔“

”خودکشی کی وجہ معدے کی گرانی بھی ہو سکتی ہے۔“ حمید بولا۔ ”آپ پیگن کا بھرتا کھا
 دیکھئے بعد ہی دل چاہے گا کہ خودکشی کر بیٹھو۔“

”ہلودہ معدے کی گرانی ہی سہی لیکن پھر آخر تمہارے نکتہ نظر کے مطابق نجی کی بیوی نے
 لاڈیل کو غلط بیانی پر کیوں آمادہ کیا؟“

”نہریے وہ اسی طرح نجی کا خاتمہ چاہتی ہو۔“

”پھر یہ سازش ہوئی نا..... اگر یہ سازش ہے تو حکمہ سراغ رسانی کا کوئی فرد اس کی طرف
 لگاؤ نکلیں کیسے بند کر سکتا ہے۔“

”نہری طرف سے آپ آنکھیں بھی کھلی رکھئے اور ضرورت پڑے تو عینک بھی استعمال
 کیجئے۔“ حمید جھلا گیا۔ لیکن فریدی اس کی پرواہ کئے بغیر کہتا رہا۔ ”سکریٹری کیچملی رات بڑے
 مؤثر تھیں۔ نوکروں کا بیان ہے کہ وہ اسے پیانو بجاتا ہوا چھوڑ کر گئے تھے۔ اگر خودکشی کسی
 ناکام تجربہ ہوتی تو وہ اتنے اچھے موڈ میں نہ پائی گئی ہوتی اور اگر وہ کسی الجھن ہی کا نتیجہ تھی تو بہت

جب اس سے بھی دل نہ بہلا تو جرمنی پر طبع آزمائی کی لیکن آخر کار بی بی سی کی ٹی وی
 آئی ٹی گئی کچھ دیر تک تو وہ منتار ہا مگر جب مینڈھے سے لڑنے لگے تو اس نے ریڈیو بند کر کے اس
 سے سرگرمی کا ارادہ کیا۔ پتہ نہیں ریڈیو کا کیا حشر ہوتا لیکن ٹھیک اسی وقت فریدی آ گیا۔
 اس نے اسے کمرے سے آواز دی۔ حمید طوعاً و کرہاً اٹھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اب اس کا اس کمرے
 میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

”کیوں بھی۔“ فریدی اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”تمہارے چہرے پر جاکتی کیوں سوار ہے۔“
 ”ملک الموت سے دوستی کرنے کا نتیجہ بھگت رہا ہوں۔“

”تم نے اس وقت بڑا کام کیا۔“
 ”کیا.....؟“

”مسز لاڈیل کی دریافت..... یہ عورت کام کی معلوم ہوتی ہے۔“
 ”بڑھیا ہی تو کام کی ہوتی ہیں۔“ حمید نے جملے کبے لہجے میں کہا۔

”اور ساتھ ہی وہ سیاہ فام بھی ہے۔“
 ”کرڈالے شادی۔ آج کل میرا بکرا بہت اداس رہتا ہے۔“

”مسز لاڈیل کا بیان ہے کہ اس نے تین بجے شب کو اسے دیکھا تھا۔“ فریدی نے
 کی بکواس پر دھیان دیئے بغیر کہا۔ ”وہ جیب سے اتر کر عقبی دروازے کو کھول رہا تھا۔“

”ختم بھی کیجئے۔ ریوالور کے دستے پر مرنے والی بیٹی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ آ
 آپ خواہ مخواہ اسے قتل کا کیس بنا بنے پر کیوں تل گئے ہیں۔“

”اگر وہ خودکشی ہی ہے تو تین بجے پروفیسر کی موجودگی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہنا
 پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق موت تین اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔“

”ہو سکتا ہے کہ نجی صرف پندرہ منٹ ٹھہر کر واپس چلا گیا ہو اور اس کے جانے کے
 منٹ بعد اس نے خودکشی کر لی ہو۔“

”پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو!“

دیا جو اسے اپنے تار کے جواب میں پروفیسر کی طرف سے موصول ہوا تھا۔
پیغام تھا ”میں نہیں آ سکتا۔ ایک مفصل خط لکھ رہا ہوں۔ کرل سے کہو کہ دو چار دن مجھے
پر مجبور نہ کریں۔ ورنہ میری ساری محنت برباد ہو جائے گی۔“

فریدی نے پیغام پڑھ کر فارم اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”پروفیسر کی واپسی بہت
اچھے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے سختی نہ کرنی پڑے۔“

”میں کیا بتاؤں کرل۔ پروفیسر بہت خدی آدمی ہیں۔“ صدائی نے کہا لیکن فریدی نے
میں کہا۔ حیدر البتہ صدائی کو کینہ تو نظروں سے گھور رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ”کیا آپ ہمیں سیکریٹری کی بچھلی زندگی سے متعلق کچھ بتا سکیں گے۔“

”نہیں جناب! میں بھلا اس کی بچھلی زندگی کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں۔“

”اس کا نام ڈوروتھی تھا۔“

”جی ہاں..... میں اسی نام سے جانتا ہوں۔“

”صدائی صاحب! کیا ڈوروتھی خودکشی بھی کر سکتی تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”دنیا کا ہر آدمی خودکشی کر سکتا ہے، کرل کیا خودکشی کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں۔“

”نہیں..... ایک فیصد بھی نہیں۔ حالانکہ ریوالور کے دستے پر صرف اسی کی انگلیوں کے

ملے ہیں اور ریوالور کا ایک ہی جیمیر خالی ہے۔ پانچ میں گولیاں موجود ہیں۔“

”اور آپ اسکے باوجود بھی اسے خودکشی کا کیس نہیں سمجھتے۔“ صدائی نے حیرت سے کہا۔

”جی ہاں..... میں اسے خودکشی کا کیس نہیں سمجھتا کیونکہ میں نے ایک گولی کمرے کی

سے بھی نکالی ہے اور زخم کی حالت سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ گولی قریب سے چلائی گئی

”کئی کرنوالے عموماً ریوالور کی نالی کپٹی پر رکھ لیتے ہیں۔ لہذا اس صورت میں زخم کے گرد

کے نشانات لازمی طور پر ملنے چاہئیں۔ لیکن مرنے والی کی کپٹی کی کھال پر اس قسم کے

نشانات پائے گئے۔ زخم کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ گولی کافی فاصلے سے چلائی گئی۔“

”تو..... یقیناً..... مگر آخر اسے قتل کس نے کیا۔“ صدائی نے تشویش کن لہجے میں

پہلے اسکے ذہن میں خودکشی کے خیال نے سر ابھارا ہوگا۔ ایسی صورت میں خودکشی کا فیصلہ اچانک
ہوتا۔ ہفتوں تو خیال ذہن ہی میں پکتا رہتا ہے۔ اگر وہ بہت دنوں سے خودکشی کیلئے سوچ رہی ہو
اس نے ریوالور کیوں استعمال کیا۔ جب کہ اسے کسی قسم کے زہر آسانی سے مل سکتے تھے۔
”زہر آسانی سے نہیں ملا کرتے۔“ حید نے کہا۔

”پروفیسر کی تجربہ گاہ میں پوٹاشیم سائیٹرائیڈ تک موجود ہے اسے خریدنے کیلئے بازار
پڑتا۔ پھر دوسری بات یہ کہ بغیر لائسنس کا ریوالور رکھنا زہر حاصل کرنے سے زیادہ مشکل کام۔

”میں سمجھا تھا کہ ریوالور پروفیسر کا ہوگا۔“

”نہیں..... آج تک اس کے نام سے ریوالور کا کوئی لائسنس نہیں الیٹو کیا گیا۔“ فر

نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں اسے خودکشی کا کیس تسلیم کر لوں تب بھی پیچھا نہیں چھو

گا۔ اس صورت میں ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ اسے ریوالور ملا کہاں سے تھا اور اگر وہ

بغیر لائسنس کا ریوالور رکھتی تھی تو اسے یقیناً ایک خطرناک عورت تسلیم کرنا پڑے گا۔“

”آپ اسے ظن کی چچی تسلیم کیجئے۔ مجھے ذرہ برابر بھی تشویش نہ ہوگی۔“

فریدی کو حید کی جھلٹ پر ہنسی آ گئی اور اس نے کہا ”ہر حال میں ہمیں یہ کیر

پڑے گا۔ خواہ وہ خودکشی ہو۔ خواہ قتل، بغیر لائسنس کے ریوالور کا مسئلہ ہمیں اس وقت

الجماعے رکھے گا جب تک کہ ہم یہ نہ معلوم کر لیں کہ وہ مرنے والی کو کیسے اور کہاں ملا تھا۔“

خستہ حال لڑکی

حید اس سے الجھتا ہی رہا۔ مگر پھر فریدی نے مزید وضاحت نہیں کی، شاید وہ خود ہی
اس مسئلے پر کوئی ڈھنگ کی بات نہیں سوچ سکا تھا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح پروفیسر غنچی کا وکیل صدائی آ گیا۔ اس نے فریدی کے سامنے

کہا۔ ”جہاں تک مجھے علم ہے وہ ایک شریف اور سلیم الطبع لڑکی تھی۔ میں نے آج تک اس کی کسی ملنے والے کو پروفیسر کی کوشی میں نہیں دیکھا۔“

”اب آپ نے بھی دوسری راہوں پر بھٹکتا شروع کر دیا مسٹر صدانی۔“ فریدی بولا۔ ”حالانکہ کل آپ نے مسز نجی کے غصے کا تذکرہ کرتے وقت.....“

”دیکھئے ٹھہریئے۔“ صدانی بول پڑا۔ ”مجھے غلط نہ سمجھئے۔ میں نے یونہی برسرِ بات کہہ دی تھی۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ مسز نجی پر کسی قسم کا الزام رکھوں۔“

”آپ رکھئے یا نہ رکھئے وہ پرسوں رات تقریباً ڈیڑھ بجے ہوٹل سے باہر گئی تھیں وہاں چیک کر چکا ہوں۔“

”میرے خدا.....!“ یک بیک صدانی کے ہونٹ خشک نظر آنے لگے۔

اور پھر اس کی واپسی تقریباً ساڑھے تین بجے ہوئی تھی۔ پچھلی رات خود اس نے اعتراف کر لیا ہے کہ وہ ڈیڑھ سے ساڑھے تین بجے تک ہوٹل ڈی فرانس سے باہر رہی۔ ”اس نے اعتراف کر لیا ہے۔“ صدانی نے نحیف آواز میں کہا۔

”اگر نہ کرتی تو اس سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ میں نے مقامی ہوٹلوں کے نئے قوانین وضع کرائے ہیں جن کے تحت قیام کرنے والے مسافروں کے لئے لازماً ہے کہ وہ رات گئے باہر جاتے وقت اپنی روانگی ایک رجسٹر میں درج کریں جہاں جا ہوں وہاں کا حوالہ دیں۔ کسی سے ملتا ہو تو اس کا نام اور پتہ تحریر کریں بہر حال وہ دوست سے ملنے گئی تھی۔ اس نے اس کا نام اور پتہ تحریر کیا تھا۔“

”پھر آپ نے اس ملنے والے کو بھی چیک کیا ہوگا۔“

”یقیناً..... وہ دو سے تین بجے تک اس کے ساتھ شراب پیتی رہی۔“

”اوہ..... جب تو ٹھیک ہے۔“

”کیا ٹھیک ہے۔“

”بات دراصل یہ ہے کرنل..... میں پروفیسر کے خاندان کا خیر خواہ ہوں۔“

پروفیسر کے لئے یہ ایک بہت بڑا داغ ہوگا اگر اس کی بیوی کے خلاف اس قسم کا کوئی ثابت ہو سکا۔“

”اب ہمیں کہاں جانا ہے۔“ فریدی نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔ حمید سمجھ گیا کہ وہ صدانی بلانا چاہتا ہے۔

”آفس.....!“ حمید بولا۔

”اجازت ہے۔“ صدانی نے اٹھنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... ضرور..... لیکن ہو سکتا ہے کہ پھر کسی وقت آپ کو تکلیف دی جائے۔“

صدانی چلا گیا۔ حمید خاموش ہو گیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”تو اب یہ سچ سچ قتل کا پس بن گیا ہے۔“

”ہاں..... اب اٹھو۔ آفس جانے سے پہلے مسز لاڈیل سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”اس سے آپ مل چکے ہیں۔“

”ہاں..... آج پھر۔“ فریدی بولا۔ ”کل میں نے اس سے یونہی مختصر سی گفتگو کی تھی۔“

”نہ آج دیکھوں گا کہ وہ بتائی ہوئی گواہ تو نہیں ہے۔“

”خیر اسے چھوڑیئے۔ آپ کہتے ہیں کہ مرنے والی کے ریوالور کا جیسیر خالی تھا۔ لیکن کیا

اگلی جو اس کی کھوپڑی سے نکالی گئی ہے اسی ریوالور کی نہیں تھی۔“

”اسی ساخت کے دوسرے ریوالور کی گولی کبھی جاسکتی ہے۔ اس ریوالور کی نہیں ہو سکتی۔“

”تو گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اتفاق سے قاتل کے پاس بھی اسی ساخت کا ریوالور

نہ تھا اور ڈور تھی نے اس پر فائر کیا لیکن گولی دیوار پر لگی پھر قاتل نے فائر کر دیا اور گولی اس کی گولی پر لگی۔“

”فی الحال میرا یہی خیال ہے۔“

”لیکن قاتل نے خود سے اسے خودکشی کا کیس بنانے کی کوشش نہیں کی۔“

”تمہارا یہ خیال بھی درست ہے ورنہ وہ کم از کم دیوار والی گولی تو نکال ہی لے جاتا اور

کچھ دور کا پلاسٹر اس طرح اکھاڑ دیتا کہ وہ گولی کا نشان معلوم نہ ہوتا۔

حمید خاموش ہو گیا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔

”دیکھو..... کون ہے۔“ فریدی نے کہا۔ حمید نے ریسور اٹھالیا۔

”ہیلو.....!“

”ہیلو..... ہیلو.....!“ دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔ ”میں صوفیہ نجی ہو پروفیسر نجی کی لڑکی۔ کل آپ نے مجھے اپنا فون نمبر دیا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ فون پر آپ ہیں یا اور کوئی ہے۔ میں آپ کا نام نہیں جانتی۔“

”ہاں میں ہی ہوں۔ کل میں نے آپ کو اپنا فون نمبر دیا تھا مجھے کیپٹن حمید کہتے ہیں۔“

”اوہ..... کیپٹن آپ نے کہا تھا کہ جب ضرورت ہو مجھے فون کر دیتا۔“

”جی ہاں..... میں نے کہا تھا۔“

”میں بہت شدت سے آپ کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں..... فوراً آئیے۔“

حمید فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”آدھ گھنٹے کے اندر ہی اندر۔ اس وقت ساڑھے نو بجے ہیں۔ اگر آپ آدھے گئے

آئے تو پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔“

”بات کیا ہے۔“

”بات فون پر نہیں بتا سکتی۔ ویسے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”میں آ رہا ہوں۔“

”کون تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نجی کی لڑکی۔ اس نے مجھے آدھ گھنٹے کے اندر ہی اندر بلایا ہے۔“ حمید نے

فریدی کو پوری تجویزیشن سے آگاہ کر دیا۔

”ممکن ہے اس سے کوئی نئی بات معلوم ہو سکے۔ تم جاؤ۔ میں لاڈیل کو چیک کروں

”گاڑی لے جاؤں۔“

”نہیں تم اسٹیشن وگین نکال لو۔“

”خود لنکن پر چلیں گے اور میں چھکڑا نکال لوں۔“ حمید نے برا سامنے بنا کر کہا۔

”میں نکال لوں گا چھکڑا..... اب تو دفع ہو جاؤ۔“

حمید نے باہر آ کر گیراج سے لنکن نکالی اور ہوٹل ڈی فرانس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے

نمی کہ وہ ڈائیننگ ہال ہی میں ملے گی۔ لیکن وہ وہاں کہیں نظر نہ آئی۔ اوپر کی گیلری میں بھی

اچھان کر دیکھ کر وہاں کی طرف چل پڑا جہاں ان کا قیام تھا اور اسی کمرے کے سامنے رکا جس پر

دن اس نے اس سے گفتگو کی تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک کا جواب بہت ہی دھیمی آواز

لا۔ پھر حمید نے قدموں کی آواز سنی۔

”کون ہے۔“ صوفیہ نے آہستہ سے کہا۔ حمید اس کی آواز پہچان گیا تھا۔

”کیپٹن حمید۔“

”اوہ..... کیپٹن!“ صوفیہ نے جواب دیا۔ ”یہ دروازہ باہر سے مقفل ہے۔ کنجی دیوار سے

ہوگی۔ براہ کرم قفل کھولے۔“

حمید نے تھیرانہ انداز میں کنجی کے سوراخ کی طرف دیکھا پھر دیوار سے لٹکی ہوئی کنجی پر

رہا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

”کیپٹن.....!“ اندر سے کپکپاتی ہوئی سی آواز آئی۔ ”آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”اوہ..... ہاں.....!“ حمید چونک کر بولا۔ ”ٹھہریے! میں قفل کھولنے جا رہا ہوں۔“

”شکریہ! جلدی کیجئے۔ صرف دس منٹ اور رہ گئے ہیں۔“

حمید نے قفل کھول کر دروازے کو دھکا دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس کے منہ سے

ایک تھیرانہ سی آواز نکلی کیونکہ یہ پچھلے دن کی حسین صوفیہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بال

الٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر خراشیں تھیں اور کہیں کہیں نیل بھی نظر آ رہے تھے اور شاید ٹھوڑی اور

گردن پر کسی نے بڑی بے دردی سے اپنے تیز ناخن چھائے تھے۔

مزنجمی نے دوسرا قدم اٹھایا اور پانچ یا چھ میڑھیاں طے کر کے حمید کے قریب پہنچ گئی۔
 ”کیوں؟“ اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔
 ”کچھ بھی نہیں۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا۔ ”آپ مجھے دیکھ کر کی تھیں اسی لئے میں
 اراک گیا تھا۔ کیا آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے۔“

”نہیں تو..... جی نہیں..... میں سمجھی تھی شاید آپ میرے ہی لئے یہاں آئے تھے۔“
 ”جی نہیں یہ میرا پسندیدہ ہوٹل ہے اور میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں۔“
 ”خیر کوئی بات نہیں۔“ مزنجمی نے کہا اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آگے بڑھ جائے گی لیکن
 وہ حمید کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ”یہ بھی ایک مضحکہ خیز اتفاق ہے کہ آپ لوگوں کے
 ہات کو قوی کرنے کے لئے مجھ سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو رہی ہیں۔“
 ”میں نہیں سمجھا۔“

”مثلاً واردات والی رات کو میں ڈیڑھ سے ساڑھے تین بجے رات تک اپنے ایک
 امت کے ساتھ رہی تھی۔ خیر میں بھی تن بہ تقدیر ہوں۔“
 ”مگر یہ ضروری تو نہیں ہے کہ محض اسی بناء پر آپ کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر دی
 جائے۔ دنیا کی کوئی عدالت صرف اتنی سی بات پر آپ کو قاتلہ نہیں قرار دے سکتی کہ آپ قتل
 والی رات کو کچھ دیر ہوٹل سے باہر رہی تھیں۔“

”خیر ہوگا۔“ مزنجمی نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی اور آگے بڑھ گئی۔
 پھر حمید نے ہوٹل کا ایک ایک گوشہ چھان مارا لیکن صوفیہ کا سراغ کہیں نہ ملا۔ اس نے
 ہکا بکا اس کے کمرؤں کی طرف پھر واپس جائے۔ لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔



”لے چلے۔ خدا کے لئے مجھے یہاں سے کہیں لے چلے۔“ اس نے مضطربانہ انداز میں
 کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب صرف آٹھ منٹ رہ گئے۔“ لڑکی نے اس کا
 ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ حمید راہداری میں آ گیا۔ لڑکی نے بڑی تیز
 سے جھک کر دروازے کو مقفل کیا اور کنبی پھر دیوار سے لٹکا دی۔

”چلے! خدا کے لئے کسی ایسے راستے سے باہر نکلے کہ کوئی ہمیں دیکھ نہ سکے۔“ لڑکی
 اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک ایسے راستے سے واقف ہوں۔ وہ راستہ اس دروازے
 کھلا ہوگا۔ رات کو بند کر دیا جاتا ہے۔“

وہ تیسری منزل کی ایک راہداری میں چل رہے تھے۔ حمید اس وقت اس کے علاوہ اور
 نہیں سوچ رہا تھا کہ غمگین وہ کسی بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ صوفیہ اسے اس طرح کھینچ
 تھی جیسے کسی چٹیل میدان میں ژالہ باری شروع ہو جانے کے بعد کوئی پناہ گاہ تلاش کر رہی ہو
 حمید اس راستے سے واقف تھا۔ یہ ہوٹل کی عمارت کی پشت والی سڑک کی طرف لے جاتا
 دوسری منزل پر پہنچ کر وہ ایک لمحہ کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دونوں طرف
 منزل کی دو طویل راہداریاں تھیں۔

”میرے خدا.....!“ دفعتاً اس کے منہ سے نکلا اور وہ حمید کا ہاتھ چھوڑ کر دائنی جانب
 راہداری میں دوڑتی چلی گئی۔

حمید نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی گھٹ کر رہ گئے۔
 اس نے صوفیہ کی ماں کو اوپر آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے زینے طے کرتی اور
 طرف آ رہی تھی۔ پھر اس کا سر بھی اٹھا اور حمید سے آنکھیں چار ہوئیں۔ حمید تو رک ہی گیا
 وہ جس زینے پر تھی دفعتاً اسی پر رک گئی۔ اس کے ہونٹ کھلے اور پھر مضبوطی سے بند کر
 گئے۔ اتنی مضبوطی سے کہ جبرؤں پر لکیریں سی ابھر آئیں۔ حمید اسے توجہ اور دلچسپی سے
 رہا۔ ایک بار اس نے دائنی جانب والی راہداری کی طرف بھی نظر دوڑائی لیکن وہ دوسرے
 تک سناں پڑی تھی۔ شاید صوفیہ وہاں سے بھی کسی دوسری راہداری میں مڑ گئی تھی۔

ایک متوسط طبقے کا گھرانہ تھا اس لئے یہاں نہ تو انہیں کال بل کا بٹن ملا اور نہ کوئی البتہ وہ ایک چھوٹے سے پائیں باغ سے گزر کر برآمدے تک پہنچے تھے۔ پائیں باغ دروازے کی بجائے بانسوں سے حد بندی کی گئی تھی۔ عمارت مختصر سی تھی۔ اس میں زیادہ سے نہیں کرے رہے ہوں گے۔

فریدی نے انگلی سے ایک دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک سیاہ رنگت نے انہیں خوش آمدید کہا۔ یہ چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ قد ویسے تو ہی تھا لیکن بہت زیادہ موٹاپے کی وجہ سے پہلی نظر میں پستہ قد معلوم ہوتی تھی۔

انہیں ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھایا گیا۔ یہاں کی کرسیاں بید کی تھیں اور ان پر رکڑوں کے گدے پڑے ہوئے تھے۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آج پھر آپ کو تکلیف دی۔“ فریدی نے کہا۔
 ”نہیں جناب..... تکلیف کیسی۔ یہی فخر میرے لئے کیا کم ہے کہ آپ جیسے بڑے آدمی ان تک آنے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ ورنہ آپ تو مجھے کو توالی ہی میں طلب کر سکتے تھے۔“
 ”نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے شرفاء کی عزت کا بڑا خیال رہتا ہے۔“

”یہ آپ کی عالی ظرفی اور نیک نفسی ہے ورنہ پولیس والے تو نہ شاہ کو چھوڑتے ہیں اور نہ“

”کل آپ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ واردات والی رات کو آپ نے پروفیسر کو کیسے دیکھ پلایا تھا۔“
 ”بات دراصل یہ ہے جناب کہ میں نے باہر باغچے میں اناس لگا رکھے ہیں لہذا مجھے ان لوگوں کے لئے بیرونی برآمدے ہی میں سونا پڑتا ہے گوکہ یہاں آس پاس سبھی بڑے لوگ ہیں لیکن بعض بوزھوں کی نیت بھی بچوں کی سی ہوتی ہے۔ میں بھی آپ سے یہ نہیں لگا کر اس کی سزا پر میں اُسے اکثر بلیک میل کرتی رہی ہوں۔“

فریدی ہنسنے لگا پھر بولا۔ ”وہ یقیناً بڑا ڈرپوک ہوگا۔ تبھی تو آپ کی دھمکیوں میں آ جانا لہذا مجھے یقین ہے کہ آپ بہت شریف ہیں اور کسی کو بدنام نہیں کر سکتیں۔“

بیان میں اضافہ

کچھ دیر بعد حمید سینٹ جوزف کالونی کی طرف جا رہا تھا اور صوفیہ کی شخصیت ایک سوال بن کر اس کے ذہن میں چھ رہی تھی۔ کیا وہ اسے کوئی اہم بات بتانے والی تھی؟ اس کے چہرے پر خراشیں کیوں تھیں؟ گالوں پر نیل کیوں تھے؟ اس کی پلکوں میں ورم کیا تھا؟ کیا وہ بہت روئی تھی؟ آخر کیوں؟ اسے کمرے میں کس نے قید کیا تھا؟

آخری سوال کا جواب صاف تھا۔ وہ اپنی ماں کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ کر بھاگ نکلتی تھی۔ لہذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسے اس کی ہی واپسی کا خوف تھا اور شاید وہ اس کی واپسی۔ قبل ہی ہوٹل چھوڑ دینا چاہتی تھی تو کیا اس کی اس خراب حالی کی ذمہ دار اس کی ماں ہی تھی کیا اس نے اسے نوج کھسٹ کر رکھ دیا تھا؟ آخر کیوں؟ اس ”آخر کیوں“ کا حمید کے پاس کا جواب نہیں تھا۔

پھر یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ وہ اور فریدی ساتھ ہی مسز لاڈیل کے مکان کے سامنے پہنچے۔ فریدی اسٹیشن وگن ہی میں آیا تھا۔

”کیوں؟ کیا خبر ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”بس اتنی ہے کہ مجھے کوئی خبر نہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

حمید نے لاڈیل کے مکان میں داخل ہونے سے قبل ہی مختصر اسے سب کچھ بتا دیا۔
 ”کہانی دلچسپ ہے۔“ وہ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس کی آنکھوں بے اعتباری مترشح تھی۔ حمید سمجھ گیا اسے اس کہانی پر یقین نہیں آیا۔

”آپ یقین کیجئے۔“ اس نے کہا۔

”آؤ..... پھر سہی..... میں کوشش کروں گا کہ مجھے اس کہانی پر یقین آ جائے۔“

حمید خاموشی سے اس کے ساتھ چلا رہا۔

”پروفیسر کے معتمد خیر چہرے کی ایک ہلکی سی جھلک ہی اس کی پہچان کروا سکتی ہے۔ اس نے چہرے پر بڑی بڑی اور بہت زیادہ کھٹی مونچھیں ہزار میل کے فاصلے سے صاف نظر آ رہی ہیں۔“

”خیر!.....“ فریدی بولا۔ ”آپ نے فار کی آواز بھی سنی ہوگی۔“

”نہیں..... میں نے فار کی آواز نہیں سنی کیونکہ میں پھر جلد ہی سو گئی تھی۔“

”یہ بڑی عجیب بات ہے کہ فار کی آواز کسی پڑوسن نے نہیں سنی۔“ فریدی نے حمید کی دیکھ کر کہا۔

مزلا ڈیل کچھ سوچنے لگی۔ پھر قہقہے اس کے فریدی کچھ کہتا اس نے کہا۔ ”میں نے کل یہ پروفیسر کی بیوی کو بتائی تھی۔ اس وقت وہ صرف سنی رہی تھی..... لیکن آج؟“

”ہاں..... آج کیا!“ فریدی اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہیں تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اپنے بیان میں تھوڑا سا لڑکوں۔ اس کے عوض وہ مجھے دو ہزار روپے دے گی۔“

”خوب!“ فریدی آگے جھک آیا۔ ”یہ ایک دلچسپ اطلاع ہے کیا اضافہ کرنا چاہتی ہے وہ۔“

”نہی کہ میں نے پروفیسر کے اندر چلے جانے کے تقریباً بیس منٹ بعد فار کی آواز سنی تھی۔“

”آپ واقعی بہت شریف ہیں۔ آپ کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو مفت ہاتھ آنے لے دو ہزار اسے گراں نہ گزرتے۔“

”میری نظروں میں قانون کا بہت احترام ہے جناب۔“

”ہونا بھی چاہئے۔ ہر شریف شہری قانون کا احترام کرتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ پھر

”کیا آپ نے مزمنجی سے اس کا وعدہ کر لیا تھا۔“

”جی ہاں میں نے وعدہ کر لیا تھا اور وعدہ کرتے وقت ہی یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اپنی پہلی

”میں آپ کو اس کی اطلاع دوں گی۔“

”میں بخیر شکر گزار ہوں۔ اچھا اب اتنا اور کیجئے کہ مزمنجی کو اس کا علم نہ ہونے پائے۔“

عورت نے بھی قہقہہ لگایا۔ حمید کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے کپڑے چیر پھاڑ کر کی مگر ہوئے ساڈ کی طرح ذکر اتنا بھاگتا چلا جائے۔

عورت کہہ رہی تھی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ بلیک میلنگ بڑی شاندار ہے۔ میں اس سے کہتی ہوں کہ ناک سے زمین پر لکیر ڈالو، ورنہ میں سب سے کہہ دوں گی کہ تم میرے انجان چارہ تھے۔“

”تربوز نہیں لگائے آپ نے۔“ حمید نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“

”ضرور لگائیے۔ میں آپ کے تربوز چرانے آیا کروں گا۔“

عورت نے پھر قہقہہ لگایا اور بے ڈھنگے پن سے ہنسی رہی۔ فریدی نے فوراً ہی گفتگو کا موڑ دیا۔ اسے خدشہ تھا کہ ہمیں حمید تقریباً نہ شروع کر دے۔

”ہاں تو جب اس کی جیب یہاں پہنچی تو آپ کی آنکھ کھل گئی۔“

”جی ہاں..... اور مجھے حیرت بھی ہوئی کیونکہ اتنی رات گئے یہاں اس لائن میں کوئی اپنی گاڑی نہیں لاتا۔ وجہ یہ ہے کہ اول اس لائن والوں کے پاس گاڑیاں ہیں ہی نہیں۔ کیا ادھر کے سبھی لوگ ہی میری کم حیثیت کے ہیں۔ رہے سامنے والی لائن کے بڑے لوگ تو کے گیراج بھی دوسری ہی طرف ہیں لہذا ادھر گاڑی لانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”مگر کیا آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہیں کہ وہ پروفیسر ہی تھا۔“

”جی ہاں..... میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ پروفیسر ہی تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ گلی تاریک ہی رہی ہوگی کیونکہ میں نے پوری گلی میں صرف ایکٹرک پول دیکھے ہیں۔ دونوں سروں پر نصب ہیں لہذا گلی کا یہ حصہ زیادہ روشن نہ رہا ہوگا۔“

”آپ کا خیال بالکل درست ہے جناب! لیکن پروفیسر کا چہرہ میں نے اسی لئے دیکھا تھا کہ اس نے جیب کا انجن بند کر کے اندر بیٹھے ہی بیٹھے سگریٹ سلگایا تھا۔“

”ممکن ہے آپ کو دھوکہ ہوا ہو۔ آپ سوتے سوتے جا گئی تھیں۔“

”نہیں..... میں اس سے یہی کہتی رہوں گی کہ میں نے اپنے بیان میں اضافہ کر دیا ہے۔“
 ”بہت بہت شکریہ اور اس طرح آپ اس سے دو ہزار بھی وصول کر سکیں گی۔“
 ”نہیں.....!“ مزلا ڈیل کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اس وصولیابی کے بغیر آپ اسے یقین نہیں دلا سکیں گی کہ آپ نے اپنے بیان میں اس کا تجویز کردہ اضافہ کر دیا ہے۔“
 ”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔“

”اگر آپ اس رقم کو اپنے لئے ناجائز تصور کرتی ہوں تو اسے سرکاری تحویل میں دیتے گا۔ ورنہ میری طرف سے تو کھلی ہوئی اجازت ہے کہ آپ اس رقم سے اپنے اناسوں کا شت بڑھا سکتی ہیں۔“

”نہیں میں اسے اپنے لئے قطعی ناجائز تصور کرتی ہوں، ورنہ میں آپ کو بتاتی ہی کیوں
 مزلا ڈیل انہیں رخصت کرنے کے لئے گلی تک آئی لیکن فریدی اور حمید گاڑیوں
 بیٹھنے کی بجائے پروفیسر کے مکان کے عقبی دروازے کی طرف چلے گئے۔ مزلا ڈیل وہاں
 جا چکی تھی۔ فریدی نے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھو اس طرف بھی
 موجود ہے۔ حالانکہ جب مکان خالی نہیں تھا تو یہ قفل قطعی غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔“
 ”میرا خیال ہے کہ پروفیسر دوسروں کی لاعلمی میں یہاں اکثر آتا رہا ہے۔“

”قفل کی موجودگی کا یہی مطلب ہے۔ تم ٹھیک سمجھ ہو۔“
 ”مگر سیکرٹری نے اسکا تذکرہ کبھی کسی سے نہیں کیا ورنہ کم از کم ملازمین کو تو اس کا علم
 ہی۔ خصوصیت سے وہ ملازم تو لازمی طور پر جانتا ہوتا جس پر پروفیسر کو سب سے زیادہ اعتماد ہے
 ”تمہارا یہ خیال بھی درست ہے۔ میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔“

”اچھا تو پھر اب کیا خیال ہے۔“
 ”مزلا ڈیل سے دو ایک باتیں اور دریافت کروں گا۔“
 وہ دونوں پھر کار کی طرف پلٹ آئے۔ مزلا ڈیل ابھی تک بیرونی برآمدے ہی میں موجود

جیسے اس نے فریدی کو اپنی طرف متوجہ دیکھا خود ہی دوڑتی ہوئی پائیں باغ کی حدود سے
 آئی۔

”ایک ذرا سی تکلیف اور محترمہ۔“ فریدی بولا۔
 ”مرد درجناب۔ آپ بالکل تکلف نہ فرمائیے۔ میں گھنٹوں اس جگہ کھڑی رہ کر آپ کے
 کے جواب دے سکتی ہوں۔“

”کیا پروفیسر اکثر اسی دروازے کو استعمال کرتا رہا ہے۔“
 ”نہیں..... پرسوں میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ دروازہ تو دراصل مہتر استعمال
 ہے اور قفل کی کنجی اس کے پاس رہتی ہے۔ یہ تو ایک چھوٹے سے صحن کا دروازہ ہے جس
 زاکر کٹ ڈالا جاتا ہے اور اس صحن کا اصل عمارت سے اتنا ہی تعلق ہے کہ اس سے ایک
 دوسری طرف بھی کھلتا ہے۔“

”اچھا شکریہ! اب بالکل تکلیف نہ دوں گا۔“ فریدی نے کہا اور اسٹیشن وگن میں بیٹھ
 پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے گلی سے نکلیں۔

شام تک حمید دفتر میں بور ہوتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ معاملات تیزی سے آگے بڑھیں۔ ہر
 دن نئی سنسی خیز خبر سنائی دے لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کی اکتاہٹ بڑھتی رہی۔ آج نہ
 نے کیوں اسے بھی سبھی مشغول نظر آ رہے تھے۔ اس نے ایک آدھ چکر ریکھا کے کمرے کے
 لگائے لیکن لفٹ نہیں ملی۔ ریکھا بڑی تندہی سے فائلوں میں سرکھپا رہی تھی۔

چار بجے فریدی میز سے اٹھا اور حمید کی بھی جان چھوٹی۔ وہ دراصل صوفیہ کو تلاش کرنا
 تھا۔ لیکن فریدی نے ایک بار بھی اس کا تذکرہ نہیں چھیڑا۔ حمید کو یقین تھا کہ وہ اسے مذاق
 مانے ورنہ اس کی طرف سے اتنی لاپرواہی نہ برت سکتا۔

آفس سے وہ دونوں گھر واپس آئے۔ فریدی کسی سوچ میں تھا۔
 ”میں ایک ہفتے کی چھٹی چاہتا ہوں۔“ حمید نے کہا۔ ”اتنی لمبی خاموشی کے بعد اس کی
 بان اٹھنے لگی تھی۔“

”چھٹی کیوں چاہتے ہو۔“ فریدی نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”تاکہ ایک وصیت نامہ مرتب کر سکوں۔“

”کیوں مت کرو۔ کیا تمہیں کوئی کام نہیں ہے۔“

”کام..... ہے کیوں نہیں۔ لیکن اب کام کے ساتھ لفظ ”تمام“ کا اضافہ بھی ہونے ہے۔“ حمید جھلا گیا۔

”چلو خاموش بیٹھو۔“ فریدی نے کہا۔ غالباً اس وقت وہ صرف سوچتا چاہتا تھا لیکن اس یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اسی وقت ایک نوکر نے اطلاع دی کہ پروفیسر نجی کا وکیل تنویر صدیقی سے ملنا چاہتا ہے۔

”ڈرائنگ روم میں بیٹھاؤ۔“ فریدی نے کہا اور سگار سلگانے لگا۔

”یہ بے وقوف شاید ہماری قبروں میں چھلانگ لگا دے گا۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔“

فریدی اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا اور حمید نے بھی اس توڑ پر اس کی قہ کر ڈالی کہ ممکن ہے اس وقت بھی وہ کوئی سٹسی خیر خبر لایا ہو۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم داخل ہوا جب صدیقی ایک لفافہ فریدی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”یہ خط شام ڈاک سے ملا ہے۔ پروفیسر نے آپ کو میرے توسط سے بھیجا ہے۔“

فریدی لفافہ لے کر مہر میں دیکھنے لگا۔ حمید بھی آگے بڑھ آیا۔ ٹکٹوں پر لگی ہوئی مہر روپ کے پوسٹ آفس کی تھی اور مقامی پوسٹ آفس کی مہر میں آج ہی کی تاریخ تھی۔ فریدی لفافے سے خط نکالا۔ مضمون انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا اور نیچے نجی کے دستخط تھے۔

اس میں لکھا تھا۔ ”محترمی! میرے وکیل کی وساطت سے آپ کا پیغام ملا۔ میں ڈور کے لئے حقیقتاً بہت مغموم ہوں کیونکہ اب وہ ایک اچھی لڑکی بن گئی تھی۔ مگر محترم! مجھے تو یہ کہ آپ مجھے سردست معاف رکھیں گے۔ میری نئی ایجاد بہت تیزی سے پایہ تکمیل کو پہنچ رہی ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے کینسر کا کامیاب ترین طریقہ علاج دریافت کر لیا۔“

ملا۔ میں ایک ایسی مشین تیار کرنے میں کامیاب ہوتا جا رہا ہوں جس کے ذریعے چاند اور یڈیم کی شعاعوں کا بدل بنایا جاسکے گا۔ آپ خود سوچئے اس مشین سے کتنے نئی نوع کا مفاد وابستہ ہوگا۔ ڈوروتھی کے متعلق جو کچھ میں آپ کو بتا سکوں گا وہ صرف اتنا ہی ایک ماضی رکھتی تھی۔ ہو سکتا ہے آپ ہیری بلکسٹن گروہ سے واقف ہوں۔ کسی زمانے کا تعلق اسی گروہ سے تھا لیکن وہ اپنی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔ اُس نے مجھ سے نفی، جو اُسے مل گئی۔ پھر اس نے تہیہ کیا کہ اب وہ شریف لڑکیوں کی سی زندگی بسر کرے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ وہ قتل کی گئی ہے تو اس میں اس گروہ کے علاوہ اور کسی کا ہاتھ نہ ہوگا۔ بلکسٹن دو یوریشین بد معاش ہیں انہیں دونوں کے نام سے یہ گروہ غالباً اب بھی چل رہا ہے آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس کے قاتل یا قاتلوں کو پکڑ کر قانون کے لٹیکس۔ میں سچ مچ ڈوروتھی کے لئے بے حد مغموم ہوں۔“

ظفر ختم کر کے فریدی نے اسے حمید کی طرف بڑھادیا اور یہ خط اس کے لئے کسی حد تک بڑھات ہوا لیکن اس نے اس پر رائے زنی کرنے کی بجائے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ہو گیا۔

فریدی بھی غلاء میں گھور رہا تھا اور اس کی پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

نئی کہانی

قریباً دو منٹ تک کمرے پر بوجھل سا سکوت طاری رہا پھر تنویر صدیقی نے کھٹکار کر پہلو فریدی کی نظر چینی کے گلدان سے ہٹ کر اس کے چہرے پر جم گئی۔

”کیا آپ نے یہ خط دیکھا ہے۔“ اس نے صدیقی سے پوچھا۔

”نہیں جناب! لفافہ تو آپ نے چاک کیا تھا۔“

”اوہ معاف کیجئے گا..... حمید! خط صدائی صاحب کو دے دو۔“

صدائی خط لے کر پڑھتا رہا پھر اس نے اسے حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”خیال ہے کہ اب ہیری بکشن گروہ اپنی پہلی سی شکل میں موجود نہیں ہے۔“

”یہی میں بھی کہنا چاہتا تھا کہ پروفیسر کی معلومات سیکنڈ ہینڈ ہیں۔“ حمید بولا۔

”لیکن یہ چیز دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ڈوروتھی کا تعلق پہلے کن لوگوں سے تھا۔ نہ دیکھوں گا۔ ہیری بکشن گروہ میرے ہی ہاتھوں ٹوٹا تھا۔ بکشن پھانسی پا چکا ہے لیکن ہیری اب بھی سنٹرل جیل میں گفتگو کی جاسکتی ہے۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ڈوروتھی کا تعلق کبھی ایسے آدمیوں سے بھی رہا، صدائی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس اطلاع سے اُسے گہرا پہنچا ہو۔ اس نے پھر کہا۔ ”میرے خدا وہ کتنی بھولی، نیک اور شریف تھی۔“

”شاید آپ بھول رہے ہیں کہ وہ پروفیسر کی داشتہ بھی تھی۔“ حمید نے کہا۔

”رہی ہوگی۔“ صدائی لا پرواہی سے بولا۔ ”پتہ نہیں لوگ کردار کے دوسرے پہلو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ محض باعصمت ہونا ہی آدمی کو آدمی نہیں بناتا۔ میں تو یہاں آ سکتا ہوں کہ اگر وہ صرف کسی ایک کی پابند نہیں تھی تو اسے آبرو باختہ سمجھنے والے غلطی پر ہیں۔“ لیکن کیا آپ کسی ایسی عورت کو مرد کے ترکے سے کچھ دلوا سکتے ہیں وکیل صاحب! حمید کا لہجہ تلخ تھا۔

”نہیں جناب! میں قانون کی بات نہیں کر رہا۔ یہ میرا اپنا نظریہ ہے۔“

”پروفیسر کو واپس آنا ہی پڑے گا صدائی صاحب۔“ فریدی بولا۔

”کاش مجھے اس کا صحیح پتہ معلوم ہوتا۔“ صدائی نے کہا۔

”فکر نہ کیجئے۔“ حمید بولا۔ ”ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ روپ نمگر کے

ماسٹر کے توسط سے اپنی ڈاک منگواتے ہیں۔“

”میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو بتائیے گا۔ اب اجازت دیجئے۔“ صدائی اٹھا۔

”ضرور..... ضرور۔“ فریدی نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس تعاون کے بے حد شکر گزار ہوں۔“

صدائی چلا گیا۔ حمید اس انداز سے سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے اس پر کوئی بہت بڑا ظلم ہوا ہو۔ ”کیوں! کیا بات ہے۔“ فریدی نے اُسے مخاطب کیا۔

”میں اس لڑکی کے متعلق سوچ رہا ہوں، جو میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔“

”کیا تم نے حقیقت بیان کی تھی۔“

”آخراً آپ کو یقین کیوں نہیں آتا جبکہ نجی کی بیوی اتنی زیادہ مشتبه ہو چکی ہے۔ جب وہ

رضی بیان کے لئے دو ہزار کی پیش کش کر سکتی ہے تو.....!“

”تو اپنی لڑکی کو بھی زخمی کر سکتی ہے۔“ فریدی مسکرایا۔

”نہیں مجھے یہ کہنا چاہئے تھا جب وہ غصے کی حالت میں اپنے شوہر پر چھری پھینک سکتی لڑکی کو بھی زخمی کر سکتی ہے۔“

”ضروری نہیں ہے۔“

”قصہ منطقی شعور کو کھاتا ہے۔“ حمید بولا۔ ”پھر آخر یہ بتائیے کہ وہ اپنی ماں کو دیکھتے رہا تھا چھوڑ کر بھاگ کیوں گئی تھی۔“

”فی الحال اس قصے کو چھوڑ دو۔“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے تمہارا

دادا ہو مگر تاقتیک لڑکی سے گفتگو کرنے کا موقع نہ ملے اس کے متعلق سر کھپانا ہی ہوگا۔

”اگر بہت دنوں بعد جی جناسٹک کا موقع ملا ہے۔ ابھی تک صرف دو نفوس ایسے تھے جن

بایا جاسکتا تھا۔ مگر اب تیسرے کے بھی امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔“

”تیرا کون۔“ حمید نے کہا۔ ”میری دانست میں تو اب بھی دو ہی ہیں۔ پروفیسر اور اس

بلند ویسے پروفیسر کی بیوی کے متعلق امکانات قوی ہیں۔ آخر وہ مسز لاڈیل کے بیان میں

لگاؤ کا اضافہ کیوں کرانا چاہتی تھی۔ اس کا کھلا ہوا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنا جرم پروفیسر

پر نہایت چاہتی ہے۔“

”ہاں..... آں..... یہ بھی ممکن ہے۔ ابھی وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں تم تیسرے کے متعلق پوچھا ہے۔ اگر واقعی اس کا تعلق ہیری ہکسٹن گروہ سے رہا ہے تو اس لئے بھی ہمیں تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی۔“

”کیوں! ابھی تو آپ نے کہا تھا.....؟“

”ہاں وہ صرف ہیری اور ہکسٹن کی بات تھی۔“ فریدی نے حمید کا جملہ پورا ہونے سے کہا۔ ان میں سے ایک پھانسی پاچکا ہے اور دوسرا عرقید کاٹ رہا ہے۔ مگر گروہ کے کئی افراد تک لاپتہ ہیں۔ مثال کے طور پر زین بی کو لے لو۔ کیا وہ کوئی معمولی مجرم تھا۔ آج بھی زندہ یا مردہ حاضر کرنے والے کو سرکاری اعلان کے مطابق دو ہزار مل سکتے ہیں۔ ممکن ہے یا گروہ کے کسی دوسرے فرد کو نجی اور ڈور تھی کے تعلقات گراں گزرے ہوں۔ اس دوسری طرح بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ ڈور تھی کے پاس بغیر لائسنس کے ریوالور کی موجودگی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اسے اس واردات کا خدشہ پہلے ہی سے لاحق رہا ہو۔ اب ان حالات پر وفسر اور اس کی بیوی کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنے کی کوشش کرو۔“

”فیصلہ کیا کروں۔ اس نئی دلیل کی موجودگی میں تو دونوں ہی ہاتھ سے جارہے ہیں۔“

”نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔ تم آخر ذہن پر زور کیوں نہیں دے رہے ہو۔“

”ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ کسی سڑے ہوئے تربوز کی طرح کلنے کلنے نہ ہو جائے۔“

”ذہن میں رہا ہی کیا ہے۔“

”خیر مجھ سے سنو..... اسے واردات کا خدشہ ضرور لاحق تھا لیکن کم از کم اسے یقین تھا کہ وہ اسی رات کو قتل ہو جائے گی، ورنہ ملازم اسے پیانو بجاتے چھوڑ کر نہ جاتے۔“

”ٹھہریے.....!“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اگر اسے پہلے ہی سے خدشہ لاحق تھا تو نے پولیس کو کیوں نہیں اطلاع دی۔“

”اب تم سڑے ہوئے تربوز پر زور دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں یہی چاہتا تھا۔“

فریدی مسکرا کر بولا۔

”رہا ہے نا۔“ حمید چکا۔

”چھا..... سنو..... ریوالور کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ اسے پہلے ہی سے خدشہ لاحق تھا۔ خدشہ پر وفسر کی بیوی کی طرف سے تھا تو اسے لازمی طور پر پولیس کو اطلاع کرنا اگر پر وفسر سے خائف تھی تب بھی یہی بات ثابت ہونی چاہئے تھی۔ لیکن اس نے یا؟ پھر اب اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ گروہ کا ہی کوئی آدمی ہوگا۔ پولیس دیتے وقت اسے یہ بھی ظاہر کرنا پڑتا کہ وہ اس آدمی کو کیسے جانتی ہے۔ دشمنی کی وجہ کیا؟ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہیری ہکسٹن گروہ والی لسٹ پر ڈور تھی کا نام کبھی نہیں رہا۔ گروہ سے متعلق بھی تھی تو پولیس کو اس کا علم نہیں تھا ورنہ وہ اس طرح شریف بن کر ازدگی بسر نہ کر سکتی۔ کیونکہ اس گروہ کے مفور افراد کی بو پولیس آج بھی سونگھتی پھر لہذا وہ ایسی صورت میں پولیس کو اطلاع نہیں دے سکتی تھی جب مقابلہ گروہ کے ہی کسی رہا ہو۔ وہ کیوں خواہ مخواہ خود پر یہ مثل صادق لاتی کہ آسمان سے گرا اور کھجور سے اٹکا۔“

”تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔“ مگر یہ پر وفسر اپنی گردن کیوں پھنسا رہا ہے۔“

”کیوں؟“

”اے علم تھا کہ ڈور تھی ہیری ہکسٹن گروہ سے تعلق رکھتی ہے تو اس نے پولیس کو دل نہیں دی۔ اگر پہلے اطلاع نہیں دی تھی تو اب کیوں اپنے لئے کنواں کھود بیٹھا ہے۔ بات اب ظاہر ہی نہ کرنی چاہئے تھی کہ ڈور تھی ہیری ہکسٹن گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔“

”مید تم بہت اچھے جارہے ہو۔“ فریدی نے حیرت سے کہا۔ پھر بولا۔ ”تم ذہن سوزی اچازے ہو۔ بات صرف اتنی ہی ہے۔ اچھا اٹھو! ہمیں جلدی کرنی چاہئے۔“

”کیوں؟ کہاں۔“

”منزل جیل..... میں ہیری سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کہیں پر وفسر نے اس سلسلے بیان نہ کی ہو۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ قاتل خود کو قانون کی دسترس سے دور رکھنے کے لئے

”کیا خیال.....!“

”یہی کہ وہ آپ کو پسند آئی ہو تو گفت و شنید کی جائے۔“

فریدی نے بُرا سامنہ بنایا لیکن کچھ بولا نہیں۔ حمید نے پھر کہا ”آپ خود بھی عجیب ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کے بچے بھی عجیب ہوں۔ اگر آپ منظور کریں تو دنیا آدمی کی ایک

نسل سے بھی روشناس ہو سکتی ہے۔“

”یکواس بند کرو۔ میں کچھ سوچ رہا ہوں۔“

اگر آپ اسی کے متعلق سوچ رہے ہیں تو میں ہمیشہ کیلئے بھی خاموش ہونے کو تیار ہوں۔

فریدی کو حد سے زیادہ سنجیدہ دیکھ کر حمید سچ جھج خاموش ہو گیا۔ کارٹیزی سے راستہ طے

نا تھی۔

سنٹرل جیل پہنچ کر انہیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ وہاں پہنچا دیئے گئے جہاں

سے ملاقات ہو سکتی تھی۔

کٹہرے کی دوسری طرف ہیری کسی دیو کی طرح کھڑا تھا۔ چوڑا چکلا اور طویل قامت

جس کی ڈاڑھی اور سر کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ اس کا قد فریدی کے قد سے

اکٹا ہوا تھا اور اس ہیئت میں وہ سچ کوئی دیوبی معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے فریدی کو بڑی نفرت سے دیکھا۔

”میں تمہارے لئے ڈوروتھی کا ایک پیغام لایا ہوں۔“

”کون ڈوروتھی؟“ ہیری غرایا۔

”سرخ بالوں والی لڑکی جس کے ہونٹ بڑے حسین ہیں۔“

”اُس کا پیغام.....!“ ہیری نے حیرت سے کہا۔ ”کیا وہ خود ہی اپنی گردن پھنسا رہی ہے۔“

”شاید تمہیں یہ سن کو خوشی ہو کہ وہ ایک شریف لڑکی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔“

ہیری نے اس پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ کچھ دیر وہ ہنستا رہا پھر بولا۔ ”ڈوروتھی اور شریف لڑکی۔“

”کیوں! کیا یہ نام ممکن ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

بڑی بڑی حماقتیں کر گزرتے ہیں اور وہی حماقتیں ان کے لئے پھانسی کا پھندا بن جاتی ہیں۔“

”تم پروفیسر کو قاتل سمجھتے ہو۔“ فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ابھی تک تو میرا یہی خیال ہے۔“ حمید نے جواب دیا۔

”پھر اس کی بیوی کو کس خانے میں رکھو گے، جو لاڈیل کے بیان میں محض اس!

تراشیم کرانا چاہتی ہے کہ اس کا شوہر پھانسی کے تختے تک پہنچ جائے۔“

حمید سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ ”چلے! یہ کیس تو دماغ کی چولیس ہلائے دے رہا ہے

وہ دونوں ڈرائنگ روم سے نکل کر گیراج کی طرف چل پڑے۔

راہ میں حمید نے پوچھا۔ ”کیا آپ پروفیسر کے سلسلے میں اس کے سابق پارٹنر برہمن

سے بھی ملے تھے۔“

”ہاں! میں اس سے صرف پروفیسر کی بعض عادتوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا

”کیسی عادتیں.....!“

”جیسی بھی ہوں لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دونوں میں کسی عورت ہی کے

میں جھگڑا ہوا تھا۔ برہمن قدر نے بڑی شدت سے اس بات پر زور دیا تھا کہ ڈوروتھی کا

پروفیسر ہی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسے شبہ ہوا ہو کہ ڈوروتھی کسی اور سے بھی تعلقات رکھتی

اس نے یہ بھی بتایا کہ پروفیسر بڑا وہمی آدمی ہے۔ وہ اکثر اپنی مختلف داشتہ عورتوں۔

دوسروں سے لڑتا رہا ہے۔“

فریدی نے کار روک دی اور نیچے اتر گیا۔ حمید نے دیکھا کہ وہ تار گھر میں داخل

ہے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ پھر واپس آ گیا۔

”میں نے پروفیسر کو تار دیا ہے کہ وہ فوراً آئے ورنہ اس کی گرفتاری کے وارنٹ

کے جاسکتے ہیں۔“ فریدی نے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

حمید خاموش رہا۔ کار پھر چل پڑی۔

کچھ دیر بعد حمید نے کہا۔ ”مسز لاڈیل کے متعلق کیا خیال ہے۔“

”بات کیا ہے..... کیا اس نے کسی کو کنگال کر دیا۔“

”نہیں..... اس نے بتایا ہے کہ تم نے 1949ء میں سنٹرل بینک کا جو سونا لوٹا تھا وہ آج بھی محفوظ ہے اور تم اس جگہ سے واقف ہو، جہاں اسے رکھا گیا ہے۔“

”اوہ..... وہ شیطان کی بچی۔“ ہیری منٹیاں بھیجنے کر بولا۔ ”وہ یہاں بھی مجھے چین نہیں لینے دیگی۔ وہ جھوٹی ہے۔ مکار ہے۔ ہم نے کبھی لوٹ کا مال سنبھال کر نہیں رکھا، کبھی نہیں۔“ فریدی نے قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔ ”تم مجھے دیکھو۔ میں کس طرح تمہارے گردہ کے آدمیوں کو چوہے بلیوں کی طرح کھود کھود کر نکال رہا ہوں۔ اب اسی لڑکی کو لے لو۔ یہ میری لست پر بھی نہیں رہی۔“

”اس کا تعلق میرے گردہ سے کبھی نہیں رہا۔ وہ تو میری محبوبہ تھی۔ میں نے اس سے زیادہ کسی کو نہیں چاہا۔ میں اس کے لئے جان دینے کو بھی تیار رہتا تھا لیکن کاش مجھے صرف ایک دن کے لئے چھوڑ دیا جائے صرف ایک دن کے لئے۔ تاکہ میں اسے قتل کر سکوں۔“

”کیوں! اپنی محبوبہ کو قتل کر دو گے۔“

”ہاں..... کیونکہ ہماری تباہی کا باعث وہی بنی تھی۔ اُف میرے خدا اس کے بھولے بھالے چہرے پر جس فتنہ پرور کھوپڑی کا سایہ ہے وہ کسی خبیث روح کو بھی میسر نہیں ہو سکتا۔“ تقریباً دوسروں کو دھوکا دیتی ہے۔ اس سے زیادہ اذیت پسند عورت آج تک میری نظروں سے نہیں گذری۔“

”تمہاری تباہی کا باعث وہ کیسے بنی تھی؟“

”جس رات ہم گرفتار ہوئے ہیں اس نے ہمیں ایسی شراب پلا دی تھی جس میں کوئی

خواب آور دوا ملائی گئی تھی۔“

فریدی کو یاد آ گیا کہ وہ سب نشے کی حالت میں گرفتار ہوئے تھے اور اس گردہ کے متعلق اسے ساری معلومات کسی نامعلوم آدمی کے خطوط سے بہم پہنچا کرتی تھیں۔ ممکن ہے وہ نامعلوم ہستی ڈوروتھی ہی رہی ہو۔

”بہر حال اب وہ شرافت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔“ فریدی نے ایک طویل سانس لے لے لئے میں اسے نہیں چھیڑنا چاہتا۔“

”کیا وہ کسی مالدار آدمی کے ساتھ ہے۔“

”ہاں..... وہ ایک مالدار آدمی کی سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی ہے۔“

”سنئے کرئل۔“ دفعتاً ہیری غرایا۔ ”اس نے آپ کو محض اس لئے یہاں بھیجا ہے کہ آپ نے مسئلہ میں الجھ جائیں اور اسے اس شریف آدمی پر ہاتھ صاف کرینا موقوفہ مل جائے۔“ لہری نظر رکھے، ورنہ آپ کو پچھتانا پڑے گا۔ آپ مجھ سے زیادہ اسے نہیں آسکتے۔“

”جیسی بات یہ ہے ہیری..... میں دیکھوں گا۔“ فریدی نے کہا۔

”غصہ کرئے۔“ ہیری اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے ابھی اسے کوئی سچی بات نہیں کی۔“

”تمہارا خیال بالکل صحیح ہے ہیری۔“ فریدی نے جواب دیا۔ ”ڈوروتھی کو کسی نے قتل کر دیا میں اس کے متعلق جو کچھ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کر چکا..... شکریہ۔“

”وہ قتل کر دی گئی۔“ ہیری نے آہستہ سے دہرایا اور اس کی آنکھیں اس طرح چمکنے لگیں۔ ”اس کے لئے بڑی پرمسرت خبر رہی ہو۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔“ ”کرئل تب تو اس کا ادنیٰ آدمی ہو سکتا ہے جس کی وہ سیکریٹری تھی۔ میں نے خود بھی اسے مار ڈالنے کا پروگرام بنا کر اس سے پہلے ہی میں گرفتار کر لیا گیا۔ اگر صرف تین دن اور آ زاد رہتا تو وہ اس دنیا نہ ہوتی.....!“

فریدی نے پھر ایک طویل سانس لی۔

ڈاک بنگلہ

لڑکی صبح فریدی بہت زیادہ فکر مند نظر آ رہا تھا۔ حید نے اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی

کوشش کی لیکن ناکام رہا آخر اس نے کہا۔ ”اب تو پروفیسری پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔“
 ”اؤں.....!“ فریدی چونک پڑا اور اس طرح اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے اُسے اس کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا ہو۔ اس نے کہا۔ ”کیا کہا تم نے۔“

حمید نے اپنا جملہ دہرایا۔

”بہتری پیچیدگیاں اب بھی باقی ہیں۔“

”اب بھی پیچیدگیاں باقی ہیں۔“ حمید اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا

”خدا ہر شریف آدمی کو اس پٹے سے دور رکھے۔“

”اگر پروفیسر اس کی اصلیت سے واقف ہو گیا تھا تو پولیس کو اطلاع دے کر بخوبی

سے اپنی جان چھڑا سکتا تھا۔ آخر اس نے قتل کرنے کا خطرہ کیوں مول لیا۔“

”ابھی تک میں نے اس کے متعلق جو اندازہ لگایا ہے اس کے مطابق وہ مجھے کوئی بڑا

آدمی معلوم ہوتا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”تم جھکی کہتے ہو۔ میں تو اسے دیوانہ سمجھتا ہوں۔ اگر اس کے بجائے کوئی اور ہوتا تو

فرصت میں یہاں پہنچ کر اپنے خلاف پیدا ہو جانے والے شبہات رفع کرنے کی کوشش کرتا۔“

”پھر آپ کس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں۔“

”فی الحال کسی پر بھی نہیں۔ حالات سامنے ہیں مگر بے ترتیب، میں انہیں ترتیب دینے

کوشش کرتا ہوں مگر کہیں نہ کہیں سے ایک خلائی نمودار ہو جاتی ہے اور کڑیاں مربوط نہیں ہوتیں۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ پروفیسر پولیس کو بھی اطلاع دے سکتا تھا لیکن وہ اگر اس طرف سے

قسم کا خدشہ رکھتی تھی تو پولیس کو اس کی اطلاع نہیں دے سکتی تھی۔ کیونکہ پروفیسر اس کا راز فافا

کر سکتا تھا۔ لہذا اس نے اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی اور اپنے پاس بغیر لائسنس کا

ریوالور رکھنے لگی۔“

”ریوالور کی بات اب چھوڑ دو۔“ فریدی بولا۔ ”ہیری کے بیان سے اس کی اہمیت بھی

ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اتنی ہی خطرناک عورت تھی تو اس نے یونہی بلا مقصد بھی ریوالور رکھ چھوڑا ہوا

”میں دراصل اس کی بیوی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا۔“

”کہو.....!“ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

”بس اتنا ہی کہنا ہے کہ وہ بھی اس کی قاتل ہو سکتی ہے۔“

”کانی پرانی بات ہو چکی ہے۔ لیکن اس قسم کا سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے

میں کسی بات پر تکرار ہو گئی ہو اور اس نے غصے کی حالت میں اس پر فائر کر دیا ہو۔“

”یہی میرا بھی خیال ہے اور اب وہ مسٹر لاڈیل کے بیان میں ترامیم کرا کے پروفیسر کو

چاہتی ہو۔“

”مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پروفیسر واردات والی رات کو تین بجے

ن موجود تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”ممکن ہے یہ قتل اس کی موجودگی ہی میں ہوا ہو اور اس

نت کی بربادی کے خیال سے پولیس کو اس کی اطلاع نہ دی ہو۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ فکر مند نظر آنے لگا تھا۔ حمید نے اپنے

میں تمباکو بھری اور اُسے سلگا کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا پھر یک بیک سیدھا ہوتا ہوا بولا۔ ”دیکھئے! میرا خیال

یہ پروفیسر..... آسانی سے واپس نہیں آئے گا۔ کیوں نہ میں ہی اسے جا کر کھینچ لاؤں۔“

”اس کی تلاش آسان نہ ہوگی حمید صاحب۔“ فریدی نے کہا۔

”کیوں.....!“

”وہ روپ نگر کے پوسٹ ماسٹر کے توسط سے اپنی ڈاک منگواتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس

بائے رہائش کا پتہ آسانی سے معلوم ہو جائے۔“

”نمرے خیال سے روپ نگر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لہذا وہاں کسی ایسے آدمی کا سراغ

الٹی سے مل جائے گا جو جیب کار رکھتا ہو۔ مسٹر لاڈیل نے یہی تو بتایا تھا کہ پروفیسر جیب کار

باتا۔“

مگر روپ نگر سے دو میل ادھر ہی اسے ایک ڈاک بنگلہ نظر آیا اور اس نے یہی تمنا کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

”اگر میں نہ بتانا چاہوں تو۔“

”تو اپنی ماں کے لئے پھانسی کا پھندا تیار سمجھو۔“

”نہیں.....!“ وہ خوفزدہ آواز میں چیختی۔

”کیا یہ غلط ہے تمہاری ماں نے غصے میں تمہیں نوچ کھوٹ ڈالا تھا۔“

”م..... میں اس مسئلے پر کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔“

”تم غلطی پر ہو۔ ایسا کر کے تم اپنی می اور پاپا دونوں کے حق میں کانٹے بوری ہو۔“

صوفیہ خاموش ہو گئی۔ حمید بھی چپ چاپ اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ بہت زیادہ

نظر آنے لگی۔ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی اور چڑھتی ہوئی سانسوں پر قابو

لا کوشش کرنے لگتی۔

”تمہارا فرض ہے کہ مجھے صحیح حالات سے آگاہ کر دو۔“ حمید نے کچھ دیر بعد کہا۔

”کیسے حالات۔“

”اچھا اب میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔“ حمید نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”ارے تم تو خفا ہو گئے۔ پوچھو میں بتاؤں گی۔“

”تمہاری می نے تمہیں کیوں مارا بیٹا تھا۔“

”میں نے ان سے پوچھا تھا کہ وہ قتل والی رات کو کہاں غائب رہی تھیں۔“

”نہیں.....!“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”ہاں.....! میں نے پوچھا تھا۔“

”مگر تم نے اس دن مجھے تو اس کے متعلق نہیں بتایا تھا۔“

”مجھے خود بھی علم نہیں تھا کہ وہ رات کو غائب رہی تھیں۔ میں تو سو رہی تھی۔“

”پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”کاؤنٹر کلرک نے مجھے بتایا تھا کہ ایک پولیس آفیسر نے اس کے متعلق چھان بین کی

بلکہ اس نے مجھے وہ رجسٹر دکھایا جس میں می نے اپنی روانگی لکھی تھی۔ ہوٹل والے اچھی

”میں پاپا کی تلاش میں آئی ہوں۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ یہاں ملیں گے۔“

”م..... میں نے بڑی محنت سے یہ بات معلوم کی ہے۔ پہلے نوکروں کو ٹھولا لیکن

سے کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ پھر میں نے سوچا کہ پاپا کے وکیل سے معلوم کروں ممکن ہے وہ کچھ

ہو۔ میرا خیال بھی صحیح نکلا۔ اسے پاپا کے متعلق علم تھا۔ اس نے کہا جب میں سرکاری سرا

رساں کو بتا چکا ہوں تو تم سے کیوں پوشیدہ رکھوں۔ اب اس وقت بہت ضروری ہے کہ پروف

دائس آجائیں۔ ورنہ پولیس کو سمجھانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اگر وہ تمہیں مل جائیں تو اب

واپس آنے پر مجبور کرو۔“

”کیا اس نے تمہیں پورا پتہ بتایا ہے۔“

”نہیں اس نے صرف بتایا ہے کہ وہ اپنی ڈاک یہاں کے پوسٹ ماسٹر کے پ

مگنوا تے ہیں۔“

”خیر ٹھہرو..... تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“ حمید نے کہا اور نوکر کو ہدایت د

لگا۔ بکرا وہیں سر جھکائے کھڑا جگالی کر رہا تھا۔

”یہ بکرا کیوں ساتھ لئے پھرتے ہو اور اس کا حلیہ۔“ صوفیہ کہتے کہتے رک گئی۔

”اور..... نہیں کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ بیٹھنا ورنہ میرے جذبات کو ٹھیس لگے گی

میرا دودھ شریک بھائی یعنی سنپ برادر ہے۔“

صوفیہ ہنسنے لگی۔

کچھ دیر بعد حمید لباس تبدیل کر کے برآمدے میں آ بیٹھا۔ صوفیہ بھی اس کے قریب

موجود تھی۔ اندھیرا بچھل رہا تھا۔ ملازم نے ایک لیپ روشن کر کے برآمدے میں رکھ دیا۔

”ہاں! اب بتاؤ..... کل کیا قصہ تھا۔“ حمید نے صوفیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیسا قصہ.....!“

”کل تم اس طرح بھاگی کیوں تھیں۔“

طرح جان گئے ہیں کہ ہم کون ہیں۔“

”تو تمہارے دریافت کرنے پر وہ بگڑ گئیں۔“

”ہاں..... وہ بہت غصہ ور ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ میں اب ان کیساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“

”تمہارا کوئی دوست نہیں ہے۔“

”نہیں.....!“ صوفیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”اچھا اب مجھے سچ مچ بتاؤ..... کیا ایک بار انہوں نے غصے میں پروفیسر پر چھری نہیں کھ

ماری تھی۔“

”یہ بالکل درست ہے۔ ہاں ایسا ہوا تھا۔“

”پروفیسر نے کیا کیا تھا۔“

”کچھ بھی نہیں۔ وہ اس کے بعد بھی ہنستے رہے تھے۔“

”کیا تمہیں علم ہے کہ تمہاری می.....!“ حمید اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ دراصل

مسرلاؤیل کے متعلق بتانے جا رہا تھا جس کے بیان میں مسز نجی نے ترمیم کرانے کی کوشش

تھی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے بات ہی اڑا دی اور بولا۔ ”میں خود بھی اسی لئے آیا ہوں

تمہارے پاپا کو تلاش کروں لیکن وہ بہت ضدی معلوم ہوتے ہیں۔“

”ہاں یہ تو حقیقت ہے کہ ایک بار جو بات ان کی زبان سے نکل جائے اسے پتھر کی لکیر سمجھ

”ہم لوگوں کی خواہش تھی کہ وہ صرف ایک دن کے لئے شہر چلے آتے اور پولیس

شبہات رفع کرنے کی کوشش کرتے۔“

”میں انہیں مجبور کروں گی کہ وہ واپس چلیں۔ وہ کم از کم میری بات نہیں ٹال سکیں۔“

”پتہ نہیں! تم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتیں کہ جو کچھ سوچ رہی ہو وہی ہوگا۔“

پھر وہ رات کے کھانے کے لئے اٹھ گئے۔ صوفیہ مغموم اور فکر مند نظر آرہی تھی۔

حمید نے کھانے کے دوران میں اس سے پوچھا۔ ”کیا تم اپنے پاپا کو بے گناہ سمجھتی

”یقیناً..... وہ اتنے بُرے نہیں ہو سکتے کہ کسی کو قتل کر دیں۔“

پھر کیا تمہاری می غصے میں اسے قتل کر سکتی ہیں۔“

می کے غصے کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ غصے میں پاپا پر چھری بھی پھینک سکتی

مجھے بھی اس طرح زخمی کر سکتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ غصے میں اپنے ہوش و حواس کھو

ا۔“

برحمید خود ہی اس تذکرے سے اکتا گیا اور کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح صوفیہ بھی ہنس

انے لگے۔ اس نے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں لیکن صوفیہ پر بدستور اضطراب طاری

نے کے بعد وہاں سے میز ہٹا دی گئی۔ کیونکہ اسی کمرے میں انہیں سونا بھی تھا۔ یہ ایک

اور کشادہ کمرہ تھا۔ اس عمارت میں اس کے علاوہ دو برآمدے بھی تھے۔ ایک غسلخانہ تھا

بیت الخلاء۔ ملازم کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ دونوں پہلے سے ایک دوسرے کے شناسا

رہا۔ ایک الجھن کا شکار ہونا پڑتا لیکن اب اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ کس

اں سونے کے استمدعا کرے گا۔ اس نے حمید کے حکم کے مطابق اسی کمرے میں دو پٹنگ

بئے اور ان کے بستر لگا کر باہر جاتے وقت بکرے کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش

نہ لگے۔ مگر حمید نے اسے روک دیا۔

برحمید سونے کی تیاری ہوئی تو حمید بکرے کو اپنے پٹنگ پر لٹانے کی کوشش کرنے لگا اور

بے سمانتہ ہنس پڑی۔

”یہ کیا کر رہے ہو۔“ اس نے پوچھا۔

”نہ اسے اپنے پاس ہی سلاتا ہوں۔ ورنہ اُسے بُرے بُرے خواب نظر آتے ہیں اور یہ

بے قولی ہی الا پتارہ جاتا ہے۔“

”آہ بہت شریر ہو۔ آخر بکرا ساتھ لئے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”بکرے کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔“

”تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”مگر یہ خوب سمجھتا ہے۔“ حمید نے بکرے کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن بکرا کسی طرح بھی

اس کے پٹنگ پر نہ ٹکا۔ آخر کار حمید نے اُسے تین لائیں رسید کیں اور خود پٹنگ پر ڈھیر ہو گیا۔
بکرا ایک گوشے میں بیٹھ کر چنگالی کرنے لگا۔

تلاش

دوسری صبح صوفیہ کسی حد تک تروتازہ نظر آ رہی تھی۔ حمید نے بھی اسے نگر مند ہونے
موقع نہیں دیا۔ جاگنے سے ناشتے کے وقت تک تفریحی گفتگو کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں قصبے
باہر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

حمید نے بکرے کو بھی ساتھ لے جانا چاہا لیکن صوفیہ نے شدت سے اس کی مخالفت کی
”اگر بکرے کے بجائے کتا ہوتا تو۔“ حمید نے کہا۔

”کتے کی دوسری بات ہے۔“

”تو بکرے کی تیسری کیوں ہے۔“

”تم عجیب آدمی ہو۔“

”تم مجھ سے بھی زیادہ عجیب ہو لیکن میں تمہیں آدمی نہیں کہہ سکتا کیونکہ دنیا کا ہر آدمی
معقولیت پسند ضرور ہوتا ہے۔ جب کتے ساتھ رکھے جاسکتے ہیں تو بکرے کیوں نہیں رکھے جاسکتے
”بکرا تمہارے کسی دشمن سے تمہاری جان نہیں بچا سکتا۔“

”دشمن سے مقابلہ کرنے کیلئے میرے بازو کافی ہیں۔ لیکن کتا میرا پیٹ نہیں بھر سکتا۔
”بکرا کیسے بھر سکتا ہے۔“

”میں اسے ذبح کر کے کھا سکتا ہوں اور اسکی وجہ سے کوئی بکری مجھ پر مہربان ہو سکتی۔
”بکری کے مہربان ہونے سے کیا ہوگا۔“ صوفیہ ہنس پڑی۔

”وہ مجھے اپنا دودھ پینے دے گی۔“

”چلو.....! میں اسے ساتھ نہیں لے جانے دوں گی۔“

”خیر.....!“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”تمہاری مرضی۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا.....!“

”کچھ نہیں، تم کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔“

وہ دونوں جیب میں آ بیٹھے۔ حمید نے انجن اشارت کیا اور پھر گاڑی چل پڑی۔

”اگر تمہاری ماں بھی یہاں پہنچ گئیں تو کیا ہوگا۔“ حمید نے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔ وکیل سے تمہیں پتہ معلوم ہوا تھا۔ وکیل ہی انہیں بھی بتا سکتا ہے۔“

”نہیں.... مسٹر صدانی مجھے بیٹی کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے استدعا کی
وہ می کو اس کے متعلق کچھ نہ بتائیں۔ پاپا سے ان کے دوستانہ تعلقات بھی ہیں، اس لئے
وہ بالکل پسند نہیں کرتے۔“

”اگر آگئیں تو پھر تمہیں پٹنا پڑے گا۔“ حمید ہنسنے لگا۔

”میرا مسئلہ نہ اڑاؤ۔“ صوفیہ گلوگیر آواز میں بولی۔

”معاف کرنا۔ میں نے یونہی کہا تھا۔ تمہاری می کی درندگی مجھے بھی ناپسند ہے۔“

لیکن صوفیہ کے چہرے پر پھر اضطراب طاری ہو گیا تھا۔ حمید سوچنے لگا کہ اس نے بُرا کیا۔
سے پہلے وہ بڑے اچھے موڈ میں تھے۔

”تمہاری دانست میں ہمیں کہاں سے شروعات کرنی چاہئے۔“ حمید نے کہا۔

”پوسٹ آفس سے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”فی الحال ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان کی

پوسٹ ماسٹر کے توسط سے آتی ہے۔ مگر ممکن ہے آپ اس سے زیادہ جانتے ہوں۔“

”نہیں..... میری معلومات بھی اتنی ہی ہیں جتنی صدانی سے حاصل ہو سکتی تھیں۔“

صوفیہ کچھ نہ بولی۔ پھر وہ ذرا سی سی دیر میں بستی میں داخل ہو گئے۔ یہ حقیقتاً ایک چھوٹا سا

نقارہ اسے غیر ترقی یافتہ قصبہ قرار دینا زیادتی ہی ہوتی۔ یہاں دو ایک اچھے اور صاف سترے

کھانے کی جگہ تھے۔ ایک چھوٹا سا پاور ہاؤس تھا۔ دو سینما ہال تھے۔ دو ہائی اسکول تھے اور ایک

جی ہاں۔“

بد سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دفعتاً اس نے پوچھا۔ ”کیا آپ اس عورت کا حلیہ بتا سکتے ہیں۔“
عورت کا حلیہ.....!“ کلرک اپنا سر کھجاتا ہوا بولا۔ ”دیکھئے جناب۔“ وہ مسکرایا۔ ”میری
ہی عورت کا حلیہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ.....!“

کہ وہ بہت حسین ہوتی ہے۔“ حمید اس کی بات کاٹ کر مسکرایا۔

چلے یہی سہی۔“ کلرک جھپنی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔

حمید کے ذہن میں ایک شے نے سر ابھارا اور وہ جیسیں ٹٹولنے لگا۔

سے یاد آ گیا کہ ڈوروتھی کی ایک تصویر اس کی جیب میں پڑی ہوگی۔ اس نے تصویر نکالی
کو دکھاتا ہوا بولا۔

’کیا یہی عورت تھی۔‘

’او.....جج.....جی ہاں..... بالکل بالکل۔‘

پسٹ ماسٹر نے بھی تصویر دیکھ کر اس کے بیان کی تصدیق کی۔

”وہ بچہلی باریہاں کب آئے تھے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں..... دیکھئے ٹھہریئے۔“ پوسٹ ماسٹر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”شاید تین یا چار دن گزرے۔“

”کیا یہ عورت ساتھ تھی۔“

”نہیں تھا تھے۔“ کلرک بول پڑا۔

”کیا آپ انہیں اطلاع دلاتے ہیں کہ ان کی ڈاک آئی ہے۔“

”نہیں جناب.....!“ پوسٹ ماسٹر نے کہا۔ ”وہ خود ہی آتے ہیں۔ مجھے علم نہیں ہے کہ
یہ کہاں ہے۔“

”آپ ذرا ایک منٹ کے لئے ادھر آئیے۔“ حمید نے پوسٹ ماسٹر کو باہر چلنے کا اشارہ

دیا۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔“

اکثر جگہ عمارتیں بھی شاندار نظر آئیں۔ لیکن وہاں کا پوسٹ آفس دیکھ کر حمید کو مایوسی ہوئی۔
وہ پوسٹ آفس سے زیادہ کسی کباڑی کا گودام معلوم ہو رہا تھا۔ دو ایک پوسٹ میں بیٹھے ڈاک
چھانٹ رہے تھے اور بقیہ میزوں پر یا تو طبلہ بجا رہے تھے یا بیٹریوں کے دھوئیں کے بادل منہ سے
نکالتے ہوئے غمیں ہانک رہے تھے۔ کاؤنٹر کلرکوں کی حالت ان سے بھی بدتر تھی کیونکہ وہ کام بھی
کر رہے تھے اور اپنے دوستوں سے غمیں بھی لڑا رہے تھے۔ پبلک ٹیلی فون کے قریب حمید کو
لڑکیاں نظر آئیں۔ ممکن ہے کاؤنٹر کلرک کے دوست وہاں نظارہ بازی ہی کیلئے اکٹھے ہوئے ہوں۔
پوسٹ ماسٹر کی میز اس بڑے کمرے کے وسط میں تھی اور اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے
وہ کم از کم ایک درجن شریر اور نالائق بچوں کی ماں ہو۔ کبھی وہ کسی کو ٹوکتا کبھی کسی کو ہدایت دے
اور کبھی سامنے پڑے ہوئے رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگتا۔ کاؤنٹر کلرک اور ان کے دوست
کی طرف بھی نظر اٹھتی اور پھر وہ ٹیلی فون کے قریب کھڑی ہوئی لڑکیوں کو تشویش کی نظروں سے
دیکھنے لگتا۔ وہ بوڑھا تھا اور اس کے سر کے بال کچی برف کی طرح سفید تھے۔ اس کی آنکھیں
ایمانداروں کی سی تھیں، جن میں اپنے نالائق ماتحتوں کیلئے تشویش اور ہمدردی پائی جاتی تھی۔
حمید نے دروازے ہی پر رک کر اس سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

”تشریف لائیے..... تشریف لائیے۔“ وہ اٹھتا ہوا بولا اور دوسری لڑکیوں کو گھورتی ہوا

آنکھیں صوفیہ کی طرف مڑ گئیں۔ صوفیہ ایک یوریشین عورت کی لڑکی تھی۔ اس لئے خود

یوریشین ہی معلوم ہوتی تھی۔

حمید نے پروفیسر نجی کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔

”جی ہاں!“ پوسٹ ماسٹر نے کہا۔ ”ایک صاحب ہیں جو اسی طرح اپنے خطوط اور

آرڈر منگواتے ہیں۔ جی ہاں..... دبے پتلے سے بہت بڑی بڑی مونچھوں والے۔“

”اور اکثر ان کے ساتھ ایک انگریز عورت بھی ہوتی ہے۔“ ایک کلرک نے کہا جو

گفتگو میں ان کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔

”ج، پوچھا تھا۔ لیکن انہوں نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا تھا کہ اتفاقات ہیں۔“

”خیر اب آپ خیال رکھئے گا۔“

”یقیناً خیال رکھوں گا جناب۔“

وہ پھر کمرے میں واپس آ گئے۔ صوفیہ حمید کو شجے کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

”آؤ چلیں۔“ حمید نے اُسے کہا۔

وہ پھر گاڑی میں آ بیٹھے اور صوفیہ نے پوچھا۔ ”تم اسے باہر کیوں لے گئے تھے۔“

”نہیں بتانا کم بخت۔“

”کیا مطلب.....؟“

”میں کوشش کر رہا تھا کہ وہ پروفیسر کا پتہ بتا دے لیکن کم بخت نے نہیں بتایا۔“

”ممکن ہے وہ جانتا ہی نہ ہو۔“

”یہ کیسے ممکن ہے۔ پھر آخر پروفیسر کو اطلاع کیسے ہوتی ہے کہ ان کی ڈاک آئی ہے۔“

”ٹ آفس کا کوئی نہ کوئی آدمی انہیں ضرور اطلاع دیتا ہے۔“

”پھر کیا یہ ضروری ہے کہ وہ پوسٹ ماسٹر ہی ہو۔“

”چھوڑو! کوئی اور بات کرو۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کا سراغ پالوں گا۔“

”اور کیا بات کروں..... میں جلد سے جلد پاپا کے پاس پہنچ جانا چاہتی ہوں۔ وہ کتنے

اچھے ہیں۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مئی ہمیشہ ان پر زیادتیاں کرتی رہی ہے۔“

”اگر تمہاری مئی کو سزا ہو گئی تو۔“

”اوہ..... تو کیا یہ سچ بھی ہو سکتا ہے..... میرے خدا! کیا سچ انہوں نے اُسے مار ڈالا ہوگا۔“

”تم خود ہی کہہ رہی تھیں کہ وہ غصے میں پاگل ہو جاتی ہیں۔“

”ہاں..... میں نے کہا تھا..... لیکن یقین کر لینے کو دل نہیں چاہتا کہ ایسا ہوا ہوگا۔“

”مونیہ نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔ ”ہناؤ اس تذکرے کو میرا سر چکرانے لگتا

ہے..... کوئی اور بات کرو۔“

پوسٹ ماسٹر اور وہ برآمدے میں آئے۔

”فرمائیے جناب۔“ پوسٹ ماسٹر نے کہا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

حمید نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

کارڈ پر نظر ڈالتے وقت پوسٹ ماسٹر کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”اوہ..... جناب.....!“ وہ کارڈ واپس کرتا ہوا بولا۔ ”کوئی گڑبڑ ہے۔“

”آپ بھی سرکاری آدمی ہیں۔ یہ بات اپنی ہی ذات تک محدود رکھئے گا۔ ہمارے

اس آدمی کی تلاش ہے۔ یہ جب بھی آئے اسے یہاں روک کر کوتوال شہر کو نوٹ کر دیجیے

پیغام میں آپ صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں ”بڑی موٹھیں کیپٹن حمید۔“ اس کے بعد آپ کو

اس وقت تک روکے رکھنا پڑے گا جب تک کہ پولیس نہ آ جائے۔“

”میں کیسے روکوں گا جناب۔“ پوسٹ ماسٹر کچھ خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔

”یہاں آپ کے پاس اتنے آدمی ہیں اور آپ ایک دبلے پتلے آدمی کو نہ روک سکیں؟

”اگر اس نے فائر کر دیا تو۔“

”اوہ گھبرائیے نہیں۔ وہ کوئی بدمعاش نہیں ہے۔ ایک شریف آدمی ہے۔ بس دبا

میرا منہ اُس سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ آپ اگر اسے اتنی دیر باتوں ہی میں لگائے

گے تو کام بن جائے گا۔“

”اچھی بات ہے جناب میں پوری پوری کوشش کروں گا۔“

”اچھا..... کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اس کی ڈاک کئی دن تک پڑی رہ گئی ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ یا تو اسی دن پہنچ گئے ہیں جس دن ڈاک

ہے یا دوسرے دن۔ تیسرا دن تو میری یادداشت میں کبھی ہوا ہی نہیں۔ یہ سب کچھ مجھے

یاد ہے کہ میں اسے ایک حیرت انگیز بات سمجھتا ہوں۔ آخر انہیں کس طرح علم ہو جاتا ہے

ہی ان کی ڈاک پہنچی ہے۔“

”آپ نے اس سے اس کے متعلق پوچھا ضرور ہوگا۔“

”میں خود ہی کہہ رہا تھا کہ اس تذکرے کو ختم کر دو۔ غلطی تمہاری ہی ہے۔ اگر بکرے ساتھ لائی ہوتیں تو تمہارا دل بھی بہلتا۔“

”مجھے بکروں سے نفرت ہے۔“

”اس کے باوجود بھی وہ تمہارا دل بہلاتا۔“ حمید نے کہا۔ ”جب وہ کسی بکری کو آنکھ تو تم بے حد خوش ہوتیں۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔“ صوفیہ جھینپ گئی۔

”ہاں! یقین کرو۔ اکثر بکری والے میرے پاس اس کی شکایت لائے ہیں۔“

”تم مجھے اچھے خاصے مداری معلوم ہوتے ہو۔“

”لیکن بکرے کا خیال ہے کہ میں قوم کا خادم ہوں۔“ حمید نے کہا۔ ”کل سے میں“

سدھار کی اسکیم شروع کرنے جا رہا ہوں۔“

صوفیہ کچھ نہیں بولی۔ وہ شاید ہنسنے کے موڈ میں تھی ہی نہیں۔

حمید روپ نگر کے مختلف حصوں میں جیپ دوڑاتا رہا اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ صوفیہ کو ایک ہوٹل میں چھوڑ کر روپ نگر کی کوتوالی کی طرف چل پڑا۔ صوفیہ سے اس تھا کہ وہ اس کے لئے ایک سیٹلی کی تلاش میں جا رہا ہے۔ پتہ نہیں صوفیہ نے اس پر یقین کیا نہیں لیکن وہ کچھ بولی بھی نہیں تھی۔ حمید نے مکرر کہا تھا کہ وہ اس کے دوست کی بہن ہے یہیں ایک گرلز اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اگر وہ مل گئی تو تینوں کا وقت اچھا گزرے گا۔

کوتوالی پہنچ کر اس نے انچارج کو حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ پوسٹ ماسٹر کی ط سے پیغام ملتے ہی اُسے بڑی ہوشیاری سے پروفیسر نجی کو قابو میں کرنا ہوگا۔

اس کے بعد اس نے کوتوالی ہی سے فریدی کی کوڑنک کال کی۔ پھر تقریباً چھ منٹ تک پر گفتگو ہوتی رہی۔ فریدی نے بتایا کہ حمید کی رپورٹ اس کے لئے اطمینان بخش اور متحرک تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اس نے اور کچھ نہیں کہا۔

اس نے حمید کو تین دن دیئے جنہیں وہ پروفیسر کی تلاش میں صرف کر سکتا ہے۔

ہوٹل واپس آ کر حمید نے صوفیہ کو اطلاع دی کہ اس کی وہ ملنے والی جس کی تلاش میں وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر شہر چلی گئی ہے۔ صوفیہ نے اس معاملے پر مزید رائے زنی نہیں کی۔

”کیا خیال ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”کیوں نہ ہم یہیں کسی ہوٹل میں چلے آئیں۔“

”نہیں مجھے ڈاک بنگلے کی پرسکون فضا بہت پسند ہے۔“ صوفیہ نے جواب دیا۔

”ہاں۔“ حمید نے ایک طویل سانس لی۔ ”چاروں طرف حسین مناظر بکھرے پڑے ہیں۔“

”چلو وہیں چلیں۔ میں یہاں اکتا ہٹ محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے کھلی ہوا اور سناٹے سے“

”میں نے ایک بار کھلی ہوا کو پیار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے منہ کے بل نیچے چلا آنا“

”دن یہ بات میری سمجھ میں آئی تھی کہ کھلی ہوا کو پیار کرنے سے پہلے ایک عدد پیراشوٹ“

”ام ضرور کر لیتا چاہئے۔“

”پتہ نہیں تم کیا کہہ گئے۔ میں نے کچھ نہیں سنا۔“

”عاقبتاً تم اس وقت خود کو کھلی ہوا میں محسوس کر رہی ہو۔“

”نہیں بتاؤ کیا کہہ رہے تھے۔“

”ہام۔۔۔۔۔!“ حمید نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”میں یہ کہہ رہا تھا کہ کھلی ہوا“

”ہت اچھی چیز ہے۔ کیا تم نے کبھی کھلی ہوا میں چنگ اڑانے کی کوشش کی ہے۔“

”یا تو تم بہت بڑے فلسفی ہو یا بالکل احمق۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”حالانکہ بکرے بھی میری باتیں سمجھ لیتے ہیں۔“

”تب تم بھی بکرے ہی ہو گے۔“ صوفیہ نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور پھر“

”ابو جیسے یک ایک اسے سکتہ سا ہو گیا۔ اس کی نظر سامنے والی لمبی راہداری کی طرف تھی۔“

”کیا بات ہے۔“ حمید بوکھلا گیا۔

”ہاں۔“ اس نے آہستہ سے کہا پھر اس طرح اٹھی جیسے کرسی نے اُسے اچھال دیا ہو۔ وہ تیرکی“

”راہداری میں چلی جا رہی تھی۔ پھر حمید نے اُسے آخری سرے والے دروازے میں رکتے دیکھا۔“

”ہو سکتا ہے“ حمید بولا۔ مگر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے پیشاب خانے کے کیواڑوں کا دایا جو نہایت آسانی سے کھل گئے۔ دوسری طرف بھی دروازہ نظر آیا جس کے پاٹ

”تو پھر آج شام کو آجائے۔ وہ جب بھی دوپہر کا کھانا یہاں کھاتے ہیں رات
لازمی طور پر یہیں کھاتے ہیں۔“

خفیف سے کھلے ہوئے تھے۔ حمید نے اندر گھس کر انہیں بھی کھول دیا۔ دوسری طرف ایک پتہ سی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اپنی میز پر آ بیٹھے۔ حمید کہہ رہا تھا۔ ”وہ پیشاب خانے میں گھس کر اگلی سے نکل گئے۔“

”مگر کیوں؟ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔“ صوفیہ بولی۔

”شاید انہوں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔“

”اوہ..... تو کیا وہ مجھ سے بھی دور رہنا چاہتے ہیں۔“ صوفیہ نے دردناک آواز میں کہا

”اس کا جواب وہ خود ہی دے سکیں گے۔“ حمید نے کہا اور ایک ویٹر کو قریب بلا کر

کے لئے ہدایت دینے لگا۔

”میں کیا کروں۔“ صوفیہ پیشانی رگڑتی ہوئی بولی۔

حمید نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور شاید اس کے رویہ نے بھی صوفیہ کو تھوڑی سی تکلیف پہنچائی۔ کچھ دیر بعد حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ اس طرح دور دور رہنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے مانا کہ ان کی مشینوں کے پرزے چوری ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا وہ اپنی مشینوں کے نمونے جیب میں لئے پھر

ہیں۔ مشینوں کے نمونے آدمیوں سے بھاگے بغیر بھی پوشیدہ رکھے جاسکتے ہیں اور پھر تم تو ان

لڑکی ہی ہو۔ کیا وہ تم پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے۔“

”خدا جانے..... میں سب کچھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔“

”نہیں شاید تم ان چوروں سے دوستی رکھتی ہو جو ایک بار پہلے بھی ان کی ایک مشین

نمونہ چرا کر اپنے نام سے پیٹنٹ کرا چکے ہیں۔“

”پتہ نہیں تم کیا بات کر رہے ہو۔“ صوفیہ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”تم اس طرح“

”مگر یہ پاپا لوگ ہوتے ہیں کپے فراڈ۔“

”کیا مطلب.....؟“

”میں تمہارے پاپا کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس وقت مجھے اپنا پاپا یاد آ رہا ہے۔“

”خیر اب میں اس کے متعلق کوئی گفتگو نہ کروں گا۔“ حمید نے رومان کر کر اہوتے دیکھا

تسلیم کر لی۔

لچ کے بعد وہ پھر ڈاک بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ حمید نے صوفیہ کی طرف دیکھا جس

نے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ حمید دل ہی دل میں پروفیسر کو گالیاں دینے لگا جس نے

حاجا کا ایک ظاہر ہو کر اس کی تفریح برباد کر دی تھی۔ اس کی دانست میں اب صوفیہ کو موڈ

بہت مشکل کام ہو گیا تھا۔

”اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے جیب ڈرائیو کرتا رہا۔“

”دیکھو ایک بات سمجھ میں آرہی ہے۔“ صوفیہ نے کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔

”کیا.....؟“

”پاپا..... مجھے نہیں بلکہ تمہیں دیکھ کر اس طرح چلے گئے۔“

”کیوں..... انہوں نے کوئی جرم کیا ہے؟“ حمید آنکھیں نکال کر بولا، مگر پھر سنبھل گیا۔

”ال آ گیا کہ یہ طرز تخاطب اس کا موڈ خراب کر دے گا لہذا اس نے کہا ”اوہ اچھا میں سمجھ

ہاں اس لئے کہ پولیس کے سامنے نہیں آنا چاہتے کہ کہیں ان کا کام کچھ دنوں کے لئے

جائے۔ غالباً وہ اپنی مشین مکمل کر لینے کے بعد ہی پولیس سے رابطہ قائم کرنے کا ارادہ

ہیں۔ ٹھیک بھی ہے۔ پتہ نہیں یہ چکر کب تک چلتا رہے اور انہیں ادھوری مشین کو مکمل

کا موقع نہ مل سکے۔“

”ہاں.....!“ صوفیہ کا چہرہ کھل گیا۔ ”میں بھی یہی کہنا چاہتی تھی۔“

”تو اس میں فکری کیا بات ہے۔ میں ان سے صرف دو یا تین باتیں پوچھوں گا۔ اس کے

مول جاؤں گا کہ کبھی ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔“

”تم بہت اچھے ہو۔“ صوفیہ نے حمید کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مگر یہ پاپا لوگ ہوتے ہیں کپے فراڈ۔“

”کیا مطلب.....؟“

”میں تمہارے پاپا کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس وقت مجھے اپنا پاپا یاد آ رہا ہے۔“

”کیوں.....؟“ صوفیہ نے حیرت سے کہا۔ ”تم بڑی بدتمیزی سے ان کا تذکرہ کر رہے ہو۔“
 ”کیا کروں..... ان کی ذات سے کچھ ایسی تلخ یادیں وابستہ ہیں۔“
 ”کیا وہ بہت ظالم تھے۔“

”یقیناً..... اتنے ظالم کہ آج تک شادی کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں پیدا ہو سکی۔“
 ”تم مجھے پہیلیاں نہ بچھایا کرو۔“

”ان کی تین بیویاں تھیں اور ساڑھے چار درجن بچے، جن میں سے ایک میں ہوں۔ مجھے وہ سب بچے آج بھی یاد ہیں۔ جب اُس وقت وہ سب بچے پیار پر آمادہ ہوتے پاپا کو جوار چھڑانی مشکل ہو جاتی۔ آخر ایک دن تنگ آ کر انہوں نے کنوئیں میں چھلانگ لگادی۔ تین بیویوں میں جنگ چھڑ گئی۔ ہر ایک دوسری پر الزام رکھتی کہ اسی کے بچوں سے تنگ آ کر پاپا نیک کام کر بیٹھے ہیں۔ پاپا اس وقت تک کنوئیں میں زندہ تھے۔ اچانک یہ تینوں کنوئیں پر پڑ گئیں اور لگیں چیخ چیخ کر پوچھنے کہ قصور کس کے بچوں کا تھا..... پاپا نے چیخ کر کہا ارے پڑے مجھے نکالو پھر میں بتاؤں گا کہ قصور دراصل ایک اشتہار باز یونانی دوا خانے کا ہے مگر ان تینوں نہ سنی۔ جب بات زیادہ بڑھی تو ان تینوں نے بھی ایک ساتھ کنوئیں میں چھلانگ لگادی۔ نتیجہ ہوا کہ پھر دوسری بار پاپا نہ ابھر سکے۔ وہ چار لاشیں مجھے اب بھی یاد ہیں اور اب میں سوچتا ہوں کہ پہلے ایک کنواں تیار کرالوں پھر شادی کروں۔ کیا خیال ہے۔“

”بہت شریر ہو۔“ صوفیہ ہنستی ہوئی بولی۔ ”کیا واقعی تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔“

”نہیں..... ابھی میرے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ ایک کنواں کھدوا سکوں۔“

”تم ایک کھنڈے آدمی معلوم ہوتے ہو، ایسے لوگ کبھی شادی نہیں کرتے۔“

”ارے جاؤ..... ہنٹر جیسا کھنڈرا آدمی بھی بیوی نہ سہی محبوبہ تو رکھتا ہی ہوگا۔“

”اور تم..... کیا تمہاری ایک درجن سے کم محبوبائیں ہوں گی۔“

حمید نے ایک زوردار تہقیر لگایا دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ ”تم ابھی تک اسی غلامی میں مبتلا تھیں۔ ارے مجھے آج تک محبوبہ تو کیا اس کی کتیا بھی نصیب نہیں ہوئی۔ ویسے ملتی تو بہت

چار دن سے زیادہ کوئی نہیں ٹھہرتی۔ میں انہیں پور معلوم ہونے لگتا ہوں اور پھر وہ کوئی انہیں تراش کر کھسک جاتی ہیں۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی وہ ہم ملتی رہی کہیں ایک دن اتفاق سے باتوں ہی باتوں میں میں نے کہہ دیا کہ مجھے لنگڑا والی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ بس دوسرے ہی دن سے اس نے لنگڑا نا شروع کر دیا۔“

وفیہ ہنسنے لگی اور پھر بولی۔ ”تم مجھے بیوقوف کیوں بتا رہے ہو۔“

”سب لڑکیاں یہی کہتی ہیں اور میں غصے سے پاگل ہو جاتا ہوں۔“

وفیہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ جیب ڈاک بنگلے کے کپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ یہاں ملازم ایک ڈنڈا لے کر حمید کے بکرے کو دوڑاتا پھر رہا تھا۔

اوسختل کے دشمن کیا ہو رہا ہے۔“ حمید دھاڑا۔

کرک گیا اور اس نے کہا۔ ”ارے صاحب کیاریاں برباد کر دیں اس نے۔“

”تو ڈنڈا لے کر.....؟“

پھر کیا کروں صاحب۔“ نوکر نے بیزاری سے کہا۔

”کبھی کسی پڑھے لکھے اور سلیم الطبع بکرے سے سابقہ پڑا ہے۔“

”سلیم صاحب بکرے نہیں پالتے۔“ نوکر نے اور زیادہ بیزاری سے کہا۔

”کون سلیم صاحب۔“ حمید نے جیب سے اترتے ہوئے کہا۔

”وہی..... ڈبلیو ڈی کے اوسیار۔“

”ڈبلیو ڈی کے اوسیار۔“ حمید نے چمکیں جھپکائیں۔ ”یہ کیا چیز ہے گا۔“

”وہی جو سڑکیں بنواتے ہیں۔“

”خدا عافیت کرے..... ارے وہ پی ڈبلیو ڈی کا اوور سیر ہوگا۔“

”ہاں..... ہاں..... اوور سیر، مجھے ٹھیک سے نہیں یاد رہتا۔“

”اوور سیر.....؟“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔

”ہوگا کچھ صاحب۔ مجھ سے نہیں بنتا۔“ نوکر بالکل ہی بیزار نظر آنے لگا۔

”بہر حال یہ ایک خاندانی بکرا ہے سمجھو۔ آئندہ تم ایسی بدتمیزی سے پیش نہ آؤ۔“
 ”صاحب لوگ کہتے ہیں باغ لگاؤ..... آپ بکرا ساتھ لائے ہیں۔“
 حمید نے بکرے کا کان پکڑا اور اسے اندر لیتا چلا آیا۔

”کیوں بے۔“ وہ اس کے منہ پر چھڑ مارتا ہوا بولا۔ ”تجھے کیا ہو گیا۔ شاعری کرتے کرتے پھول پتے چبانے لگے۔“ پھر صوفیہ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”سنا تم نے یہ کہہ رہا ہے۔“
 ”کہتا ہے کم بخت کہ حسن چبانے کے لئے ہے دیکھنے کے لئے نہیں۔“
 ”تم شاید زیادہ کھا گئے ہو۔“ صوفیہ جل کر بولی۔ ”اب کچھ دیر آرام کرلو۔ ورنہ دماغ بالکل ہی الٹ جائے گا۔“

شاید اب وہ بھی ہنستے ہنستے مضطرب ہو گئی تھی اور فی الحال حمید سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔
 حمید لباس تبدیل کر کے برآمدے میں چلا آیا۔ صوفیہ کمرے میں ہی پڑی اور گھمتی رہی۔
 حمید دراصل اس کا دھیان بنانے کے لئے اس قسم کی بکواس کرتا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی مغموں آنکھیں اسے اپنے لئے تکلیف دہ معلوم ہونے لگی تھیں، لہذا وہ چاہتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی مغموں نہ نظر آئے۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی ایک بار پھر ڈور و تھی کے قتل کا کیس اس کے ذہن میں بھجانا رہا کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر پروفیسر نے اس طرح ڈانچ دے کر نکل جانے کی کوشش کیوں کی تھی۔ کیا اُسے خوف نہیں ہے کہ ان حالات میں پولیس اس پر بھی شبہ کر سکتی ہے۔

فریدی اور صدیقی کی ہدایات اس تک پہنچ جانے کے بعد بھی اس کا یہ رویہ ذہنی توازن کی خرابی کی طرف اشارہ کر سکتا ہے۔ یا پھر وہ حقیقتاً مجرم ہی تھا۔ ہو سکتا ہے ڈور و تھی کی اصلیت معلوم ہو جانے کے بعد اسے اس پر اتنی ہی شدت سے غصہ آیا ہو کہ اس نے اسے قتل ہی کر دیا ہو۔ لیکن یہاں تک سوچنے کے بعد پروفیسر کی بیوی ایک سوالیہ نشان بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اگر پروفیسر ہی ڈور و تھی کا قاتل ہے تو پھر یہ عورت کس قسم کا رول ادا کر رہی ہے۔ اس نے لاڈیل کے بیان میں ترمیم کرانے کی کوشش کیوں کی اور پھر ایسی صورت میں یکے

بھی واردات والی رات کو اسی وقت ہوٹل ڈی فرانس سے غائب رہی تھی جس وقت ہاقتل ہوا تھا۔ پھر اس لڑکی کا بیان ہے کہ وہ غصے کی حالت میں کسی کو قتل بھی کر سکتی ہے۔
 حمید سوچتا رہا اور الجھنیں بڑھتی رہیں۔ لنچ کے بعد سچ مچ وہ معدے میں کچھ گرائی سی کرنے لگا تھا۔ وہ آرام کرسی میں پڑے پڑے سو گیا۔ پتہ نہیں وہ کب تک سوتا رہا۔ اگر اسے جھنجھوڑ کر نہ جگائی تو شاید وہ رات تک سوتا ہی رہ جاتا۔
 ”اوہ تم سو رہے ہو۔ دیکھو چھینچ گئے ہیں، ہمیں سات بجے ہوٹل میں پہنچ جانا چاہیے۔“
 حمید اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں تمہارے پاپا کے رُہی آؤں۔“

”پھر کیسے کیا ہوگا۔“

”تم ہال میں ٹھہرنا اور میں باہر رہوں گا۔ ورنہ اگر وہ اس وقت بھی ڈانچ دے کر نکل گئے گا۔“

”تم اٹھو بھی تو..... لباس تبدیل کرو۔ وہ سب کچھ گاڑی میں بیٹھ جائیکے بعد سوچا جائیگا۔“
 حمید نے جلدی جلدی غسل کیا اور لباس تبدیل کرنے لگا۔ شاید وہ بہت دنوں بعد دوپہر کو اسی لئے اس کی طبیعت کچھ کسلند سی ہو گئی تھی۔ پھر بھی حمید اس موقع کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس نے کپڑے تبدیل کر کے ریو اور جیب میں ڈالا اور قصبے کی طرف جانے کے لئے آیا۔ صوفیہ بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہی تھی۔

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں یہ تجویز بہت معقول ہے کہ میں ہال میں ٹھہروں۔ تم باہر انتظار کرو گے۔ لیکن خدا را..... پاپا کے سلسلہ میں وہی کرنا جو تم پہلے کر چکے ہو!“

مصیبت آنی

”دونوں ساڑھے چھ بجے بستی میں پہنچ گئے لیکن حمید نے وہاں پہنچنے ہی ہوٹل کا رخ نہیں

”ان سب معاملات کے متعلق اپنی زبان بند ہی رکھئے گا۔“
 ”فعلی جناب..... میں سمجھتا ہوں۔“

”شکریہ..... ہاں آج تو اس کی ڈاک نہیں آئی۔“
 ”نہیں جناب۔ میں نے آج خاص طور سے اس پر دھیان دیا تھا۔ لیکن آج ان کی نہیں آئی۔“

”بہر حال اس سلسلے میں آپ سے جو کچھ کہا جا چکا ہے وہی کیجئے گا۔“

”آپ مطمئن رہئے..... سر مو فرق نہ ہونے پائے گا۔“
 ”شکریہ“ حمید نے کہا اور اس سے مصافحہ کر کے گاڑی کی طرف آ گیا۔

”کہاں رہ گئے تھے۔“ صوفیہ نے پوچھا۔

”یہ نہ پوچھو..... تمہارے لئے کوئی اچھی اطلاع نہیں ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ حمید نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ جیپ پھر چل پڑی اور حمید

”تمہاری ماں یہاں پہنچ گئی ہیں۔“

”نہیں.....!“ اس نے تحیر زدہ سی آواز میں کہا۔

”یقین کرو..... ابھی مجھے بوڑھا پوسٹ ماسٹر ملا تھا۔ وہ ہمارے بعد ہی پوسٹ آفس پہنچی تھیں

انہوں نے یہ صرف پورے فسر کے متعلق پوچھ گچھ کی تھی بلکہ تمہارے بارے میں بھی پوچھا تھا۔“

”میرے بارے میں کیا پوچھا تھا۔“

”نبی کہ کیا کوئی ایسی لڑکی بھی پروفیسر کے بارے میں چھان بین کرنے آئی تھی جس

نہ س پر ہلکے ہلکے نیل پڑے رہے ہوں۔“

صوفیہ خاموش ہو گئی۔ حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”تمہیں صمدانی پر بڑا اعتماد تھا۔ آخر اس نے بتا ہی دیا۔“

”میں یقین نہیں کر سکتی کہ انہوں نے بتایا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں کسی اور ذریعہ سے

کیا۔ اس نے کہا کہ انہیں سات بجے سے پہلے وہاں نہ جانا چاہئے۔ سات بجے تک انہیں میرا پھیل جاتا اور حمید کو باہر سے نگرانی کرنے میں دشواری نہ ہوتی۔

وہ سات بجنے کے انتظار میں شہر کی سڑکوں کے چکر لگانے لگے۔ ایک جگہ حمید نے ایک جنرل اسٹور سے پرنس ہنری کا تمباکو خریدا اور پھر گاڑی کی طرف واپس آ ہی رہا تھا اچانک روپ نگر کے بوڑھے پوسٹ ماسٹر سے ملاقات ہو گئی۔

وہ بھی حمید کو دیکھ کر رک گیا۔

”اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آج آپ ہی تشریف لائے تھے۔“ اس نے کہا۔

”جی ہاں فرمائیے۔“

”آپ کے ساتھ ایک محترمہ بھی تھیں۔“

”جی ہاں تھیں تو..... فرمائیے۔“

”ان کے چہرے پر بعض جگہ نیلے نشانات تھے۔“

”جی ہاں یہ بھی صحیح ہے۔“

”آپ کے جانے کے بعد ایک عمر خاتون پوسٹ آفس میں تشریف لائی تھیں۔“

”پھر.....!“

”انہوں نے بھی انہیں صاحب کے متعلق پوچھ گچھ کی تھی جس کی تلاش آپ کو۔“

انہوں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ یہاں کوئی یوریشین لڑکی تو نہیں آئی تھی۔“

”پھر آپ نے کیا کہا۔“

”میں چونکہ آپ کی شخصیت سے واقف ہو چکا تھا اس لئے میں نے لاعلمی ظاہر کی۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا جناب..... میں شکر گزار ہوں۔“

”لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔“

”کیا وہ بھی کوئی یوریشین ہی تھیں۔“

”جی ہاں۔“

”معلوم ہوا ہو۔“

”ہوسکتا ہے..... پروفیسر کے متعلق کسی اور ذریعہ سے معلوم ہوا ہو۔ لیکن تمہارے تو کس سے علم ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا علم صدائی کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا کہ تم پروفیسر تلاش میں یہاں آئی ہو۔“

صوفیہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میں اس پر یقین نہیں کر سکتی کہ مسٹر م نے می کو میرے متعلق کچھ بتایا ہوگا۔ البتہ یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اس کا تذکرہ کیا ہوگا۔ آفسر سے کیا ہو۔“

حمید کو یاد آ گیا کہ آج اس نے ہی فریدی کو فون پر اس کی اطلاع دی تھی کہ صوفیہ یہاں کن حالات میں ملی ہے تو کیا فریدی ہی نے اسے بتایا ہوگا۔ لیکن اس کا مقصد کیا ہوسکتا کیا یہی کہ پروفیسر خود کو چاروں طرف سے گھرا ہوا محسوس کر کے بوکھلاہٹ میں سامنے آجا۔ ”کیوں تم خاموش کیوں ہو گئے۔“ صوفیہ نے پوچھا۔

”میں یہ سوچ رہا ہوں ممکن ہے میرے آفسر ہی سے انہیں اس کا علم ہوا ہو کیونکہ نے بھی کڑل کو تمہارے متعلق فون پر اطلاع دی تھی مگر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت؟ ویسے تمہاری عمر کیا ہے۔“

”باکیس سال.....!“

”اوہ تب تو تمہاری ماں تمہیں زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتیں۔ تم بالغ ہو چکی ہو۔ صوفیہ کچھ نہ بولی۔ کچھ دیر بعد اس نے اس کی سسکیوں کی آوازیں سنیں۔

”ہائیں..... تم رورہی ہو۔“ حمید بوکھلا گیا۔

صوفیہ روتی رہی۔

”کمال کرتی ہو۔“ حمید بولا۔ ”ارے میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ ر

مجبور نہیں کر سکیں گی۔“

اس کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں اور حمید کی بوکھلاہٹ بدستور قائم رہی۔ اس کی سمجھ

نا کہ وہ اسے کس طرح چپ کرائے۔ اگر کسی نے اسے اس طرح روتے دیکھ لیا تو کیا حمید نے گاڑی ایسے راستوں پر موڑنی شروع کر دی جہاں زیادہ روشنی نہ ہو اور پھر اس راہ راستہ بھٹک گیا۔ روپنگر اس کے لئے نئی جگہ تھی۔

اس طرح بھٹکتا ہوا وہ بستی سے باہر نکل آیا۔ صوفیہ ابھی تک روئے جاری تھی۔ اب حمید ہٹ نے حملہ کیا۔ اس نے جیپ روک کر ریڈیم ڈائیکل والی گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوا سات بجے، حالانکہ ٹھیک سات بجے اسے ہوٹل میں ہونا چاہئے تھا۔

”کیوں..... ہم کہاں آ گئے۔“ صوفیہ نے سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”جنت میں۔“ حمید نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جنت کا اجائے۔ ورنہ تمہیں اس حال میں دیکھ کر یہ بھی ممکن تھا کہ لوگ مجھے جہنم میں پہنچا دیتے۔“ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سرمئی طرح چکرارہا ہے۔ میں اب کہیں نہ جاؤں گی۔ ک بنگلہ لے چلو۔“

”یہی مناسب بھی ہے۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیج کر بولا۔

”کیا تم خفا ہو گئے ہو۔“ صوفیہ نے بھی اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

”نہیں میں بہت خوش ہوں۔ اتنا خوش جیسے میرے پاپا نے پانچویں شادی کر لی ہو۔“

”میں کیا کروں؟“ صوفیہ نے دردناک آواز میں کہا۔ ”کیا تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔“

”دیکھو! تم خواہ خواہ پریشان ہو رہی ہو۔“ حمید نرم لہجے میں بولا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں اری مرضی کے خلاف کچھ نہ ہونے دوں گا۔“

”میں ڈرتی ہوں کہیں می کا سامنا نہ ہو جائے۔“

”اگر ہوا بھی تو کیا ہوگا۔“

”میں نہیں جانتی کیا ہوگا۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ اب می سے دوبارہ ہونے کا کوئی موقع آئے۔“

”کیا ہمیشہ کے لئے۔“

”ہاں..... ہمیشہ کے لئے۔ پاپا کی زندگی می ہی نے برباد کی ہے۔ اگر انہیں دوسری

حکام پری تھی۔

”تم اناپناہ میں ہے۔“ حمید نے گرج کر کہا۔ ”تم اسے بھی قتل کر دینا چاہتی ہو..... کیوں؟“

”تم خاموش رہو۔ یہ میری بیٹی کا معاملہ ہے۔ اگر دخل اندازی کرو گے تو میں قانونی طور پر نہٹ لوں گی۔ تم اسے پھسلا کر بھگا لائے ہو۔“

”میں..... تم جھوٹی ہو۔“ صوفیہ حلق کے بل چیخی۔

”یہ مجال تیری کہ میری بات رد کر دے۔“ مسز نجمی صوفیہ کی طرف جھپٹی۔ لیکچر: ۱۰ یدان۔
ہاں آ گیا۔

”ہٹ جاؤ تم سامنے سے..... ہٹ جاؤ..... ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“

”میں ابھی تمہیں جیل بھجوا دینا مسز منجی۔ تم نے ایک بار پہلے بھی لڑکی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔“
منجی رک گئی۔ لیکن حید کو قہر آلود نظروں سے گھور رہی تھی۔
”یہ میری لڑکی ہے۔“ اس نے حلق چھا کر کہا۔

”تم اے ثابت نہ کر سکو گی۔ لیکن میں اے اپنی بیوی ثابت کر سکتا ہوں۔“

”میں تمہارا خون پی لوں گی۔“

”برف ڈال کر پیتا کیونکہ وہ بہت گرم ہے۔“ حمید مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔

ابن صوفیہ کا بازو پکڑ کر اُسے دوسری آرام کرسی تک لے گیا۔“

”تم اطمینان سے بیٹھو..... تمہاری موی بہت غصے میں ہیں۔ میں ان کے لئے ٹھنڈے
لانا کا انتظام کروں گا۔“

”نہیں..... خدا کے لئے انہیں اور زیادہ غصہ نہ دلاؤ۔“ صوفیہ نے آہستہ سے کہا۔

حیدر اے بٹھا کر منہ منجی کی طرف مڑا۔ وہ اب بھی وہیں کھڑی تھی، لیکن کسی بات کی طرح بالکل حرکت..... حتیٰ کہ اس کی آنکھیں بھی غیر متحرک نظر آ رہی تھیں۔

حیدر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ کسی قسم کی تحویت سے چونکی اور اسی آرام لگنا کی طرف مزگنی جس پر سے اٹھی تھی۔

عورتوں سے دلچسپی ہے تو اس کی ذمہ دار بھی ممی ہی قرار دی جاسکتی ہیں۔ تم خود سوچو.....“

حمید نے دوبارہ انجن اشارٹ کر دیا اور اس کے شور میں صوفیہ کی آواز دب کر رہ گئی۔

”ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں۔“ حمید نے اس وقت پوچھا جب گاڑی کو موڑ کر دوبارہ شاہ رخ کر چکا تھا۔

”میں کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔“

”پاپا کی بربادی کی ذمہ دار مئی کو قرار دے رہی تھی۔“

”ختم کرو..... میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ڈاک بنگلے والیں چلو۔“

”میں وہیں چل رہا ہوں لیکن اس کے لئے بھی ہمیں دوبارہ بستی میں واپس جانا پڑے۔“

گا۔ میں راہ بھٹک گیا ہوں۔“

”کیا تم پہلی بار یہاں آئے ہو۔“

“!.....ہاں”

صوفہ پھر کچھ نہ بولی۔ حمید بدقت تمام اس سڑک تک پہنچ سکا جو ڈاک بنگلے کی طرف جاتی تھی۔

”ماما وہاں ضرور آئے ہوں گے۔“ دفعتاً صوفیہ نے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“

”تم سچ مچ خفا معلوم ہوتے ہو۔“

”نہیں مالکل نہیں۔“

تقریباً بیس منٹ بعد وہ ڈاک منگلے میں پہنچ گئے۔

لیکچر کرے میں قدم رکھتے ہی دونوں رگوما بچلی سی گر پڑی۔ سامنے ہی منبر نمکئی

کر کے اس بیٹھے اہوئی دونوں کو خوشخوار نظر و اسے گھور رہی تھی۔ بیٹھنے کا انداز ایک ایسی

تھاجہ شکار کا تاک میں ہو۔

”کہاں کتا“ وہ صوف کا طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”تجھے شرم نہیں آئی تھی۔“

حمد نے دیکھا کہ صوفیہ کی حالت یک بیک زمامہ ابتر ہو گئی۔ وہ کسی سردی کھائے۔

”ہاں اب تجھے اجازت کی ضرورت نہیں رہی۔ تو اب بالغ ہو گئی ہے۔ یہی بات ہے۔
 تو شاید بھول رہی ہے کہ میں کون ہوں۔“
 ”میں خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“
 ”اسی حال پر چھوڑ سکتی ہوں، جب تیرا جسم روح سے خالی ہو جائے۔“
 ”تو پھر تم مجھے ماری ڈالو۔“ صوفیہ نے سسکی لی۔
 ”میں تجھے سسکا سسکا کر ماروں گی۔“
 ”ارے..... تم ماں ہو اس کی۔“ حمید بول پڑا۔
 ”پھر تم نے دخل دیا۔“

”ہاں..... میں یہاں قانون کا نمائندہ ہوں، تم میری موجودگی میں اسے قتل کی دھمکی
 کر آزاؤ نہیں رہ سکتیں۔“

”کیپٹن پلینز!“ صوفیہ نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن حمید گردن جھٹک کر بولا۔ ”اب تم خاموش
 بہت ہو چکا میں کسی فرد کو نظر انداز نہیں کر سکتا، جس پر ڈور و تھی کے قاتل کا شبہ کیا جا رہا ہو۔“
 ”اُسے ثابت کرنے میں دانتوں پسینہ آ جائے گا۔“ مسز منجی نے زہر خند کے ساتھ کہا۔
 ”ہاں ٹھیک ہے..... اگر میں کسی ستون کر دھکے مار مار کر گرانے کی کوشش کروں گا تو یقیناً
 ل کیا آنکھوں میں بھی پسینہ آ سکتا ہے لیکن اگر میں اس کی بجائے ستون کو بنیاد سے کھودنا
 ناکردوں تو..... تب کیا ہوگا..... مسز منجی۔“

”میں نہیں سمجھی تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ وہ شانوں کو جنبش دے کر لاپرواہی سے بولی۔
 ”میں تمہارے خلاف چھوٹے چھوٹے جرائم کے لئے ثبوت مہیا کروں گا۔ مثلاً ڈور و تھی
 ٹائیس میں تم نے ایک گواہ کے بیان میں ترمیم کرانے کی کوشش کی تھی اور اس کے لئے دو
 لاکھ آفر تھا.....!“

”ایک بیک اچھل کر کھڑی ہو گئی..... اس کا چہرہ کسی لاش کے چہرے کی طرح بے جان
 اُلٹے لگتا تھا۔“

”اس وحشی پن کی مثال شاید جانوروں میں بھی نہ ملے مسز منجی۔“ حمید نے کہا۔
 ”وہ میری لڑکی ہے۔ کیا تم عقل کے اندھے ہو۔“ مسز منجی مٹھیاں بھیج کر بولی۔
 ”تب پھر تم اسے قتل کر دو۔ قانون تمہیں ہر حال میں معاف کر دیا کیونکہ تم اس کی ماں ہو۔“
 ”تجھے ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ صوفیہ تو سن رہی ہے یا نہیں؟“ اس کی
 ماں نے اُسے لٹکارا۔

”میں پاپا کے ساتھ رہوں گی۔“ صوفیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”یہ تیرا پاپا ہے۔“ وہ حمید کی طرف ہاتھ اٹھا کر چیخی۔
 ”اگر یہی بات ہوتی تو تم اتنی غصہ ور اور چڑچڑی نہ ہوتیں۔“ حمید نے پھر مٹھکا اڑا۔
 والا انداز اختیار کیا۔

”میں تمہارا منہ نوج لوں گی ورنہ خاموش رہو۔“
 ”میں جانتا ہوں کہ تم ایسا ضرور کرو گئی..... ایک مثال میرے سامنے موجود ہے۔“
 ”میں کہتی ہوں تم خاموش رہو مجھے اس کتیا سے گفتگو کرنے دو۔“
 ”اگر یہاں کوئی کتیا موجود ہوتی تو میں اُسے اور تمہیں کمرے سے باہر نکال دیتا۔ کہ
 رات کو مجھے کتیاں اور کتوں کے مکالے بالکل پسند نہیں آتے۔“
 ”خاموش رہو۔“ وہ اتنے زور سے چیخی کہ اس کی آواز پھٹ گئی اور اس پر کھانسیا
 دورہ پڑ گیا۔

”کیپٹن پلینز..... خدا کے لئے۔“ صوفیہ نے ہاتھ اٹھا کر خیف آواز میں کہا۔
 ”میں قطعی خاموش ہوں تم دونوں گفتگو کرو۔“ حمید نے ملازم کی طرف دیکھ کر
 برآمدے میں کھڑا حیرت سے پلکیں جھپکا رہا تھا۔ حمید نے ہاتھ ہلا کر اُسے وہاں سے جا
 اشارہ کیا۔

”ہاں بول کیوں آئی تھی یہاں۔“ مسز منجی نے حمید پر دانت پیستے ہوئے صوفیہ سے پوچھا۔
 ”میں پاپا کی تلاش میں آئی تھی۔ مجھے..... مم..... مجھے..... اجازت.....!“

خوفناک دھماکہ

”ہاں..... میں ظالم ہوں۔ پھر..... کیا میں تم سے پوچھ سکتی ہوں کہ تم ظالم کیوں نہیں
اس نے صوفیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔“

”مجھے ظلم سے نفرت ہے۔“

”لیکن میں ظلم کئے بغیر سکون نہیں پاسکتی۔“ مسز نجمی نے کہا۔ ”میں نے تم سے کبھی یہ نہیں
کہ تم ظلم سے نفرت کرو۔ تم دوسروں پر رحم کر کے سکون محسوس کرتی ہو۔ میں تم سے تمہارا
نہیں چھیننا چاہتی۔ پھر تمہیں کب یہ حق پہنچتا ہے کہ تم مجھے سکون نہ ملنے دو۔“

”اس فلسفے کی راہ پھانسی کے تختے پر ختم ہوتی ہے۔“ حمید بولا۔

”جہنم ہی میں کیوں نہ ختم ہوتی ہو۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔“

”تو تم اعتراف کرتی ہو کہ تم نے ڈورو تھی کو قتل کیا تھا۔“

”میرے کس جملے سے تم نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا۔“

”خیر..... خیر..... تم اعتراف کر لو گی..... مجھے یقین ہے۔“

”ظلم کرنے والے ظلم برداشت کرنے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔“

”آہا..... بہت خوب۔“ حمید ہنسنے لگا۔ ”کیا یہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔“

”نہیں..... بلکہ تم اپنے لئے کنواں کھود رہے ہو۔“

”یہ کس سلسلے میں محترمہ۔“

”یہ لڑکی نابالغ ہے اور تم اسے پھسلا کر لائے ہو۔“

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔“ حمید نے رو دینے والی آواز میں صوفیہ سے پوچھا

نامو فیہ صرف ہوتوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

”تم مجھے نہیں جانتے۔“ مسز نجمی غرائی۔

”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں تمہیں نہیں جانتا۔“ حمید اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

”لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نے شہر کس کی اجازت سے چھوڑا۔ دوسرا جرم تم پر عائد ہو رہا ہے۔“

”میرے پاس کرنل فریدی کا اجازت نامہ موجود ہے۔“

یہ اطلاع صوفیہ کے لئے بھی شاید ڈراؤنی ہی تھی۔ وہی کیفیت اس کی بھی ہوئی لیکن اس
کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ حیرت بھی تھی۔

”ممی.....!“ وہ تھوک نکل کر بولی۔ لیکن اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکی۔

”تم نے.....!“ حمید نے مسز نجمی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”مسز لاڈیل کے بیان پر

ایک ایسا اضافہ کرانا چاہا جس کی بناء پر پروفیسر کے لئے پھانسی کے تختے کے علاوہ دنیا میں اور
کوئی جگہ نہ ملتی۔“

”ممی.....!“ صوفیہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔

لیکن مسز نجمی کوئی جواب دیئے بغیر آرام کرسی میں ڈھیر ہو گئی۔ وہ بُری طرح کانپ رہی

تھی اور اس کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔

”یہ تم کیا کر رہی تھیں..... ممی.....!“ صوفیہ پھر چیخی۔

”تم خاموش رہو۔“ حمید نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ ابھی اعتراف کریں گی کہ ڈورو تھی ا

قاتلہ یہی ہیں۔“

”یہ غلط ہے..... بالکل غلط۔“ مسز نجمی نے ہاتھ اٹھا کر کمزور آواز میں کہا۔ پھر ٹٹکا

ہوئوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”لیکن اس کا اعتراف ہے کہ میں نے لاڈیل کے بیان میں غلط

آواز کا اضافہ کرانے کی کوشش کی تھی۔“

”ممی..... تم کتنی ظالم ہو۔“ صوفیہ نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مسز نجمی رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ خشک کر رہی تھی۔ پھر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ا

ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں

میں پھر وہی پہلی سی چمک عود کر آئی اور جبروں کی رگیں ابھرنے لگیں۔ شاید اس نے بہت

سے دانتوں پر دانت جمائے تھے۔

”کیا مطلب؟“ حمید اے گھور نے لگا۔

”کیا تم دیکھو گے۔“ مسز نجی نے تسخراً آمیز لہجے میں کہا۔

”میں ضرور دیکھوں گا..... اگر وہ جعلی ثابت ہوا تو تمہیں یہاں سے زیر حراست ٹھہرا لیں جانا پڑے گا۔“

مسز نجی نے اپنے ہینڈ پرس سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور حمید کی طرف بڑھایا۔

حمید نے فریدی کے دستخط پہچان لئے اور اس کے طرز تحریر کو پہچاننا بھی اس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اجازت نامہ ٹائپ کیا ہوا نہیں تھا بلکہ خود ہی تحریر کیا تھا اور یہ اجازت نامہ روپے نگر کے لئے تھا۔

”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا تھا کہ صوفیہ یہاں آئی ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”کرنل فریدی سے۔“ اس نے بیزار سے کہا۔ ”اس پر تمہارے لئے ان کا ایک خط لکھ لائی ہوں۔“

”لاؤ..... دیکھوں.....!“ حمید نے ہاتھ بڑھادیا۔

”تمہیں وہ نہیں مل سکتا اسے میں تمہارے خلاف عدالت میں استعمال کروں گی۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”کرنل نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ تمہیں زبانی بتایا جاسکتا ہے۔“

”اچھا.....!“ حمید نے ایک طویل سانس لی اور کچھ سوچنے لگا۔

”انہوں نے لکھا ہے کہ حمید میں تم سے تنگ آ گیا ہوں۔ لڑکی کو مسز نجی کے حوالے کر دو۔“

”ورنہ تمہیں اغواء کے الزام سے نہ بچا سکوں گا۔ مسز نجی کے بیان کے مطابق لڑکی نابالغ تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تم اسے مسز نجی کی مرضی کے خلاف روپے نگر لے جا رہے ہو۔“

”میں اس بے سرو پا بیان پر یقین نہیں کر سکتا۔“

”تم یقین کرو یا نہ کرو۔ یہ تحریر ایک دستاویز کی سی حیثیت رکھتی ہے اور کسی وقت بھی۔“

”تمہارے خلاف استعمال کر سکتی ہوں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے میرے ساتھ جانے دو۔“

”یہ اپنے پاپا کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، تم اسے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔“

”کیا تم نجی کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔“ دفعتاً وہ صوفیہ کی طرف مڑی۔

”ہاں..... میں پاپا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن وہ تمہیں اپنی قبر میں نہیں رکھ سکے گا۔“

”یعنی.....!“ حمید اے گھور نے لگا۔

”وہ ڈور تھی کا قاتل ہے۔“

”نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط ہے..... می..... خدا کے لئے۔“ صوفیہ چیختی۔

”وہ ڈور تھی کا قاتل ہے۔ اسے دنیا کی کوئی قوت نہیں بچا سکتی۔“

”کیا تم نے لاڈیل کے علاوہ بھی کوئی اور گواہ تیار کر لیا ہے۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”یقیناً.....!“ وہ بھی بالکل اسی انداز میں مسکرائی۔ ”میں نے اس بار ایک بڑے افسر کو

دلی ہے۔“

”اچھا.....!“ حمید مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسا۔

”اور وہ آفیسر کرنل فریدی ہے۔“

”شاید تمہیں نیند آ رہی ہے محترمہ۔“ حمید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ مسز نجی نے لاپرواہی سے کہا اور صوفیہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تم چلنے

لے تیار ہو جاؤ، ورنہ تمہیں اپنی اس غلطی پر زندگی بھر افسوس رہے گا۔“

”مجھے خواہ مخواہ خوفزدہ کرنے کی کوشش نہ کرو می۔“ صوفیہ روہانی آواز میں بولی۔

”ٹھیک اس وقت کہاؤ گے کہ میں روشنی نظر آئی۔ شاید کوئی کار اندر آئی تھی۔ حمید اٹھ گیا۔ کار

سے سامنے ہی رکی تھی۔ انجن بند کر دیا گیا اور اگلی روشنیاں گل ہو گئیں۔ پھر کوئی کار

زبرد آمد کے کی طرف بڑھا اور جیسے ہی وہ برآمدے میں داخل ہوا لیمپ کی روشنی اس پر

اگرید بولکھا کر پیچھے ہٹ گیا۔

آنے والا کرنل فریدی تھا۔ اس نے کمرے میں آ کر چاروں طرف دیکھا اور صوفیہ کی

طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”یہی لڑکی ہے مسز نجمی۔“
 ”جی ہاں.....!“ مسز نجمی کھڑی ہو گئی تھیں۔
 ”بیٹھے..... بیٹھے۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔

”کیا آپ نے میرے لئے انہیں کوئی خط دیا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔
 ”نہیں تو..... کیوں کیسا خط۔“

حمید جواب دینے کی بجائے مسز نجمی کو گھورنے لگا۔ لیکن مسز نجمی ایسے بے تعلقاتانہ
 میں نظر آ رہی تھی جیسے اس بات سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

فریدی نے بھی اس کی طرف دیکھا اور پھر حمید سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔“
 ”کچھ نہیں مجھے اندازہ ہے کہ میں نے انکی کسی نابالغ لڑکی کا انواء کیا ہے۔
 سلسلے میں آپکی کوئی تحریر بھی تھی انکے پاس۔ جسے یہ عدالت میں میرے خلاف استعمال کرنے
 کیوں مسز نجمی۔“

”کچھ بھی نہیں! میں اپنی لڑکی کو یہاں سے لے جانا چاہتی تھی۔“

”آپ کو کس نے روکا ہے۔“ فریدی نے حیرت سے کہا۔
 ”یہ صاحب خواہ مخواہ اُسے بہکا رہے ہیں۔“ مسز نجمی نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔
 ”مجھے کسی نے نہیں بہکایا۔“ صوفیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
 ”تم خاموش رہو۔“ مسز نجمی دہاڑی۔

”نہیں خاموش رہوں گی۔“ صوفیہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ ”میں تمہارے ساتھ
 رہنا چاہتی۔ تم مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔ میں بالغ ہوں، نہیں رہوں گی..... نہیں رہوں گی۔
 ظالم ہو۔ میں پاپا کے ساتھ رہوں گی۔“

”صبر..... لڑکی..... صبر۔“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”شور نہ مچاؤ۔“

”یہ بہت بُری طرح بہکائی گئی ہے۔“ مسز نجمی دانت پیس کر بولی۔

”ہمیں اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں۔ میں فی الحال آپ سے پروفیسر کے

برکرنا چاہتا ہوں۔“

”تو کیا..... یعنی میری لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

”یہ آپ کا نجی معاملہ ہے آپ جانئے۔“

”لیکن آپ کا اسٹنٹ۔“

”خبردار..... اگر میرا نام اس تذکرے میں لائیں تو میں تم پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ

داں گا۔“ حمید غرایا۔

”خاموش رہو۔“ فریدی اسے گھورنے لگا۔

چند لمحوں کے لئے کمرے کی فضا پر جو جھل سی خاموشی مسلط ہو گئی۔ پھر فریدی نے مسز نجمی
 رف دیکھ کر کہا۔ ”پچھلی رات میں نے پروفیسر کو شہر میں دیکھا تھا۔“
 ”کہاں.....!“ حمید نے پوچھا۔

”اسی عمارت میں جہاں ڈوروتھی کی لاش ملی تھی۔“

”پھر..... پھر..... آپ نے روکا کیوں نہیں۔“ صوفیہ نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”ایسے پھر تیلے آدمی بہت کم میری نظروں سے گزرے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس
 تیلے پن کی وجہ سے وہ میرے ہاتھ نہ آ سکے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنا توازن کھو بیٹھے ہیں۔“
 مسز نجمی بہت توجہ اور دلچسپی سے سن رہی تھی۔ فریدی کے خاموش ہوتے ہی اس نے
 ہلا۔ ”کیا آپ پچھلی رات عمارت میں موجود تھے۔“

”ہاں..... مجھے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس سے اس حادثے پر کوئی روشنی پڑ سکے اور شاید
 غیر بھی کسی چیز کی تلاش بنی میں وہاں آئے تھے۔ بہر حال میں نے انہیں اسی وقت دیکھا
 ہوا ایک کمرے کی دیوار میں لگی ہوئی ایک پوشیدہ تجوری کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”اوہ..... پوشیدہ تجوری۔“ مسز نجمی آگے جھک آئی، اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی
 دلچسپی نظر آنے لگی تھی۔

”میں نے انہیں رکنے کو کہا لیکن وہ نکل بھاگے۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کتنے پھر تیلے ہیں

جب تک میں گلی میں پہنچا وہ عقبی دروازے سے نکل کر اندھیرے میں غائب ہو چکے تھے۔
 مسز نجی کے چہرے پر اس وقت زیادہ تازگی اور توانائی نظر آ رہی تھی۔ اس کے برعکس
 صوفیہ کی حالت غیر تھی۔ وہ آرام کرسی کی پشت سے لگی ہوئی بانپ رہی تھی۔ اس کی زبان بار
 ہونٹوں پر تیرتی نظر آتی۔

”بہر حال میں انہیں پانہ سکا لیکن اب یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ڈوروتھی کے قاتل وہی ہیں
 ”نہیں.....!“ صوفیہ دونوں ہاتھ اٹھا کر چیختی۔ ”نہیں..... نہیں..... نہیں۔“
 وہ اسی طرح ہاتھ اٹھائے ہوئے ”نہیں نہیں“ کی تکرار کرتی رہی۔ بالکل ایسا ہی م
 ہو رہا تھا جیسے اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز خیف ہوتی گئی۔
 اس پر جھکا ہوا اسے آوازیں دے رہا تھا۔ آخر وہ بالکل خاموش ہو گئی۔
 ”بیہوش ہو گئی۔“ حمید نے سیدھے کھڑے ہو کر تشویش کن لہجے میں کہا۔
 ”وہ بہت جذباتی لڑکی ہے۔“ مسز نجی نے اپنی جگہ سے اٹھے بغیر لا پرواہی سے کہا۔
 ”تمہاری ہی لڑکی ہے۔“

”یقیناً..... لیکن اپنے باپ کی طرح چور اور بزدل ہے۔“

فریدی حمید کو گھور رہا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا ورنہ اس کا تو دل چاہا تھا کہ
 اٹھا کر کھڑکی کے باہر پھینک دے۔

”آخر آپ کس بناء پر کہہ رہے ہیں کہ نجی ہی اس کا قاتل ہے۔“ مسز نجی نے فربہ
 سے پوچھا۔

”میں نے وہ پوشیدہ تجوری کھول لی تھی۔ اس میں سے کچھ ایسی چیزیں برآمد ہوئیں م
 کے طور پر کچھ خطوط جو ڈوروتھی کے کسی عاشق نے اسے لکھے تھے اور ایک تصویر جس میں ڈورا
 اپنے کسی عاشق کے بازو میں ہاتھ ڈالے کھڑی نظر آتی ہے۔ ان خطوط میں سے ایک میں
 تھا ”مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم اس موٹی آسامی پر اپنی معصومیت کا سکہ بٹھا کر اُسے دونوں ہاتھ
 سے لوٹ رہی ہو مگر دیکھو مستقبل کے لئے بھی کچھ بچا رکھو۔“ بچپلی زندگی میں ہمیں بہت کچھ

مگر آج ہم قریباً کنگال ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ خود ہی سوچئے کیا یہ خط پروفیسر کو
 نکل کر دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔“

”یقیناً..... یقیناً۔“ مسز نجی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ لیکن دفعتاً حمید نے فریدی کو
 بلے رکھا۔ وہ کھڑکی کی طرف جھپٹا تھا۔ ساتھ ہی باہر سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی بلندی
 پر اڑا ہو۔

”ٹھہرو..... پروفیسر..... ورنہ گولی مار دوں گا..... ٹھہرو۔“ فریدی نے کہا اور دروازے
 طرف جھپٹا۔ حمید بھی دوڑا اور دونوں دوڑتے ہوئے پھاٹک تک آئے وہ آگے بڑھنے ہی
 لگے۔ کچھ دور پر کوئی گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ایک لمحہ کے لئے عقبی روشنی نظر آئی اور پھر
 رے میں مدغم ہو گئی۔ گاڑی کی آواز دور ہونے لگی۔ فریدی پھر بھاگ کر کمپاؤنڈ میں آیا۔
 لابیپ ہی سامنے پڑی اور وہ اچھل کر اسٹیرنگ کے سامنے جا بیٹھا۔ حمید نے بھی دیر نہیں

تھوڑی دیر بعد وہ اس گاڑی کے پیچھے تھے۔ اگلی گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی لیکن اس کا
 ہر کی طرف نہیں تھا۔

”آپ نے اندھیرے میں کیسے پہچان لیا۔“ حمید نے پوچھا۔

”مونچیس، کھڑکی میں لیمپ کی روشنی تھی۔ میں نے اس کی مونچیس دیکھی تھیں۔“

حمید نے اسے آج کا واقعہ سنایا کہ کس طرح وہ انہیں ڈانچ دے کر ہوٹل سے غائب ہو گیا
 ریل کی کچھ نہ بولا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔ پھر کچھ دور چل کر اگلی گاڑی
 کے بائیں جانب کچے راستے پر اتر گئی۔ وہ بھی جیب ہی تھی اور اب اس کی ہیڈ لائٹس
 تنہا کی جارہی تھیں، یہ راستہ اتنا تاریک تھا کہ فریدی کو رفتار کم کر دینی پڑی۔ لیکن اگلی
 گاڑی کوئی اور ہچکولے لیتی بھاگی جارہی تھی۔ پھر اونچے نیچے ٹیلوں کے سلسلے شروع ہو گئے
 گاڑی جیب ٹیلوں کے درمیان مڑتی ہوئی نظر آئی۔ پھر ایک دلخراش چیخ سنائے میں دور
 لپٹی چلی گئی اور وہ دھماکا تو بہت ہی لرزہ خیز تھا، جو اس کے بعد سنائی دیا۔ فریدی نے بڑی

”ہے انداز میں کہا۔“ آپ بولتے کیوں نہیں۔“
 ”نہیں..... وہ کوئی چور تھا۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”اس تاک میں تھا کہ ہم سو

اپنی اور وہ ہمارا سامان لے کر چلتا بنے۔“
 ”دیکھا..... میں نہ کہتی تھی۔“ وہ اپنی ماں کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی اور مسز نجمی کے
 بے پر پھر وہی پہلے کا سا بڑھا پا طاری ہو گیا۔

”دوسری صبح فریدی نے تنویر صدیقی کو فون کیا کہ پروفیسر ایک حادثے میں کام آ گیا ہے۔
 ڈرار اوپ مگر پہنچ جائے..... دوسری صبح ندی میں اس کی لاش کی تلاش جاری تھی لیکن وہاں
 پ کے ڈھانچے کے علاوہ اور کچھ نہ مل سکا۔

حمید ڈاک بنگلے ہی میں تھا اور اس نے فریدی کی ہدایت کے مطابق ماں بیٹی کو حالات
 سے خبر رکھا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے فریدی بستی سے ڈاک بنگلے واپس آیا۔ اس نے صوفیہ
 کہا۔ ”میں تمہاری ماں کو بستی تک لے جا رہا ہوں۔ تم ہماری واپسی تک یہیں ٹھہرو گی۔“

”آپ کے کہنے سے میں ٹھہر جاؤں گی۔“ صوفیہ نے جواب دیا۔
 پھر وہ حمید اور مسز نجمی کے ساتھ اپنی کار میں بیٹھ گیا..... اور کار بستی میں پہنچ کر کو توالی کی
 رن مڑ گئی۔ جب وہ کو توالی میں داخل ہو رہی تھی مسز نجمی نے چونک کر کہا۔

”یہ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔“
 ”کیوں.....؟“

”بس یونہی..... پروفیسر کا وکیل بھی یہاں موجود ملے گا شاید..... ٹھہرو۔“
 وہ کار روک کر نیچے اتر پڑا۔ حمید اور مسز نجمی بھی اترے۔
 ایک بڑے کمرے میں تنویر صدیقی اور چار مقامی پولیس آفیسران کے منتظر تھے۔

بڑی میز کے گرد تین کرسیاں شاید انہیں کے لئے خالی تھیں۔ ان کے بیٹھے ہی تنویر صدیقی
 حاضر بن کر انداز میں پوچھا۔ ”پروفیسر کو کیا حادثہ پیش آیا ہے۔“

”جھجھکی رات میں اُس کا تعاقب کر رہا تھا اس کی جیب بے قابو ہو کر ندی کے پاس والے

مجلت سے اپنی گاڑی کے بریک لگائے اور وہ حقیقتاً لٹتے لٹتے پہنچی۔ انجن بند کر کے وہ نیچے
 گیا۔ دونوں ہی پوری قوت سے اس طرف دوڑ رہے تھے جدھر اگلی جیب مڑی تھی۔ فریدی نے
 دوڑتے ہوئے ٹارچ روشن کی۔

وہ منظر بڑا ڈراؤنا تھا۔ تقریباً ساٹھ فٹ نیچے جیب کے پچھلے حصے سے شعلے نکل رہے تھے
 اور وہ آدھی سے زیادہ نشیب میں بہنے والی ندی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”یقیناً..... اس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا تھا۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”پتھاری
 صوفیہ پر کیا گزرے گی۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بدقت تمام اس مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے
 جہاں جیب سمیت گرنے سے پہلے ہی پروفیسر کی آخری چیخ گھٹ کر رہ گئی تھی۔

جیب ندی میں الٹی پڑی ہوئی تھی اور اب شعلے آہستہ آہستہ اپنا جوش و خروش کھوئے
 جا رہے تھے۔

”لاش کیسے نکالی جائے۔“ حمید بڑبڑایا۔
 ”مجھے توقع نہیں ہے کہ لاش مل سکے۔ ندی کا بہاؤ نہیں دیکھتے۔“

”پھر بھی ہمیں کوشش تو کرنی ہی چاہئے۔“
 ”فضول ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”آؤ واپس چلیں۔“

حمید کا دل نہیں چاہتا تھا مگر طوعاً و کرہاً اُسے واپس ہونا پڑا۔ صوفیہ کی وجہ سے اب اس
 پروفیسر سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لئے اس کا یہ غیر متوقع انجام اس کے لئے

تکلیف دہ ثابت ہوا تھا اور وہ ایک بیک اتنی تھکن محسوس کرنے لگا تھا جیسے سینکڑوں میل۔
 پیدل چل کر آیا تھا۔

ڈاک بنگلے میں دونوں بے چینی سے ان کی منتظر تھیں۔
 صوفیہ کو ہوش آ گیا تھا انہیں دیکھتے ہی وہ میساختہ اچھل پڑی۔

”بولئے..... بتائیے..... وہ پاپا تھے۔ نہیں وہ پاپا نہیں رہے ہوں گے۔“ اس نے

ہاتھ۔ اب دیکھئے تا آپکی آنکھیں اب آنسوؤں کی بجائے چنگاڑیاں برسار ہی ہیں۔“
فریدی کے اس رویہ پر حمید بھی متحیر رہ گیا۔ آخر اتنی سی بات کے لئے شہر کے ایک بڑے
زکیل کی توہین کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

”میں کیا جانوں کہ بینک بیلنس کتنا تھا۔“ اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چیک تو آپ ہی کیش کر کے رقم بذریعہ منی آرڈر بھجواتے تھے۔“

”ہیئر چیک ہوتے تھے، کیش کرا لئے جاتے، مجھے اسکا علم کیسے ہو سکتا تھا کہ بیلنس کتنا ہے۔“

”ایک بات اور سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہاں بھی بینک موجود تھا تو پروفیسر نے یہیں

رقم کیوں نہیں منتقل کرائی۔ آپ کو کیوں تکلیف دیتا رہا۔“

”اس کا جواب پروفیسر کے علاوہ اور کوئی نہیں دے سکتا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں اسے دوبارہ نہ پیدا کر سکوں گا۔“

آپ یہ نہیں کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں۔ میں پروفیسر کا قانونی مشیر تھا اور اس

راہوں گا جب تک کہ اس کے درثناء مجھے میرے فرائض سے سبکدوش نہ کر دیں۔

اب میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ پروفیسر نے کتنا اثاثہ چھوڑا ہے۔“

ریڈی چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ”اب پتے پھینک دو،

کل ہی پروفیسر کی لاش دریافت کی ہے۔“

آپ کیوں مذاق اڑا رہے ہیں۔“ تنویر چیخا۔ حمید کے علاوہ دوسرے بھی فریدی کو

سے دیکھ رہے تھے۔

ہاں..... مائی ڈیر..... تنویر صدیقی..... ڈورو تھی پروفیسر کے روپوش ہونے سے پہلے ہی

کے من میں ایک حوض بنوا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہنسون کا ایک جوڑا حاصل

ک میں ڈالے گی۔ یہ پروفیسر کے نوکروں کا بیان ہے۔“

نکلتا تنویر کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی اور اس نے اٹھنا چاہا۔

”ٹھو.....“ فریدی غرایا..... اور آفیسروں نے اسے دبوچ کر بٹھا دیا۔

ٹیلوں میں جامڑی اور شاید وہ ساٹھ فیٹ کی بلندی سے جب سمیت ندی میں جا پڑا۔“

”اوہ.....!“ مسز نجی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھیں

لگیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے سینے میں ہزاروں تھپتھپوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہی

”تم واقعی بہت اذیت پسند ہو۔“ فریدی اس کی طرف مڑ کر تنفر آمیز لہجے میں بولا۔

”اگر میں کسی کی موت پر قہقہے لگاؤں تو قانون میرا کیا بگاڑے گا۔“

”قانون تو کچھ نہیں بگاڑ سکے گا مگر انسانیت ضرور تم پر روئے گی۔“

”انسانیت تو ازل ہی سے روتی آئی ہے۔“

دوسرے پولیس آفیسر اُسے گھورنے لگے۔

”یہ اس کی بیوی ہے جناب۔“ ایک نے پوچھا۔

”ہاں..... یہ اس کی بیوی ہے۔“ فریدی نے کہا اور صدیقی کی طرف متوجہ ہو گیا:

آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”کیا پروفیسر نے کبھی کوئی وصیت بھی مرتب کی تھی۔“

صدیقی نے نفی میں سر ہلا دیا اور رومال سے آنسو خشک کرنے لگا۔

”اندازاً کتنا بینک بیلنس ہوگا۔“

”مجھے..... اے..... اے..... ای..... اس کا بھی علم نہیں۔“

”براہ کرم آپ دوسرے کمرے میں جا کر اچھی طرح رو آئیے پھر ہم گفتگو کریں۔“

”میرا بھائی..... میرا دوست دنیا سے اٹھ گیا۔“ تنویر مجنونانہ انداز میں چیخا۔

”وہ تھپڑ رسید کروں گا کہ دونوں آنکھیں باہر آ جائیں گی۔“

”جی..... کیا مطلب۔“ صدیقی ہکا بکا رہ گیا۔

”میں پوچھتا ہوں کہ پروفیسر کا کتنا بینک بیلنس تھا۔“

”آپ تمیز سے گفتگو کیجئے مسٹر۔“ صدیقی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”اوہ..... معاف کیجئے وکیل صاحب۔ آپ کا غم دور کرنے کیلئے میں نے ایک نفسیاتی

”تم خواہ مخواہ مجھے اور زیادہ پریشان کر رہے ہو۔“ تنویر نے سنبھالا لیا۔ ”دوست کی موزی کا صدمہ کیا کم ہے۔“

”تم دوست کا صدمہ آج لے بیٹھے ہو۔ حالانکہ دوست کی موت آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے واقع ہوئی تھی۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو۔“ تنویر نے ایک ہندیانی سا قہقہہ لگایا اور فریدی کے چہرے پر قریب انگلی چٹا کر ہنستا ہی رہا۔

”کسی ماہر ڈاکٹر کے سرٹیفکیٹ کے بغیر تمہیں پاگل بھی نہیں قرار دیا جاسکتا تنویر۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”تم دونوں کے جسم کی بناوٹ یکساں تھی۔ قد بھی یکساں تھا۔ اگر تم اتنی بڑی مصنوعی مونچھیں لگا لو تو دور سے دیکھنے والوں کو تم پر پروفیسر ہی کا دھوکا ہوگا۔ مگر تم تو نامکمل میک اپ کرتے رہے ہو۔ اس لئے عام آدمی قریب سے بھی تمہیں پروفیسر ہی سمجھتے۔ یہ تو بتاؤ کہ کون گدھا کسی کو قتل کرنے کے لئے شور مچانے والی جیپ میں بیٹھ کر کہیں جائے سینٹ جوزف کالونی تو بہت گھنی آبادی رکھتی ہے اور پھر وہ دوسری حماقت کرے گا یعنی:

ہی میں بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگاتا تاکہ جیپ کے شور سے جاگے ہوئے پڑوسی اس کے چہرے جھلک دیکھ سکیں۔ تم نے پروفیسر کی آڑ لے کر ڈور تھی کو قتل کر دیا۔ پھر مستقل طور پر مجھے پرانے کی کوشش کرتے رہے کہ پروفیسر اسے قتل کر دینے کے لئے ایک بہانہ رکھتا تھا اور ہی پروفیسر کی زندگی کا ثبوت بھی پیش کرتے رہے البتہ پوشیدہ تجوری والے معاملے میں تم گئے۔ اس سے تمہارا مقصد یہی تھا کہ وہ خطوط میرے ہاتھ لگ جائیں اور میں یہ سمجھا پروفیسر انہیں تلف کر دینے کے لئے وہاں آیا تھا۔ ظاہر ہے ان خطوط کو دیکھ کر میں یہی سوچتا تھا کہ پروفیسر ہی ڈور تھی کا قاتل ہے اور اس لئے انہیں تلف کر دینا چاہتا تھا کہ کہیں کے خلاف ثبوت کے طور پر نہ استعمال کئے جائیں۔ لیکن بوڑھے بیٹے تنویر..... تم اس جو اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑ آئے تھے۔ ذرا احتیاط کی ہوتی۔ دستانے پہن لئے ہوتے۔

”یہ جھوٹ ہے مجھے چھوڑ دو۔“ تنویر آفسروں کی گرفت سے نکلنے کے لئے تڑپا۔

”اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ کل تم خود کو دیکھا کر حمید اور صوفیہ کو ڈانچ دے گئے تھے اور کل کو تم نے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اب قصہ ہی ختم ہو گیا یعنی ڈور تھی کا ختم ہی، دلیا، لہذا اس کیس کا فائل بند کر دیا جائے اور تم اطمینان سے ڈھائی لاکھ کی وہ رقم ہر طرف میں لاسکو گے جو پروفیسر نے ڈیڑھ ماہ قبل مختلف بینکوں سے نکالی تھی۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ صدائی چینا۔

”خاموش رہو۔ کسی بھی سازش کے لئے بہت بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ہر پر غور کر سکے۔ تم نے یہ نہ سوچا کہ اس سے پہلے پروفیسر اپنے نوکروں سے بچے چچا، شکر اتار رہا ہوگا اور انہیں بھی ان بینکوں کا علم رہا ہوگا جہاں جہاں پروفیسر کی رقم جمع ہو گئی۔ میں نے ان سب بینکوں کو چیک کیا اور اس نتیجے پر پہنچا آج سے ڈیڑھ ماہ قبل ان میں سے ایک ہی دن اور ایک ہی تاریخ کو ساری رقمات نکالی گئی تھیں جن کی مجموعی تعداد ڈیڑھ لاکھ نا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ پروفیسر کے نمونے کے دستخط بھی دیکھے اور پھر بینک میں اہاں سے تم چیک کیش کرا کے پروفیسر کو روپ نمبر کے پتہ پر مٹی آرڈر بھیجا کرتے تھے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے۔“ تنویر صدائی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”سنئے جاؤ۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”یہاں اس بینک میں حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ ہاں دس ہزار سے زائد کا اکاؤنٹ کھولا گیا تھا اور اس کے دوسرے ہی دن جب دوسرے نمونوں سے ڈھائی لاکھ سمیٹے گئے تھے اور بتاؤں..... وہاں نمونہ کے دستخط پچھلے دستخطوں سے بالکل مختلف تھے۔ تم نے اکاؤنٹ پروفیسر کے نام سے کھولا تھا لیکن نمونہ کے دستخط چونکہ خود کے تھے اس لئے ان کا پروفیسر کے اصل دستخط سے مختلف ہونا لازمی تھا۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پروفیسر کو تم نے قتل کیا تھا یا ڈور تھی نے۔ لیکن تم دونوں ہی اس سازش میں شریک تھے۔ مشین کی ایجاد کے سلسلے میں روپوشی کا قصہ بھی غلط نہیں معلوم ہوتا۔ تم دونوں نے اسے رائے دی ہوگی کہ وہ مختلف بینکوں سے سارا روپیہ سمیٹ کر کسی ایک بینک میں جمع کرادے۔ اس طرح منافع بھی معقول ملے گا اور اس کے بیچے ہوئے چیکوں کو کیش کرا کے اسے رقمات

نہجری کا جس پر تم بوکھلاہٹ میں اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑ گئے تھے۔ اور پھر پڑیں اس
 محل پر جس نے بینکوں سے رقومات نکلوانے کے بعد ان کا ایک قلیل حصہ کسی دوسرے بینک
 میں جمع کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ تنویر، کیا پروفیسر روپ نگر میں
 اپنے پاس کیش نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے لئے تم سے کوئی بھی جواب طلب نہ کرتا کہ تم نے اسے
 رقم کیوں لے جانے دی بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ کوئی بینک کسی طرف دھیان بھی نہ دیتا۔
 اگر تم یہ بتاتے کہ وہ روپ نگر سے تمہیں چیک بذریعہ ڈاک بھیجتا ہے اور تم اُسے کیش کرا کے رقم
 بذریعہ منی آرڈر بھیج دیتے ہو۔ یہ قصہ سن کر تو فوراً ہی یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر پروفیسر نے وہیں
 کے بینک میں اپنی کچھ رقم کیوں نہیں منتقل کرائی۔

”انہوں نے لاڈیل کے بیان میں ترمیم کرنے کی کوشش کی تھی۔“ حمید نے مسرنجی کی
 طرف دیکھ کر فریدی کو یاد دلایا۔

”اس کے لئے انہیں عدالت میں جوابدہ ہونا پڑے گا۔“ فریدی بولا۔ ”ویسے میرا خیال
 ہے کہ یہ حرکت صرف اس لئے کی گئی تھی کہ یہ اتفاقاً حادثے والی رات کو ہوٹل سے باہر چلی گئی
 نہیں۔ لہذا پولیس کے شبے سے بچنے کے لئے انہوں نے بدحواسی میں یہ حرکت کر ڈالی۔ ظاہر
 ہے کہ اگر لاڈیل اپنے بیان میں فائر کی آواز کا بھی اضافہ کر دیتی تو ان کی طرف سے شبہات ختم
 ہو جانے کا بھی امکان تھا۔“

”ہم سب کہتے ہیں۔“ مسرنجی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کوئی کاٹ لینے کی دھمکی
 دیا ہے اور کوئی نہایت خاموشی سے کاٹ لیتا ہے۔ لیکن کتے احسان فراموش نہیں ہوتے۔“
 اس نے تنویر کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”یہ کتے سے بھی بدتر ہے۔ اسے کس نے تنویر
 مرنائی بنایا تھا۔ کس نے اس کے لئے اتنا بڑا آفس مہیا کیا تھا۔ کس نے اسے سہارا دیا تھا۔
 اب یہ ڈپلومہ لینے کی بعد در در کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ تنویر کیا تم بھول گئے۔ احسان
 فراموش گندے کپڑے۔ میں تو اس کی کھلی ہوئی دشمن تھی۔ اس پر غصے میں چھری پھینک مارتی
 تھی۔ تو مجھے ذلیل اور کمینہ کہتا تھا۔ اب میں تجھے کیا کہوں۔“

بھی بذریعہ منی آرڈر بھیجی جاتی رہیں گی۔ ممکن ہے مشین کی ایجاد اور روپوشی کی کہانی بھی تمہاری
 ذہنی اختراع ہو..... لیکن بہر حال پروفیسر کے لئے اتنا ہی کافی ہو سکتا تھا کہ اس کی بکھری ہوئی
 رقم یکجا ہو جانے سے زیادہ سود ملنے لگے گا۔ ہاں تو رقم اس رات گھر ہی میں رہی اور پروفیسر کو
 یہ سمجھایا گیا کہ وہ دوسرے دن جمع کرا دی جائے گی اور پھر اسی رات کو پروفیسر ختم کر دیا گیا۔
 چونکہ اسکیم بہت پہلے بنائی گئی تھی اس لئے تمہیں حوض کا گڑھا بھی تیار ملا۔ تم نے نہایت اطمینان
 سے لاش اس میں دفن کر دی اور دوسرے دن مزدوروں نے اس کی جوڑائی کر کے پلاسٹر کر دیا۔
 حوض تیار تھا اور اس میں منس کا جوڑا اتیر رہا تھا۔ غالباً پہلے تمہاری اسکیم یہ رہی ہوگی کہ تم پروفیسر
 کی بیوی کو قتل کر دو گے جس سے اس کے تعلقات خراب تھے اور پھر پولیس پروفیسر کے متعلق
 چھان بین کرے گی تو تم مشین کی ایجاد کے سلسلے میں پروفیسر کی روپوشی کی کہانی سناؤ گے پھر اسی
 طرح تم پروفیسر کا میک اپ کر کے کچھ دنوں تک پولیس کو چکر دیتے رہتے اور اسی طرح غرق
 ہو جاتے، چلے کیس ختم اور فائل بند۔ ڈھائی لاکھ روپیہ تم دونوں بانٹ لیتے۔ مگر پروفیسر کی
 بیوی کو قتل کرنے سے پہلے ہی شاید تم دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور تم دونوں نے سوچا کہ کیوں نہ
 ڈوروتھی ہی کو قتل کر کے پروفیسر کو قاتل ثابت کرنے کی کوشش کرو۔ شاید ڈوروتھی کو بھی خطرہ لاحق
 ہو گیا تھا کہ کہیں تم اس پر نہ ہاتھ صاف کر دو۔ لہذا اس نے پروفیسر کے پانچ اعزہ کے فون نمبر
 نوٹ کر کے رکھے تھے لیکن وہ انہیں کچھ بتانے سے قبل ہی ختم کر دی گئی۔ شاید اس نے تمہیں
 چوروں کی طرح داخل ہوتے دیکھ کر ہی فائر کر دیا تھا لیکن تم بچ گئے اور تمہاری گولی اس کی کپٹی
 پر بیٹھی۔ اس کے بعد تم نے جو وقت بازیاں کھائی تھیں سب کے سامنے ہیں۔ مسرنجی اتفاقاً طور
 پر وہاں پہنچ گئی تھیں اس لئے تم کچھ تھوڑے بوکھلا بھی گئے تھے لیکن پھر اسے بھی اس کیس میں
 الجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ تدبیر تھی بھی بڑی شاندار۔ پولیس کچھ دنوں تک ذہنی جمناسٹک
 کرتی اور جب تم اس پر تھکن کے آثار دیکھ لیتے تو ایک دن اسی طرح جیب میں بیٹھ کر ندی کی
 طرف بھاگ نکلتے اور پھر کسی موڑ پر رفتار کم کر کے خود اتر جاتے اور جیب کافی اونچائی سے ندی
 میں جا گری..... مگر نہ ہوا اس حوض کا جس میں منس کا جوڑا اتیرتا تھا..... نہ ہوا اس پوشیدہ

تئویر کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔
پھر سارا کمرہ سکوت کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔

دوسری صبح شہر میں ہوئی۔ حمید خود کو ذہنی طور پر مفلوج سا محسوس کرنے لگا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے صوفیہ کے خیال نے پریشان کر رکھا تھا جسے ابھی تک پروفیسر کی موت کے متعلق نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس خبر سے اس کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ اس نے فریدی سے مشورہ کیا کہ اسے کس طرح اس کی اطلاع دی جائے۔

”بھئی یہ ایک ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ وہ بچہ تو ہے نہیں کہ اس سے یہ بات کافی عرصہ تک پوشیدہ رہے گی۔ دنیا کے ہر آدمی کو کسی نہ کسی کی موت کا صدمہ ضرور سہنا پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ اب تم اسے بتا ہی دو۔ ویسے اب وہ بہتر زندگی بسر کر سکے گی۔ تئویر نے اعتراف کر لیا ہے کہ اس نے دو لاکھ روپے مختلف بینکوں میں اپنے لڑکوں کے نام جمع کرائے ہیں اور اس کا کہنا ہے کہ اسے اس جرم پر ڈوروتھی ہی نے اکسایا تھا۔ پروفیسر کی موت کی بھی وہی ذمہ دار تھی۔ اس نے اسے پانی میں ایک بہت ہی سریع الاثر قسم کا زہر دیا تھا اور وہ کہتا ہے کہ اسے ڈوروتھی کی طرف سے خدشہ تھا کہ کہیں وہ اسے بھی نہ ختم کر دے۔ اسی لئے اس نے اسے قتل کر دیا۔ اگر وہ اس پر گولی نہ چلاتا تو اس کی دوسری گولی خود اسے ہی ختم کر دیتی۔

”لیکن آپ اس حوض تک کیسے پہنچے تھے۔“

”نو کروں سے دوسری بار گفتگو کرتے وقت اس کا تذکرہ آ گیا تھا۔ مجھے شبہ ہوا اور مل نے اسے کھدوا ڈالا۔ محنت برباد نہیں ہوئی۔ پروفیسر کی گلی سڑی لاش برآمد ہو گئی۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ صوفیہ کو ان حالات سے مطلع کرنے کا ناگوار فریضہ انجام دینے جا رہا تھا۔

ختم شد